مقصدِ زندگی

از

الفرڈ اڈلر

مترجمہ

سید محمد حسین جعفری بی اے (آکسن)

ناظم تعلیمات وظیفہ یاب

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مقصدِ زندگی

از

الفرڈ اڈلر

مترجمہ

سید محمد حسین جعفری بی اے (آکسن)

ناظم تعلیمات وظیفہ یاب

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مقصدِ زندگی

از

الفرڈ اڈلر

مترجمہ

سیّد محمد حسین جعفری بی۔ اے (آکسن)

ناظمِ تعلیمات وظیفہ یاب

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	پہلی فصل۔ زندگی کے معنی اور اس کا مقصد۔	۱
۲	دوسری فصل۔ نفس اور جسم۔	۲۸
۳	تیسری فصل۔ کم تری اور برتری کے جذبات۔	۵۵
۴	چوتھی فصل۔ بچپن کی یادداشتیں۔	۸۳
۵	پانچویں فصل۔ خواب۔	۱۱۱
۶	چھٹی فصل۔ گھر اور خاندان کے اثرات	۱۴۴
۷	ساتویں فصل۔ مدرسہ کے تاثرات	۱۸۶
۸	اٹھویں فصل۔ نوجوانی کا زمانہ	۲۱۶
۹	نویں فصل۔ جرم اور اُس کا اِنسداد۔	۲۳۲
۱۰	دسویں فصل۔ کام اور دھندا۔	۲۷۷
۱۱	گیارہویں فصل۔ انسان اور انسان (انسانوں کا تعلق انسانوں سے)	۲۹۰
۱۲	بارویں فصل۔ محبت اور شادی۔	۳۹۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

ڈاکٹر اڈلر کی یہ کتاب جس کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے سنہ ۱۹۳۰ میں میرے مطالعے میں آئی۔ اسی وقت میرا ارادہ ہوا کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروں لیکن سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ کتاب رکھی رہی اور دن گزر گئے۔ وظیفہ لینے کے بعد کچھ فرصت نصیب ہوئی اور ترجمہ کر دیا گیا۔

ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ مطالب سادا اور آسان عبارت میں ادا کئے جائیں تاکہ وہ لوگ بھی جو نفسیات سے واقف نہیں آسانی سے مطالب سمجھ لیں اور کتاب کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

ترجمے میں جو الفاظ قوسین میں درج ہیں وہ میری طرف سے اضافہ کئے گئے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل باقی رہے اور یہ بالکل صاف ہو جائے۔

جن الفاظ پر خط کھینچا گیا ہے ان کے انگریزی الفاظ کتاب کے آخر میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

ترجمے میں نفسیات کی جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں سے اکثر تو وہی ہیں جو دار الترجمہ کے شعبہ تعلیم کی کمیٹی نے ایجاد کئے ہیں باقی میں نے وضع کر لیے۔

ترجمے کے ساتھ مصنف یعنی ڈاکٹر اڈلر کی زندگی کے مختصر حالات بھی دے دیئے گئے ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں۔

میرے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ہر اردو داں مرد۔ عورت۔ جوان۔ بوڑھے کیلئے مفید ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے خود ان کے طرز زندگی کی اصلاح ہوگی اور انھیں اپنے بچوں کی تعلیم اور تربیت میں بڑی مدد ملیگی۔ معلمین مع معلمات اگر اس کتاب کو پڑھیں تو اپنے فرائض بہتر طریقے سے انجام دے سکیں گے۔ فقط

سید محمد حسین جعفری

۲۴ ذالحجہ سنہ ۱۳۶۶ ہجری
جوبلی ہل۔ حیدرآباد دکن

اڈلر کے حالات زندگی

تاریخ اور مقام پیدائش

الفرڈ اڈلر ۷ فروری کو ۱۸۷۰ء میں ویانا کے ایک نواحی مقام پیان زنگ میں پیدا ہوئے۔

ماں باپ کا حال

اڈلر کے ماں باپ ہنگری کے باشندے اور یہودی تھے۔ اڈلر کی پیدائش کے وقت ان کے ماں باپ کی حالت بری نہیں تھی۔ گھر میں انھیں ہر قسم کی آسائش نصیب تھی۔ گائے۔ بھیڑ۔ مرغیاں سب ہی کچھ تھا لیکن اڈلر ان چیزوں سے خوش نہ رہتے تھے چنانچہ خود انھوں نے اپنے بچپن کو افسردگی اور ناخوشی کا زمانہ بتایا ہے۔

حلیہ

اڈلر اپنی ماں اور ان کے خاندان والوں سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ پست قد۔ چوڑے سینے والے اور قوی تھے۔ ان کی بھویں مثل ایک مفکر کے گھنی تھیں۔ آنکھیں چمکتی ہوئی اور نظر تیز تھی۔ ان کی پوری شخصیت کا راز ان کی آنکھوں میں پنہاں تھا۔ ان کے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنی دو آنکھوں سے وہ انسان کے دل کا سب حال معلوم کر لیتے ہیں۔

بچپن کا زمانہ

اڈلر کا بچپن کا زمانہ پیان زنگ کی تنگ گلیوں میں محلے کے مفلس بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ ان نادار بچوں کی صحبت کو وہ ہمیشہ بڑے فخر کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے کہ بچپن میں انھیں غریب بچوں کی صحبت میں انھوں نے ہمت اور دوستی کے سبق سیکھے۔ بچپن میں ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ جب یہ ۵ سال کے تھے تو انھیں نمونیا ہوا اور یہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اسی وقت سے انھوں نے ارادہ کر لیا کہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بنیں گے۔ مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اڈلر بچپن سے مشکل پسند تھے چنانچہ خود کہتے

ہیں کہ "میں نے بچپن ہی میں تصفیہ کر لیا تھا کہ میں زندگی کے مشکل مسئلوں کا مقابلہ کرونگا اور انھیں حل کرونگا" اگرچہ بچپن سے فنون لطیفہ کا مذاق رکھتے تھے اس کے باوجود ان میں لڑائی بھڑائی کی اسپرٹ تھی اور وہ ایک بہادر نوجوان تھے اور ان کی یہ اسپرٹ ہمیشہ باقی رہی۔ پہاڑ چڑھنے اور تیراکی کا بچپن سے انھیں شوق تھا۔ مدرسے کی زندگی غیر معمولی طور پر کامیاب نہ رہی۔ خود کہتے ہیں کہ "مدرسے میں سب مضامین میں میری حالت اوسط رہتی تھی۔ میں ابتداً ریاضی میں بہت کمزور تھا لیکن میں نے اس مضمون میں اتنی کوشش کی کہ اس مضمون میں مدرسے کے بہترین طلبہ میں میرا شمار ہونے لگا۔"

مدرسے میں مختلف قسم کے متعدد لڑکوں سے ان کی دوستی ملاقات رہی اور بعد بھی مختلف خیال کے لوگوں سے ان کا میل جول رہا۔ باوجود لڑاکو اور امنگ بھرے ہونے کے بچپن سے ہر دل عزیز رہے۔ جو شخص ان سے ملتا انھیں چاہنے اور پسند کرنے لگتا تھا۔

جوانی کا زمانہ

مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اڈلر یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے علم نفسیات کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا لیکن اس وقت تک اس علم میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسے انھوں نے سائنٹیفک نہ پایا اور مایوس ہوئے۔

چونکہ بچپن سے ان کا خیال تھا کہ طب پڑھیں اس لئے ان سب مضامین کو جو اس فن کے حاصل کرنے میں مدد دیتے تھے انھوں نے محنت اور دلچسپی سے پڑھا۔

ادبی تعلیم ختم ہونے کے بعد اڈلر نے طب کی تعلیم شروع کی۔ اس تعلیم کا آخری زمانہ شادی کر لینے اور مالی مشکلوں کی وجہ پریشانی میں گزرا۔ اس پر بھی انھوں نے بیالوجی اور اناٹومی میں غیر معمولی کام کیا اور اعزاز کے ساتھ طب میں ڈگری حاصل کی۔

شادی تو اڈلر نے تعلیم کے زمانے میں کر لی تھی ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد علٰحدہ گھر لیا اور پریکٹس شروع کی۔ باوجود مالی مشکلات کے ان کی شادی کی

زندگی خوشی سے گذری۔ وہ اپنی بیوی کے شیدا اور دلدادہ تھے۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی اڈلر کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اس زمانے میں شہر ویانا علوم و فنون اور فیاشن کا مرکز تھا اور اڈلر جو ایک اعلیٰ دماغ رکھنے والے اور امنگ بھرے شخص تھے محسوس کرتے تھے کہ ان کے لئے اس شہر میں کام کرنے کے بعید موقعے ہیں اور بالآخر انھوں نے ویانا کے کلچر اس کی رواداری۔ آزاد خیالی اور خوش اخلاقی سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا بچپن اور نوجوانی اسی فکر میں گزری کہ مکمل زندگی کس طرح بسر کی جاسکتی ہے اور انسانوں سے کیا سلوک کرنا اور ان سے کیا اُمیدیں رکھنا چاہیئے۔

جوانی اور شادی کے بعد کا زمانہ۔

شادی کے بعد جب اڈلر نے ڈاکٹری کی سند حاصل کرلی تو اپنا گھر جمایا اور مطب شروع کیا۔ اس زمانے میں بھی وہ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے چنانچہ ان کی خادمہ صوفیا کہتی ہے کہ "میں نے جب اس گھر میں ملازمت اختیار کی تو دیکھا کہ ڈاکٹر اڈلر کسی وقت بھی بغیر کتاب کے نہ رہتے تھے۔ جب دیکھو ان کے ہاتھ میں کتاب رہتی یا قلم رہتا۔ جب وہ بیماروں کو دیکھ کر گھر آتے تو گھنٹوں لکھنے پڑھنے میں گزار دیتے تھے۔"

اڈلر کے ایک بڑے دوست پروفیسر فرٹ ملر کا بیان ہے کہ اڈلر نے نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کا حافظہ بلا کا تھا جو کچھ پڑھتے تھے وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے اور وہ ان کے دماغ میں ہمیشہ کے لئے جم جاتا اور پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا۔

مطب سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ فیاملی کی سادہ زندگی اچھی طرح گزر جاتی تھی۔ جب ڈاکٹر فرائیڈ سے مخالفت ہوگئی تو طبابت چھوڑ کر سیہ شیاٹرسٹ ہوگئے یعنی نفسیاتی علاج شروع کیا۔ متعدد ڈاکٹر پیچیدہ جسمانی اور دماغی امراض میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔

اڈلر مذہب کو مانتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انسان نے جو خدا کا تصور پیدا کیا وہ اس کا بہترین خیال ہے۔ اگرچہ خود عیسائی ہو گئے تھے لیکن یہودیوں کے مذہب کو جو ان کا آبائی مذہب تھا عزت کی نظر سے دیکھتے اور کہتے تھے کہ گو اس مذہب میں تنگ نظری اور تعصب ہے لیکن اس نے دنیا کے کلچر میں بیحد اضافہ کیا اور معلومات بہم پہونچائے۔

اڈلر بڑے یار باش اور ملنے جلنے والے انسان تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کے عادات واطوار صحبت سے بنتے ہیں۔ سماجی محفلوں میں آزادی سے تبادلہ خیالات کرنے میں انھیں بہت لطف آتا تھا۔ ایسا مذاق جس میں کچھ سچائی اور حقیقت ہو انہیں بیحد پسند تھا۔ یہ خود بڑے ظریف تھے۔ ان کا ایک دوست کہتا ہے کہ "میں اڈلر کے نفسیات سے تو واقف نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بیحد ظریف تھے"

اڈلر کو حقیقی اور ٹھوس واقعات سے دلچسپی تھی۔ صرف نظریوں کو وہ بیکار سمجھتے تھے چنانچہ ان کی زبان پر یہ سوالات اکثر رہتے کہ لوگ کیوں سوچ بچار کرتے ہیں؟ اگر سوچ بچار کرتے ہیں تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟

طالب علمی کے زمانے سے ہی اڈلر کو سماجی اصلاح کا خیال تھا چنانچہ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرتے ہی انھوں نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "درزیوں کی صحت" تھا۔ اس رسالے میں انھوں نے درزیوں اور دوسرے محنت مزدوری کرنے والوں کی مصیبتوں اور مشکلات کا ذکر کیا۔ اس رسالے کی اشاعت سے اس طبقے کے لوگوں کا بہت فائدہ ہوا۔

اڈلر اس چیز کے مخالف تھے کہ تشدد کے ذریعے انقلاب پیدا کیا جائے روحانی نشوونما کو یہ سیاسیات سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک نیک انسان ہی کوئی اچھی تنظیم یا طریقہ عمل قائم کرسکتا ہے۔ جو انسان

روحانی ترقی کرتا ہے وہی اچھی سیاست کا بانی ہو سکتا ہے۔ کمیونزم۔ نازی ازم وغیرہ کے یہ خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاست ایسی ہونی چاہئے جو سب کے لئے یکساں ہو۔ کھلی ہوئی ہو اور انسانی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

چونکہ ان کے خیال میں ہر انسان کا یہ انفرادی حق ہے کہ وہ اپنی ایک تخلیقی آزاد زندگی رکھے اس لئے وہ ہر اس کوشش کو خطرناک سمجھتے تھے جس سے انسانوں کے نفوس ایک ڈھانچے میں ڈھالے جائیں اور ان کی حالت ایک سی کر دی جائے اور انھیں اپنے افعال کی ذمہ داری کا موقع نہ رہے جیسا کہ مسولنی اور ہٹلر نے کیا۔ اڈلر کے خیال میں اس قسم کے لوگ مثل دیوانوں کے ہوتے ہیں اس لئے کہ دیوانے اپنے افعال کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔

اڈلر کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں تھا اور یہ نازیوں کے خلاف تھے۔ ان کا ایک جرمن شاگرد نازی ہو گیا تھا۔ ایک دوست کے ذریعے اس نے انھیں برلن آنے کی دعوت دی اور امان دلانے کا وعدہ کیا۔ اڈلر نے دعوت دینے والے کو صرف یہ جواب دیا کہ "میرے شاگرد کو کہہ دو کہ پیام سن کر میں نے ہنس دیا۔"

اڈلر خود گفتگو کرنے سے سننے کے زیادہ عادی تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یہ دو دو اور تین تین گھنٹے دوستوں کے حلقے میں خاموش بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سنا کرتے اور خود کچھ نہ کہتے۔ ان کی نظر بڑی تیز تھی۔ جب وہ ایک خاص انداز سے کسی کو گھورتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نظر اس کے دل میں اتر گئی وہ اس قسم کی نظر سے بہت کم کام لیتے تھے۔ یہ مجسم ہمدردی تھے۔ لوگوں کے دکھ درد اور تکلیف کا انھیں بیحد خیال رہتا تھا۔ دوستوں کی خوشی اور راحت کا ہمیشہ لحاظ رکھتے اور ان کو خوش کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔ اپنی بیوی اور بچوں سے انھیں بہت محبت تھی اور ان کے خیالات اور جذبات کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے ایک دوست کا قول ہے کہ "اڈلر ایک نہایت مخلص۔ بہادر۔ خوش مزاج اور دریا دل انسان تھے۔"

علمی کارنامے

اڈلر انفرادی نفسیات کے موجد مانے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء سے انھوں نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ انسان میں خیالات یوں ہی یکایک پیدا نہیں ہوتے بلکہ بتدریج ان کی نشو و نما ہوتی ہے اور ان نشو و نما کا انحصار انسان کی زندگی کے مقصد یا نصب العین پر منحصر ہوتا ہے۔ جیسا مقصد ہوتا ہے ویسے ہی خیالات پیدا ہوتے اور بنتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی فرد کی شخصیت قابل تقسیم نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل چیز ہوتی ہے۔ اسی عقیدے کی بنا پر انھوں نے اپنی ایجاد کی ہوئی نفسیات کو ’انفرادی نفسیات‘ کا نام دیا اور نفسیات میں حسب ذیل اضافے کئے:-

(الف) انسان میں کم تری کے جذبات کا وجود عام طور پر کم تری کا وہم کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا تعلق خاص طور پر اڈلر سے ہے۔ خود اڈلر کا قول ہے کہ ’وہم کمتری‘ کے نظریے کا میں حقیقی باپ ہوں۔

(ب) فیاملی کی تنظیم اور ارکان فیاملی کا باہمی تعاون جس پر بچوں کی رہنمائی کا دارومدار ہے۔

(ج) اڈلر کا خلل اعصاب کا خاص طریقہ علاج جو اس اصول پر مبنی تھا کہ خلل اعصاب کا بیمار زندگی کے معمولی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا ہے۔

(د) خواب اور جرم کے متعلق چند خاص نظریے۔

(ھ) بچپن کی یادداشتیں۔

(و) دعویٰ تذکیر (یعنی عورتوں کا مرد بننے کا دعویٰ اور کوشش)

(ز) انسانوں کی چار قسمیں۔

(ح) زندگی کے تین بندھن۔

(ط) سماجی دلچسپی کے قوانین۔

اصل کتاب کے مطالعہ سے اڈلر کے ان نظریوں پر کافی روشنی پڑے گی اور

ناظرین سمجھ سکیں گے کہ ان نظریوں کی حقیقت اور تفصیل کیا ہے۔

اڈلر کی انفرادی نفسیات کی سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک دنیا کے مختلف ملکوں میں خوب پرچار ہوئی۔ خود انھوں نے یورپ کے مختلف ملکوں اور امریکا کا دورہ کیا اور لیکچر دیے۔ ان کی تحقیقات اور نظریوں سے مدرسین نے بہت فائدہ اٹھایا۔ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں انھیں ان سے بڑی مدد ملی۔

انفرادی نفسیات کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے چنانچہ اڈلر کہتے ہیں "اس علم کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے ہر شخص چاہے اس کے سیاسی اور مذہبی خیالات کچھ ہی ہوں اس علم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ انفرادی نفسیات ایک میوے کی ٹوکری ہے جس میں مختلف قسم کے میوے ہیں ان میں سے جس کا جو جی چاہے وہ اٹھا لے۔"

اڈلر ویانا میں ڈاکٹری کے علاوہ خلل اعصاب کا علاج بھی خاص طور پر کرتے تھے اور عصبی امراض کے علاج کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۱۰ء سے ڈاکٹری کی پریکٹس چھوڑ دی تھی اور نفسیاتی علاج شروع کیا تھا۔ ڈاکٹری کے حدود اور کمزوریوں سے انھیں ہمیشہ مایوسی ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ "جسمانی صحت اور بیماری تو فطری چیز ہے۔ انسان بیمار ہوتا اور اچھا بھی ہو جاتا ہے لیکن روح اور نفس کی بیماری بزدلی اور کم ہمتی ہے اور اس کی صحت بہادری اور ہمت ہے۔"

ویانا کی قدیم جامعہ کے قریب ایک مکان میں اڈلر نے انفرادی نفسیات کی تعلیم و تلقین کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں بچوں کی رہنمائی اور اصلاح کے لئے اڈلر نے ویانا کے بتیس سرکاری مدرسوں میں کلینک قائم کئے۔ ان میں وہ لیکچر دیا کرتے تھے جو بڑے شوق سے سنے جاتے تھے۔ ان مدرسوں میں جو طالب علم سست اور ناکارہ پائے جاتے وہ ان کے پاس مشورے اور علاج کے لئے بھیجے جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں اڈلر نے انفرادی نفسیات پر ماہوار رسالہ نکالا جو

کافی تعداد میں طبع ہوتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب جرمنی میں نازیوں کا تسلط ہوا اور یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے لگے تو اڈلر امریکا چلے گئے اور وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں انھیں لکچرار مقرر کیا گیا اور ۱۹۳۲ء میں میڈیکل سائیکالوجی کے پروفیسر بنائے گئے۔

۱۹۳۵ء میں امریکا سے اڈلر نے انفرادی نفسیات پر ایک بین الاقوامی سہ ماہی رسالے کی اشاعت شروع کی جو بہت مقبول ہوا۔

اڈلر نے اٹھارہ کتابیں لکھیں جن میں سے حسب ذیل کتب کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

(۱) سائینس آف لیونگ۔ یہ کتاب نیویارک اور لندن میں طبع ہوئی۔
(۲) پرابلم آف نیوراسس۔ لندن میں چھپی۔
(۳) ایجوکیشن آف چلڈرن۔ نیویارک اور لندن میں چھپی۔
(۴) پیاٹرن آف لائیف۔ نیویارک میں چھپی۔
(۵) سوشیل انٹرسٹ۔ نیویارک اور لندن میں چھپی۔
(۶) "واٹ لائیف شڈ مین ٹو یو"۔ امریکا اور لندن میں چھپی۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا ترجمہ پیش کیا گیا۔

اڈلر کے باقی کتابیں جرمن میں ہیں اور میری حد علم تک ان کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

اڈلر نے حسب ذیل یونیورسٹیوں میں لکچر دیئے:۔

برلن۔ میونخ۔ زورچ۔ پیارس۔ لندن۔ آکسفورڈ۔ کیمبرج۔ امسٹرڈم۔ اٹرلیق۔ زاغرب۔ پراگ۔ کوپن ہیگن۔ اسٹاک ہوم۔ نیویارک۔ ہارورڈ۔ ڈیٹرائٹ ڈیڈرا۔ سین فرانسسکو۔ لا انگلے۔ شکاگو۔ فیلی ڈلفیا۔ میک گل۔ ہیاملٹن۔ ان کے علاوہ یورپ اور امریکا کے مختلف ممالک کے متعدد سائنٹفک سوسائیٹیوں میں لکچر دیئے۔

اڈلر اور فرائیڈ کا اختلاف

شروع میں اڈلر اور فرائیڈ میں گہری دوستی تھی۔ اگرچہ خیالات جدا تھے اس پر بھی سائینس دانوں کی حیثیت سے دونوں دنیا کو فائدہ پہونچا رہے تھے۔ بتدریج آپس کے اختلافات بڑھتے گئے اور دوستی ٹوٹتی گئی اور پھر ان کے پیرووں نے آپس کی مخالفت کو بھڑکایا۔ بالآخر نوبت یہ ہوئی کہ فرائیڈ اڈلر کو اپنا رقیب سمجھنے لگے اور ان کے سخت دشمن ہو گئے۔ اڈلر کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ انھیں فرائیڈ سے دشمنی نہ تھی چنانچہ جب فرائیڈ کی کتاب "خوابوں کی تشریح" شائع ہوئی تو ویانا کے ڈاکٹروں نے اس پر کڑی تنقید کی اور اس کا مذاق اڑایا اس وقت اڈلر نے ایک مضمون اس تنقید کے خلاف فرائیڈ کی تائید میں لکھا جس سے فرائیڈ بہت خوش ہوے اور اڈلر کا شکریہ ادا کیا اور انھیں اپنے بحث مباحثوں کے حلقے میں شریک ہونے کی دعوت دی لیکن دونوں کبھی ایک جگہ جمع نہ ہو سکے۔ فرائیڈ اور اڈلر کی کھلی اور شدت کی جنگ پھر اس وقت چھڑی جب کہ اڈلر نے فرائیڈ کی سائیکو انالسس (نفسیاتی تشریح) کے نظریئے پر اعتراضات کرنا شروع کئے۔ فرائیڈ کو اپنے اس نظریہ پر بڑا ناز تھا اور اڈلر کی تنقید کو انھوں نے اپنے پر راست حملہ سمجھا۔ فرائیڈ اور اڈلر کی مخالفت کی تفصیلات دلچسپ ہیں لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ اڈلر نے جو فرائیڈ کے اس نظریے کی مخالفت کی وہ محض اس لئے کی کہ اس کو یعنی نفسیاتی تشریح کے نظریئے کو وہ انسانوں کے لئے سخت خطرناک سمجھتے تھے۔

اڈلر کا انتقال

اڈلر کی عمر کا آخری حصہ فکر اور پریشانی میں گزرا۔ ان کی بڑی لڑکی کو نازی حکومت نے قید کر لیا اس کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ امریکا میں جہاں یہ رہتے تھے وہاں انھیں باہر کھلی ہوا میں ٹہلنے کا موقع نہ ملتا تھا اس سے ان کی صحت پر برا اثر پڑ رہا تھا بتدریج دل خراب ہو گیا اور اسی سے پہلی جون کو ۱۹۳۷ء میں ابرڈین میں یکایک ان کی موت واقع ہوئی اڈلر ابرڈین میں انفرادی نفسیات پر لیکچر دے رہے تھے سب لیکچر ہو گئے تھے آخری ایک لکچر باقی تھا کہ اسی روز صبح میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مرنے کے ایک روز پہلے تک بظاہر یہ بالکل اچھے تھے۔ چنانچہ

ں

رات میں ایک دوست کے ساتھ سینما گئے گھر واپس آکر تھوڑی دیر کام کیا اور سو گئے صبح میں سویرے اٹھے ناشتہ کیا اور ٹہلنے چلے گئے۔ جب ابرڈین کی ایک سڑک پر پہونچے تو یکایک چکر کھا کر گر پڑے۔ راستے والے دوڑ پڑے اٹھانا چاہا تو دیکھا کہ روح پرواز کر چکی ہے۔ شہر ابرڈین کے باشندوں نے بڑے دھوم سے ان کا جنازہ اٹھایا۔ شہر کے مختلف طبقوں کے لوگ میت میں شریک ہوئے۔ بشپ ڈین اور پروفیسر فنڈلے نے نماز جنازہ پڑھائی۔ شہر والوں نے کئی ماتمی جلسے کئے اور سوگ منایا۔

پہلی فصل

زندگی کے معنی اور اس کا مقصد

معنی کی دنیا

انسان کی زندگی "معنوں" کی دنیا میں بسر ہوتی ہے۔ مجرد حالات سے ہمیں کبھی سابقہ نہیں پڑتا بلکہ ان کی تعبیر ہمیشہ انسانوں کے تعلق سے ہوتی ہے۔ تجربہ کی ابتدا سے ہم اسے انسانی اغراض سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ اشیاء کے متعلق انسانی تجربے انسانی اغراض کے تحت ہوتے ہیں۔ مثلاً "لکڑی" کہا جائے تو اس کے معنی ہونگے "لکڑی انسانی تعلق کے ساتھ"۔ "پتھر" کہیں تو اس کے معنی ہونگے "پتھر کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ"۔ اگر کوئی شخص معنی کو نظر انداز کر کے صرف حالات اور اشیاء کو دیکھتا رہے گا تو بدقسمت ہوگا۔ ایسا شخص خود کو دوسری اشیاء سے علٰحدہ کر لے گا۔ اس کے افعال اور اعمال نہ خود اس کو فائدہ پہونچائیں گے اور نہ دوسروں کے لئے مفید ہوں گے بلکہ سب بے معنی اور فضول ہوں گے۔ کوئی انسان اشیاء کے معنی اور مفہوم سمجھنے کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کسی چیز کو ہم ہمیشہ اس کے معنی سے سمجھ سکتے ہیں۔ جو ہم اس کے لئے قرار دے دیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو معنی ہم قرار دیتے ہیں وہ ناقص اور غلط ہوتے ہیں۔ پس نتیجہ یہ کہ معنی کی دنیا غلطیوں کی دنیا ہوتی ہے۔

زندگی کے معنی کیا ہیں۔ اگر ہم کسی شخص سے سوال کریں کہ زندگی کے کیا معنی ہیں تو یقیناً وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے گا اس لئے کہ عام طور پر لوگ مسائلِ زندگی کے متعلق سوالات کرنے یا اگر دوسرے ان سے سوالات کریں تو ان کے معقول جواب دینے کی تکلیف گوارہ نہیں کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں سوال کرنے کی عادت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس کی تاریخ ہے یعنی ابتدائے خلقتِ انسانی سے انسان سوالات کرنے کا عادی ہے پس اسی لئے اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جوان اور بوڑھے دونوں بے ساختہ سوال کرتے ہیں کہ زندگی کس لئے ہے؟ زندگی کے کیا معنی ہیں۔ کیا مقصد ہے؟ اور لوگ اسی وقت یہ سوال کرتے ہیں جب زندگی میں انہیں ناکامیوں اور شکستوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب تک زندگی کامیابی کے ساتھ بسر ہوتی ہے اور کوئی مشکلات ان کے مقاصد کی تکمیل میں حائل نہیں ہوتے یہ سوال کہ زندگی کیا ہے اس کا مقصد کیا ہونا چاہئے ان کی زبان پر نہیں آتا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال سے خود اس سوال کا جواب حاصل کر لے سکتا ہے۔ اگر ہم کسی شخص کی گفتگو پر کان نہ دھریں اور صرف اس کے افعال اور حرکات کو غور سے دیکھیں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اپنے لئے زندگی کے کچھ معنی قرار دے لئے ہیں اور اس کی عادات۔ خصائل۔ اقوال اور اعمال اس 'معنی' کے مطابق جاری ہیں اور یہ کہ اس نے اپنے نزدیک زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے تمام افعال سے ظاہر ہوگا کہ اس نے اپنے اور دنیا کے متعلق کچھ خیالات قایم کر لئے ہیں کہ "میں ایسا ہوں اور دنیا ایسی ہے" یعنی وہ اپنی ذاتی حالت اور زندگی کے عام تصور کی قرارداد اپنے خاص پیرائے میں مرتب کرتا ہے۔

زندگی کے کیا معنی ہیں؟ زندگی کا کیا مقصد ہے؟ یہ سوال ایسے ہیں کہ اس کے اتنے ہی جواب ہو سکتے ہیں جتنے کہ انسان ہیں اور پھر جیسا کہ ہم نے کہا ہر ایک جواب

کم و بیش غلط ہوگا۔

زندگی کے مقاصد کی قسمیں

زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں کوئی بھی پوری طرح سے سمجھ نہ سکا تاہم زندگی کے کوئی ایسے معنی جو ایک حد تک نیک اور مفید ہوں بالکل غلط بھی نہیں کہے جا سکتے۔

اب زندگی کے مقاصد ان دو قسموں کے درمیان ہوں گے۔ اگر ہم مقاصد زندگی کے مختلف اقسام پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ بعض مقاصد ہمارے لئے مفید ہوتے ہیں تو بعض نقصان دہ ہوتے ہیں بعض صحیح اور سیدھے راستے پر چلانے والے تو بعض غلط راستے پر لگانے والے اور گمراہ کرنے والے ہوتے ہیں تحقیق کرنے سے ہم کو زندگی کا حکیمانہ یا سائینسی مقصد حیات کا پتہ چل جاتا ہے اور ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ کم از کم اپنی دنیا کی حد تک حقیقت کو سمجھ سکیں۔

حقیقت کا مطلب

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ہم لفظ "حقیقت" استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مطلب اس سے وہ "حقیقت" ہے جس کا تعلق انسانی دنیا یا انسانوں کی زندگی سے ہو۔ اس کے سوائے اگر کسی اور "حقیقت" کا وجود ہو تو اسے ہم نہیں جان سکتے اور نہ اس سے ہم کو کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور وہ ہمارے لئے بے معنی اور فضول ہے۔

انسانی بندھن

اس دنیا میں ہر انسان کے تین تعلقات یا بندھن ہوتے ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان بندھنوں کو بخوبی سمجھ لے اس لئے کہ انسان کی زندگی کا مدار ان بندھنوں پر ہوتا ہے۔ زندگی میں جتنے مسائل پیش ہوتے ہیں ان ہی تین بندھنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلا بندھن

پہلا بندھن یہ ہے کہ ہم اس چھوٹے سے سیارے کی سطح پر جو کرہ ارض کہلاتا ہے رہتے بستے ہیں اس کے سوائے اور کہیں نہیں رہتے۔ ہماری نشو و نما۔ ہماری ترقی۔ ہمارے کام کاج وغیرہ جو کچھ بھی ہوتے

ہیں وہ اس دنیا کے حدود کے اندر اور اس کے قیود کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیوی حدود میں اس کے قیود کے تحت جسمانی اور نفسیاتی ترقی کرتے رہیں تاکہ دنیا میں ہم صحت اور تندرستی کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کریں اور دنیا میں نوع انسان کے بقاء کا باعث ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر انسان کو اس کی زندگی میں پیش آتا ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

اس دنیا میں ہم اپنے افعال سے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم زندگی کے کیا معنی سمجھے۔ ہمارا مقصد حیات کیا ہے۔ دنیا میں ہم کس چیز کو اہم اور ضروری مناسب اور مفید و ممکن سمجھتے ہیں۔

ہمارا ہر عمل اس خیال۔ اس نظریے کے تحت ہونا چاہیئے کہ ہمارا تعلق نوع انسان سے ہے اور انسان اس دنیا میں رہتے بستے ہیں۔ انسانی کمزوریوں اور ان خطروں کے لحاظ سے جن کا آئے دن دنیا میں ہمیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچاؤ اور نوع انسان کی بھلائی اور بہتری کے لئے اپنا مقصد زندگی ایسا قرار دیں جو دوربینی پر مبنی اور قوی الحجت ہو۔ اگر ہم کو ریاضی کا کوئی اہم اور مشکل سوال یا مسئلہ حل کرنا ہوتا ہے تو ہم محض قیاس سے کام لے کر اٹکل پچو طریقے سے اس کو حل نہیں کرتے بلکہ مختلف طریقوں سے اور مسلسل محنت کرنے کے بعد حل کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس سوال یا مسئلے کا صحیح جواب ہم کو نہیں ملتا اس سے ہم ناامید نہیں ہو جاتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ اگر پورا صحیح نہیں تو صحت کے قریب جواب مل جائے اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ کوشش کر کے زندگی کے صحیح معنی۔ زندگی کا صحیح مقصد معلوم کرلیں۔ زندگی کے صحیح معنی کیا ہیں۔ صحیح مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب اپنے لئے حل کرلیں اور اس سوال کے حل کرتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ ہم اس دنیا کے رہنے والے ہیں اور رہیں اس دنیا کی سہولتوں اور اس کی مشکلات کی موجودگی میں زندہ رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے۔

دوسرا بندھن

اب ہم دوسرے بندھن سے بحث کرتے ہیں۔ نوع انسانی کے صرف ہم ہی نمائندے نہیں ہیں بلکہ ہمارے آس پاس اور بھی اقوام ہیں جن کے پہلو بہ پہلو ہم رہتے بستے ہیں۔ انسان کی کمزوریاں اور اس کی مجبوریاں ایسی ہیں کہ انسان کے لئے سب سے علیحدہ ہو کر تن تنہا اپنے مقاصد حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی انسان اکیلا اپنے طور پر زندگی کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ ہرگز کامیاب نہ ہوگا بلکہ اس کوشش میں ہلاک ہو جائے گا۔ وہ نہ خود زندہ رہ سکے گا اور نوع انسان کو باقی رہنے دے گا۔ ہر انسان کی زندگی دوسروں کی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اور وہ اپنی کمزوریوں طبعی نقائص اور مجبوریوں کی وجہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے پس ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنی اور نوع انسان کی بھلائی کی خاطر تلازم یعنی دوسروں سے میل جول پیدا کرلے پس زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ زندگی کے کیا معنی ہیں؟ ان سوالات کے جواب حل کرتے وقت ہم کو اس بندھن کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہم کو دوسروں کے ساتھ میل جول رکھتے ہوئے دنیا میں رہنا ہے اگر ہم تنہا رہنے کی کوشش کریں تو ہلاک ہو جائیں گے۔

اس زمین پر جہاں ہم دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ رہتے بستے ہیں ہم کو اپنی شخصی زندگی اور نوع انسان کی زندگی باقی رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم اپنے جذبات میں بھی تناسب اور ہم آہنگی پیدا کریں اس کے بغیر زندگی کے مشکل مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ مقاصد بر نہیں آسکتے اور ہم منزل مقصود کو پہونچ نہیں سکتے۔

تیسرا بندھن

ان دو بندھنوں کے علاوہ ایک تیسرا بندھن بھی ہے جس میں ہر ایک انسان جکڑا ہوا ہے وہ یہ کہ نوع انسان کے دو جنس ہیں یعنی مرد اور عورت۔ محبت اور شادی بیاہ کا مسئلہ اس تیسرے بندھن سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ کسی مرد اور عورت کو اس سے بچنا ممکن نہیں۔ زندگی میں ہر مرد اور عورت کو یہ مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔ مختلف لوگ مختلف طریقوں سے

یہ مسئلہ اپنے لئے حل کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اپنے لئے یہ مسئلہ حل کر لیتا ہے۔

تین بندھن تین مسائل پیش کرتے ہیں

یہ تین تعلق یا بندھن جو بیان کئے گئے ہمارے سامنے تین مسائل پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم دنیا میں کونسا شغلہ اختیار کریں کہ باوجود اپنی کمزوریوں اور پابندیوں کے جو اس دنیا میں قایم کر دی گئی ہیں ہم زندہ اور باقی رہ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے ہم جنسوں میں کس طرح اپنی جگہ پیدا کریں کہ ہم ان کے ساتھ مل جل کر کام کریں اور اس تعاون سے فائدہ اٹھائیں۔ تیسرے یہ کہ ہم اس حقیقت کا کہ نوعِ انسان دو جنسوں پر مشتمل ہے اور نسل انسانی کی بقا کے لئے عشق و محبت اور شادی بیاہ کی ضرورت ہے کس طرح مقابلہ کریں۔

انفرادی نفسیات کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا تعلق ان تین مسائل سے نہ ہو ہر انسان کی اقتصادی۔ سماجی اور جنسی زندگی کا انحصار ان ہی تین مسائل پر ہوتا ہے اور وہ ان تین مسائل کی روشنی میں اپنا مقصد حیات قرار دیتا ہے۔

ناکام اور کامیاب شخص کا مقصد زندگی

اگر ہم ایک ایسے شخص کی زندگی پر غور کریں جو دنیا میں ناکام رہا اور جس کی زندگی نامکمل رہی تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس شخص نے اپنے پیشے میں کامیاب ہونے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کے دوست احباب کی تعداد بہت کم رہی۔ اپنے ہم جنسوں سے ملنا جلنا اس کے لئے تکلیف دہ رہا۔ اس شخص کی اس ناقص اور محدود زندگی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو تلخیوں اور مشکلوں سے بھرا پاتا ہوگا۔ اپنے محدود دائرۂ عمل میں اس نے زندگی کے معنی اور زندگی کا مقصد یہ سمجھ رکھا ہوگا کہ ”زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان خود کو مصائب اور آلام سے بچائے۔ ان چیزوں سے دور رہے اور جہاں تک ممکن ہو دنیوی مشکلوں سے بچتا رہے۔“ اس کے برخلاف اگر ہم کسی ایسے شخص کی زندگی کا جائزہ لیں جو اپنے پیشے میں کامیاب رہا ہے۔ اپنے ہم جنسوں سے ملنے ان سے تعاون

کرنے کا عادی ہے جس کے دوست احباب کا حلقہ وسیع ہے اور دوستوں کی صحبت سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ شخص زندگی کو تخلیقی چیز تصور کرتا ہے جس میں شکست اور ناکامی کے موقعے کم اور مفید کام کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ وہ چونکہ زندگی کے مسائل کا ہمت کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا عادی ہے اس لئے اپنا مقصد زندگی یہ قرار دے گا کہ "مجھے چاہئے کہ میں اپنے ہم جنسوں کے معاملوں میں دلچسپی لوں۔ خود کو ان میں کا ایک فرد سمجھوں اور ان کی بھلائی کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے کروں۔"

زندگی کا صحیح مقصد۔

غرض کہ جن لوگوں نے زندگی کے معنی اور مقصد خودغرضانہ زندگی بسر کرنا سمجھ رکھا ہے وہ غلط راستے پر ہیں اور انھوں نے زندگی کا مقصد غلط سمجھا ہے اور جو لوگ نوع انسان کی خدمت کرنا اور اپنے ہم جنسوں کے لئے ایثار کرنا زندگی کا حقیقی مقصد سمجھتے ہیں وہ سیدھے راستے پر ہیں اور انھوں نے زندگی کا صحیح مقصد سمجھا ہے۔

دنیا میں جتنے لوگ زندگی میں ناکامیاب ہوتے ہیں مثلاً خلل اعصاب کے مریض خبطی۔ مجرمین۔ نشہ باز۔ مسئلی بچے (یعنی وہ بچے جن کی تعلیم اور تربیت مشکل ہوتی ہے) خودکشی کرنے والے۔ لچے شہدے اور بیسوائیں ان سب کی زندگی میں ناکامیابی کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں انسانی ہمدردی نہیں ہوتی اور یہ لوگ سماج سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ معاشی۔ سماجی اور جنسی مسائل زندگی بغیر تعاون اور مل جل کر کام کرنے کے حل ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ چونکہ اپنی تنہا خودغرضانہ زندگی کو ہی زندگی سمجھتے ہیں اس لئے ان کا وجود صرف اُن کے لئے ہی ہوتا ہے۔ ان سے دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ دوسروں کے لئے ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ ذاتی فوقیت اور ذاتی فائدہ حاصل کریں۔ انھیں جو بھی کامیابیاں ہوتی ہیں وہ ان کی ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ خونیوں نے اقرار کیا ہے کہ

جب ان کے ہاتھ میں زہر کی بوتل تھی تو انھوں نے اپنے میں ایک قوت ایک برتری محسوس کی۔ یہ احساس ان کا خود ساختہ اور ان کے ناقص دماغ کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں زہر کی بوتل ہو تو اس کو ہم اپنی قوت یا برتری کا باعث تصور نہ کریں گے۔ کسی چیز کے متعلق کسی شخص کا انفرادی خیال یا مفہوم صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کے اپنی عقل و فہم کے مطابق معنی بیان کرے تو وہ اس وقت تک صحیح نہ سمجھے جائیں گے اور مقبول نہ ہوں گے جب تک کہ دوسرے بھی ان معنی کو نہ مان لیں۔ اسی طرح ہمارے اعمال اور مقاصد اسی وقت معنی خیز ہوتے ہیں جب دوسرے لوگ انھیں مان لیں۔ دنیا میں ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے وقعت۔ برتری اور اہمیت حاصل ہو لیکن لوگ اس بات کو بھول جاتے اور نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بڑی وقعت اور برتری اسی میں ہے کہ وہ دوسروں کی کچھ خدمت کریں۔

ایک چھوٹے سے مذہبی فرقے کے پیشوا کے متعلق حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس نے ایک روز اپنے پیروؤں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ آئندہ چہارشنبہ کو دنیا ختم ہو جائے گی۔ پیرو اس پیشین گوئی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی جائداد فروخت کر دیئے اور دنیوی معاملے چھوڑ کر آنے والی مصیبت کے انتظار میں رہے۔ چہارشنبہ گزر گیا لیکن دنیا ختم ہوئی اور نہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ جمعرات کو سب پیرو پیشوا کے پاس جمع ہوئے اور اس سے اس کی غلط بیانی کے متعلق جواب طلب کیا اور کہا کہ دیکھو تمہارے کہنے پر ہم نے اپنا تمام مال اور اسباب فروخت کر دیا اور سب سے کہہ دیا کہ چہارشنبہ کو دنیا ختم ہو گی اور جب لوگ ہنسنے لگے تو ہم نے تمہاری پیشین گوئی پر ایمان رکھتے ہوئے ان کو یقین دلایا کہ ہم سچائی پر ہیں۔ چہارشنبہ گزر گیا اور دنیا اپنی حالت پر باقی ہے۔ پیروؤں کی گفتگو سن کر پیشوا نے جواب دیا "میرا چہارشنبہ تمہارا چہارشنبہ نہیں ہے۔" معاملے کو ایک خاص ڈھنگ سے سمجھا کر اور ایک بات بنا کر پیشوا نے اپنے کو بچا لیا۔ اس حکایت سے ظاہر ہوا کہ اگر کوئی شخص

کسی چیز کے کوئی خاص معنی اور مطلب بتادے لیکن وہ مقبول عام نہ ہوں تو مہمل سمجھے جائیں گے زندگی کے وہی معنی اور مقاصد صحیح اور درست ہوں گے جن کو لوگ معقول سمجھیں اور ان کو قبول کرنے۔ اختیار کرنے آمادہ ہوں۔ زندگی کے مسائل کا ایک اچھا حل دوسرے متعدد مسائل کے حل کے لئے راستہ صاف کر دیتا ہے اس لئے کہ اس میں ہم بہت سے مشترک مسائل کو بھی کامیابی کے ساتھ سمجھ لیتے ہیں۔

زندگی کا مقصد تعاون ہے

طباعی (یعنی غیر معمولی ذہنیت) کی تعریف سوائے اعلیٰ ترین افادیت کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ غیر معمولی ذہنیت رکھنے والے کو ہم طبّاع صرف اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت سے ہم کو فائدہ پہنچاتا ہے اس کے فیض سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ ایک طبّاع کی زندگی کا مطالعہ ہم کو بتائے گا کہ اس کا وجود دوسروں کے افادہ کے لئے نہ کہ خود اس کی ذاتی فائدہ کے لئے ہے۔ ہر وہ شخص جو زندگی کے مسائل کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس نے اس راز کو خوب سمجھ لیا ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد دوسروں سے مل جل کر کام کرنا۔ تعاون کرنا اور ان کے معاملوں میں دلچسپی لینا ہے۔ ایسے شخص کا ہر کام اپنے ہم جنسوں کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہوتا ہے۔ یہ شخص کبھی مشکلوں اور مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے تو ان سے رہائی حاصل کرنے کے لئے ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ جو دوسروں کے لئے نقصان دہ نہ ہوں بلکہ ان کی بہتری کا سبب ہوں۔ یقیناً بہت سے لوگوں کے لئے یہ نظریہ بالکل نیا ہوگا اور جو معنی زندگی اور جو مقصد زندگی ہم نے بتایا یعنی اشتراک عمل (مل جل کر کام کرنا) اور دوسروں کے معاملوں میں دلچسپی لینا اس کو وہ شک کی نظر سے دیکھیں گے اور کہیں گے کہ اس سے دوسروں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ سوال کریں گے کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ دوسروں کا ہی خیال کرتا رہے تو پھر آخر خود اس کا کیا حشر ہوگا؟ اگر وہ ہمیشہ دوسروں کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے اور ان کی فلاح و بہبود کی فکر میں لگا رہے تو کیا اس کی شخصیت کو نقصان نہ پہنچے گا؟ وہ خود گھاٹے میں نہ رہے گا؟ کیا کم از کم بعض لوگوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اپنی نشو و نما کے لئے

دوسروں کا خیال چھوڑ کر خود اپنا خیال رکھیں؟ کیا ہم میں ایسے لوگ نہیں ہیں جن کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنی اغراض کو پورا کریں اور اپنی شخصیت کو مضبوط اور مستحکم کرنا سیکھیں؟ اس قسم کے سوالات کرنے والے یقیناً غلطی پر ہیں۔ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا مقصد زندگی یہ ہو کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہونچائے۔ دوسروں کی خدمت کرے تو یہ مقصد اسی وقت پورا ہوگا جب کہ وہ خود کو اس خدمت کے قابل پہلے بنالے۔ خلق کی خدمت انجام دینے کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ پہلے اپنے میں سماجی جذبات پیدا کرے اور مشق کے ذریعے ان جذبات کو درجہ کمال پر پہونچائے۔ جب اس تیاری میں اس کے سماجی جذبات پختہ ہو جائیں گے تو پھر وہ تینوں مسائل زندگی (یعنی معاشی۔ سماجی اور جنسی) آسانی سے حل کر سکے گا۔ خود ہر طرح کا فائدہ اٹھائے گا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائے گا۔

شادی اور مقصد زندگی

شادی کے مسئلہ کو لو اور غور کرو۔ اگر ہم کو اپنی شریک زندگی سے ذرا بھی دلچسپی ہو۔ اس کی بھلائی کا ہمیں تھوڑا سا خیال ہو۔ ہم اس کی زندگی کو خوش گوار بنانا چاہتے ہوں تو ہمارے لئے لازمی ہوگا کہ ہم زندگی کے صحیح معنی اور مقصد سمجھ کر اپنی اصلاح کریں۔ اگر ہم زندگی کا مقصد صرف ذاتی فائدہ۔ ذاتی راحت اور آرام سمجھ کر خود غرضانہ زندگی بسر کریں گے تو یقیناً ہمارا سلوک اپنی شریک زندگی کے ساتھ محض تحکمانہ رہے گا اور آپس کے تعلقات دوستانہ اور محبت بھرے ہونے کے بجائے بے لطف اور ناخوش گوار ہوں گے۔

دوسروں کی خدمت کرنا زندگی کا حقیقی مقصد ہے

ایک اور چیز قابل غور ہے جو ثابت کرتی ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد دوسروں کی خدمت کرنا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ جب اس ورثہ پر جو ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے چھوڑا ہے ہم غور کرتے ہیں تو ہم کیا پاتے ہیں؟ یہی کہ انھوں نے ہماری بڑی خدمت کی ہمارے لئے محنت کی۔ زحمتیں اٹھائیں۔ ہمارے لئے

کاشت کی قابل زمین چھوڑی۔ عمارتیں اور راستے بنائے۔ اپنے علوم اور تجربوں کی بنا پر مختلف علوم و فنون۔ سائنس اور فلسفے کے بیش قیمت ذخیرے ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ آپس میں میل جول رکھنے۔ مل جل کر کام کرنے کے طریقے ہم کو بتا گئے جن سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور یہ سب ان لوگوں نے صرف اس لئے کیا کہ ان کا سطح نظر زندگی کے متعلق نوع انسان کی خدمت اور ان کی مدد کرنا تھا۔ اب دیکھئے کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے خلق اللہ کی خدمت اور اپنے ہم جنسوں سے تعاون کرنے کا کبھی خیال ہی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنی فکر میں لگے رہے اور کہتے رہے کہ ”اس دنیوی زندگی سے ہم خود جو کچھ حاصل کر سکتے ہیں حاصل کر لیں گے“۔ یہ لوگ بھی مر گئے لیکن انھوں نے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا اور ان کا نام دنیا سے ایسا مٹ گیا جیسا کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دھرتی ماتا نے کہا ”مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ تم مجھ پر رہنے بسنے اور زندہ رہنے کے قابل نہیں ہو۔ تم جو مقصد اور اغراض اپنے دل و دماغ میں رکھتے ہو وہ ایسے پست و ذلیل ہیں کہ تمہارے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ تم مر جاؤ اور اپنے وجود سے میری سطح کو پاک کر دو“۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں کے متعلق جو خلق اللہ کی خدمت اور ان کی امداد کو مقصد زندگی تصور نہیں کرتے دنیا کا یہ فیصلہ رہا اور ہمیشہ رہے گا کہ ”تم بیکار انسان ہو دنیا کو تمہاری ضرورت نہیں“۔

ہمارے کلچر میں متعدد خامیاں ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اس میں تبدیلیاں کریں لیکن ہر تبدیلی ایسی ہو جو نوع انسان کی مزید بھلائی اور بہتری کا باعث ہو۔

ہر زمانے میں ایسے لوگ گذرے جنہوں نے اس راز کو جانا اور سمجھا کہ زندگی کا مقصد حقیقی یہی ہے کہ نوع انسان سے دلچسپی اور ہمدردی رکھی جائے۔ اس کی خدمت کی جائے اور یہ سمجھ کر انھوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ انسانوں میں سماج سے دلچسپی اور محبت کے جذبات بڑھائیں۔

مذہب کا نصب العین ۔ سب مذہبوں کا نصب العین یہی رہا کہ

انسان کو راہ نجات پر لگایا جائے۔ دنیا میں جتنی بڑی ذہنی تحریکیں ظہور میں آئی ہیں ان سب کے محرکین کا یہی مقصد رہا کہ انسان میں سماج سے دلچسپی پیدا کریں۔ مذہبوں نے سب سے بڑھ کر اس چیز کی تبلیغ کی لیکن افسوس کے لوگوں نے مذہبوں کی تعلیم وتلقین کو جیسا چاہئے تھا نہ سمجھا اور غلط نتائج نکالے چنانچہ پیروان مذاہب نے نوع انسان میں سماجی دلچسپی پیدا کرنے اور اسے بڑھانے اور آپس میں محبت والفت قایم کرنے کے بجائے آپس میں نفاق وشقاق پیدا کر دیا اور پھوٹ ڈالی۔

سائینس اور مقصد زندگی

ماہرین انفرادی نفسیات نے بھی سائنسی طریقوں سے یہی نتیجہ نکالا ہے اور سائنسی اصطلاحات کے ذریعے یہی چیز بتائی ہے کہ انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد "دوسروں کے لئے زندہ رہنا ہے" ہونا چاہیئے۔ سائینس اس بارے میں مذہب اور فلسفے سے چند قدم آگے ہے۔ سائینس دان جو ہمیشہ خلق اللہ کی بھلائی اور بہتری کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں شاید زیادہ مدلل اور واضح طور پر زندگی کے معنی اور مقصد لوگوں کو سمجھا سکیں اور ان کے دلوں میں بٹھا سکیں اور انھیں (یعنی سائینس دانوں کو) بہ نسبت مذہبی پیشواؤں اور ریاست دانوں کے زیادہ کامیابی نصیب ہو۔

اس مسئلہ کو مختلف افراد مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سب بالآخر ایک ہی نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ زندگی کا صحیح مقصد یہی ہے کہ نوع انسان سے دلچسپی رکھی جائے ان کی خدمت کی جائے۔

نفسیات اور مقصد زندگی۔

چونکہ زندگی کے معنی یا دوسرے الفاظ میں مقصد حیات کے سمجھنے پر انسان کی آیندہ زندگی کے اچھی یا بری ہونے کا انحصار ہوتا ہے اس لئے ہمارے لئے یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ زندگی کے مختلف مقاصد کس طرح قرار دیئے گئے۔ ان مختلف مقاصد میں کیا فرق ہے اگر ان میں بعض غلط ہیں تو ان کی اصلاح کیونکر کی جا سکتی ہے۔ یہ چیزیں نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ علم عضویات یا حیاتیات سے

نوع انسان کے فائدے کے لحاظ سے زندگی کا مقصد بتانا اور یہ ظاہر کرنا کہ اس مقصد کا اثر انسانوں کی زندگی اور ان کے معاملات پر کیا پڑتا ہے یہ نفسیات کا کام ہے۔

انسان کا طرز زندگی بچپن ہی میں قایم ہو جاتا ہے۔

ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے ہر بچہ زندگی کے معنی اور اس کا مقصد معلوم کرنے کی موہوم کوشش شروع کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے بھی اس بات کا اندازہ لگانے اور معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ماحول میں ان کی کارکردگی کی قوت کتنی ہے۔ ان کی قابلیتیں اور صلاحیتیں کیا ہیں۔ جب بچہ پانچ سال کا ہوتا ہے تو وہ اپنے لئے ایک ‘طرز زندگی’ قایم کر لیتا اور اپنے ایک خاص ڈھنگ سے زندگی کے مسائل حل کرنے لگتا ہے۔ اس عمر میں بچہ خوب سمجھنے لگتا ہے کہ اس کو دنیا میں دوسروں سے کیا توقع رکھنا چاہیے اور اس سے کیا توقع کی جاتی ہے۔ اس عمر سے بچے ایک پائدار ادراکی نظام کے تحت دنیا کو دیکھتے ہیں۔ تجربوں کی تعبیر ان تجربوں کو قبول کرنے سے پہلے ہی کر لی جاتی ہے اور تعبیر ہمیشہ پہلے ہی سے مقرر کیے ہوئے مقصد زندگی کے مطابق ہوتی ہے۔

غلطی کی اصلاح ہو سکتی ہے

اگر کوئی شخص زندگی کے غلط معنی اور مفہوم سمجھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کو زندگی کے مسائل حل کرنے اور اپنے مشاغل کی تکمیل میں ناکامیوں اور زحمتوں کا سامنا ہوتا ہے تو وہ زندگی کو خیرباد نہیں کرتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ زندگی کے صحیح معنی سمجھے اور ایسے طریقے اور ذریعے اختیار کرے کہ جن سے اس کی زندگی کامیاب ہو۔ اگر کسی نے زندگی کا غلط مقصد اور اس کے غلط معنی سمجھ لئے ہوں تو وہ اپنی ان غلطیوں اور ناکامیوں پر جو زندگی کے غلط تصور سے واقع ہوئی ہوں غور کر کے زندگی کے متعلق اپنا مطمح نظر بدل سکتا اور اصلاح کر لے سکتا ہے لیکن شاذ و نادر ایسا

ہوتا ہے کہ کوئی شخص غلطیوں اور زندگی کی ناکامیوں کی وجہ اپنا مطمح نظر یا طرز زندگی بدل دیتا اور اصلاح کی کوشش کرتا ہو۔ وہ اسی وقت ہی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے جب سماج کا دباؤ اس پر پڑتا ہے یا یہ کہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لئے اب اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں رہا اور اس کو اپنی اصلاح کر لینی چاہیئے۔ اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد حاصل کرے جو زندگی کے صحیح معنی سمجھتے ہیں اور زندگی کے حقیقی مقصد سے واقف ہیں۔

مختلف قسم کے تجربے

مختلف قسم کے تجربوں کو سمجھنے کے لئے ہم ایک سادا مثال پیش کرتے ہیں۔ بچوں کے تلخ تجربوں کی بعض وقت بالکل الٹی تعبیر کی جاتی ہے۔ وہ شخص جسے زندگی میں تلخ تجربوں کا سامنا رہا ہو۔ ان پر غور و فکر کرتے وقت صرف ایسی تدبیریں ذہن میں لائے گا جن سے آیندہ کے لئے ان سے نجات ملے اور اپنے دل میں کہے گا کہ "ہمیں ایسے ناشدنی حالات کو ختم کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے تا ہمارے بچے ان سے دوچار نہ ہونے پائیں" یعنی وہ شخص جو دنیا میں خود مصیبتیں اٹھا چکا ہو پسند نہیں کرتا کہ دوسرے بھی ان کا شکار ہوں بلکہ اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی نشو و نما اور ترقی کا راستہ رکاوٹوں اور تلخ تجربوں سے صاف رہے اور ان کی بہتری کے لئے مواقع فراہم ہوں۔

ایک دوسرا شخص محسوس کرے گا کہ دنیا میں انصاف نہیں ہے اور کہے گا کہ "دوسرے لوگ تو اچھی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن دنیا والوں نے مجھ پر ستم ڈھایا۔ مجھ سے برا سلوک کیا تو پھر میں اُن سے کیوں اچھا سلوک کروں"۔ وہ ماں باپ جو دنیا والوں کے متعلق اس قسم کا خیال رکھتے ہیں وہ اپنی اولاد کے متعلق بھی یہی خیال رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "جب ہم نے بچپن میں تلخ تجربے اٹھائے اور مصیبتیں برداشت کیں اور باوجود اس کے کامیاب ہوئے تو ہمارے بچوں کو مشکلوں اور سختیوں کا مقابلہ

کیوں نہ کرنا چاہیئے۔"

ایک تیسرا شخص کہے گا کہ "میں جو کچھ بھی کروں مجھے قابل معافی سمجھا جائے اس لئے کہ میرے بچپن کا زمانہ ناخوش گوار رہا"۔ بہر حال ان تین قسم کے لوگوں کے اعمال اور افعال سے ظاہر ہوگا کہ انھوں نے زندگی کا کیا مفہوم سمجھ رکھا ہے اور جب تک یہ اپنے اس مفہوم کو نہ بدلیں ان کے افعال اور کردار میں تغیر نہ ہوگا۔

انفرادی نفسیات اور مسئلہ جبر۔

انفرادی نفسیات جبر کے نظریئے کو کہ انسان فاعل مختار نہیں ہے باطل کر دیتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ کوئی "تجربہ" کامیابی یا ناکامی کا باعث نہیں ہوتا ہم اپنے تجربوں کے ناکامیوں سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان سے ایسے نتائج نکال لیتے ہیں جو ہماری مرضی کے موافق ہوں۔ ہم اپنی خود مختاری کی وجہ اپنے افعال اور اعمال کو جیسا چاہتے ہیں معنی دے لیتے ہیں اور اپنے دل کو سمجھا لیتے اور زندگی کے بعض تجربوں کو اپنی آیندہ زندگی کے لئے بنیادیں قرار دے لیتے ہیں جو غلطی ہے۔ ہم حالات سے معنوں کی تعبیر نہیں کرتے بلکہ حالات کو اپنے من بھاتے معنی دے کر زندگی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

بیمار اور ناقص اعضاء رکھنے والے بچے۔

بچپن میں بعض بچوں پر ایسے واقعات گذرتے ہیں جو ان کی آیندہ زندگی کو متاثر کر دیتے اور اکثر ان کی زندگی کی ناکامیابی کا باعث ہوتے ہیں مثلاً وہ بچے جو ناقص اعضاء جسمانی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں یا بچپن میں ہمیشہ بیمار رہا کرتے ہیں تو وہ اپنی کمزوری اور پریشانی میں اتنے مبتلا رہتے اور اپنی فکر میں ایسے لگے رہتے ہیں کہ انھیں دوسروں کا خیال کرنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ زندگی کے معنی اور مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ اس قسم کے معذور بچوں کو جب تک کہ کوئی تعلیم اور تفہیم نہ کرے کہ وہ اپنا خیال چھوڑ کر دوسروں سے دلچسپی پیدا کریں وہ اپنے ہی خیالات اور جذبات میں کھوئے رہیں گے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ کمزور اور معذور بچے جب اپنا مقابلہ

دوسرے صحیح اور تندرست لوگوں سے کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں میں سے بعض تو ان پر ترس کھاتے بعض ان کا مذاق اڑاتے اور بعض ان سے بھاگتے ہیں تو ان بچوں میں احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہوے کہ دنیا ان کو حقیر اور ذلیل سمجھتی ہے نا اُمید ہو جاتے اور خود کو سماج کے لئے بیکار تصور کرنے لگتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں پہلا شخص تھا جس نے ان مشکلات کا ذکر کیا جن کا معذور بچوں اور ان بچوں کو جن کے غدود ٹھیک طور پر کام نہیں کرتے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سائنس کے اس شعبے میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے لیکن یہ ترقی اس طرح نہیں ہوئی جیسا کہ میں چاہتا تھا۔

شروع سے میرا یہی خیال رہا کہ انسانی کمزوریوں اور زندگی کی ناکامیوں کی ذمہ داری صرف توارث یا جسمانی خرابیوں پر عاید نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کی اور کوئی وجہ ہونی چاہیے اور اس وجہ کی میں تلاش میں تھا۔ کسی انسان کے اعضا کا نقص یا عیب اس کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ زندگی کا غلط طریقہ اختیار کرے۔

ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی دو بچوں کے غدود ان کی زندگی پر ایک ہی اثر ڈالتے ہوں اور ہم نے دیکھا کہ اکثر بچے زندگی میں اپنی مشکلوں کو عبور کر لیتے ہیں اور اس کوشش میں ان کی چھپی ہوئی مفید اور کار آمد قوتیں خود بخود نشو و نما پا جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے انفرادی نفسیات اصلاح نسل کی اسکیموں کے پرچار کا کوئی اچھا ذریعہ نہیں ہے۔

اکثر نامور افراد ناقص اعضاء رکھتے تھے۔

اکثر نامور اور ممتاز افراد جنہوں نے ہمارے کلچر میں مفید اضافہ کیا ایسے تھے جنھوں نے ناقص اعضاء جسمانی کے ساتھ اپنی زندگی شروع کی۔ ان کی صحت ہمیشہ خراب رہی اور ان میں سے بعض تو کم عمر مر گئے۔ ان ہی لوگوں نے دنیا کی ترقی میں زیادہ تر حصّہ لیا اور دنیا کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان لوگوں کو جو ابتداء زندگی سے جسمانی کمزوریوں

میں مبتلا رہے اور جن کو دنیوی مشکلات کا بھی سامنا رہا زندگی کی کشمکش نے قوی کر دیا۔ اور یہ آگے بڑھتے گئے۔

کسی بچے کے قوائے جسمانی سے ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اس کے قوائے دماغی اچھے ہیں یا برے۔ چونکہ اب تک ان بچوں کی جنہوں نے ناقص اعضاء یا غدود کے ساتھ زندگی شروع کی صحیح طریقے اور اصول پر تربیت نہیں کی گئی اور ان کی مشکلوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لئے وہ بچے خود غرض ہو گئے اور اپنے تن من کی فکر میں پڑ گئے۔ مختصر یہ کہ ناقص اعضاء اور خراب صحت رکھنے والے بچوں کی زندگی میں ناکامیاب ہونے کی وجہ یہی ہوئی کہ ان کی مشکلوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور صحیح اصول پر ان کی پرورش اور تربیت نہیں ہوئی۔

لاڈلے بچے

دوسری قسم کے لوگ جو زندگی کے صحیح معنی اور مقصد سمجھنے سے قاصر رہے وہ ہیں جنہیں بچپن میں لاڈ اور پیار سے پالا گیا اور بے موقع لاڈ سے خراب کر دیا گیا۔ لاڈلے بچے کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی خواہشیں قانون کا حکم رکھتی ہیں۔ اس بچے کو گھر میں خاص اہمیت دی جاتی ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہوتا پس وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ اہمیت اور خصوصیت اس کا پیدائشی حق ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ زندگی کی کشمکش میں پڑتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اب وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں رہا اور لوگ اس کی خواہشوں اور جذبات کی پروا نہیں کرتے اور ان کا پورا کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے تو وہ حیران اور پریشان ہو جاتا ہے اور خیال کرنے لگتا ہے کہ دنیا اس سے برا سلوک کر رہی ہے۔ لاڈ اور پیار کی پرورش کی وجہ وہ صرف "لینا" جانتا ہے "دینا" نہیں جانتا اس کے سوائے اور کسی طریقے سے معاملات اور مسائل زندگی کو دیکھنے اور سلجھانے کا وہ عادی نہیں ہوتا۔ گھر والے اس کے اس قدر مطیع رہے اور اس کی خواہشوں کو ہمیشہ اس طرح پوری کرتے رہے کہ اس نے اپنی آزادی کھو بیٹھی اور اپنی آپ مدد کرنے کے قابل نہ رہا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ میں لگا رہا دوسروں سے تعاون کرنا

نہیں سیکھا۔ جب کبھی وہ مشکل میں پڑ گیا تو اس سے رہائی حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ جانا وہ یہ کہ دوسروں سے مدد طلب کرے۔ اس قسم کے بچے کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کو اہمیت دیں اور وہ لوگوں کو مجبور کر سکے کہ اس کو ایک خاص ہستی سمجھ کر اس کی خدمت کریں۔ لوگ اس کی تمام خواہشات اور ضروریات پوری کریں تو وہ خوش رہتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کی زندگی اس کے اور دوسروں کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے۔ یہ لاڈلے بچے بڑے ہو کر قوم اور قبیلے کے لئے ایک خطرناک گروہ بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ بعض وقت دوسروں سے اپنا مطلب حاصل کرنے اور اپنی اغراض پوری کرنے کے لئے محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے دلوں میں محبت اور ایثار کا جذبہ نہیں ہوتا اور یہ لوگ مثل دوسروں کے دنیوی معاملوں میں اپنے ہم جنسوں سے تعاون اور اشتراک عمل کے لئے تیار نہیں رہتے۔ پھر ان میں سے بعض کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ سماج کے خلاف کھلی بغاوت کر دیتے ہیں۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ بچپن میں ان کے لاڈ اٹھائے جاتے تھے اور غلامانہ طریقے پر ان کی خدمت کی جاتی تھی اب ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اب لوگ ان کی پرواہ نہیں کرتے تو یہ سماج کو اپنا مخالف اور دشمن تصور کرنے لگتے اور اس سے انتقام لینے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اب اگر سماج ان کے طریقہ زندگی کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھنے لگتا ہے (جو خود ان کی خودغرضانہ اور تحکمانہ طریقہ زندگی کا نتیجہ ہوتا ہے) تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان سے خواہ مخواہ بُرا سلوک کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ سزاؤں کے مؤثر نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ سزا یافتہ سمجھتا ہے کہ وہ بے قصور تھا لیکن سزا دینے والے نے محض مخالفت کی وجہ سزا دی۔ ایک بے موقع لاڈ سے بگڑا ہوا بچہ چاہے ہڑتال کرے یا کھلی بغاوت کرے یا اپنی کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے دوسروں پر دباؤ ڈالے یا قوت اور شدت سے کام لے کر بدلہ لے یہ سب ایک ہی قسم کی غلطی ہے جو اس سے سرزد ہوتی ہے۔

خود غرض لوگوں کی ذہنیت

ہم دنیا میں ایسے بھی لوگ پاتے ہیں جو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اوپر بیان کئے ہوئے طریقوں میں سے ایک یا اس سے زیادہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کے معنی اور اس کا مقصد یہی ہے کہ:-

(۱) دنیا میں ہم کو سب پر فوقیت اور تقدم حاصل ہے یعنی ہم ہی ہم ہیں۔
(۲) دنیا کو چاہئے کہ ہماری شخصیت اور اہمیت کو مانے۔
(۳) جو کچھ ہم چاہتے ہیں اور چاہیں وہ سب ویسا ہی ہو کر رہنا چاہئے۔

اس خیال کے لوگ جب تک زندگی کے یہ معنی اور اس کا یہ مقصد سمجھے رہتے ہیں ہر معاملہ میں ان کا اقدام غلط طریقے سے ہوتا ہے اور یہ لوگ کبھی بھی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

آوارہ بچے

تیسرا گروہ جو زندگی کے صحیح معنی اور مقصد سمجھنے سے قاصر رہتا ہے وہ آوارہ بچوں (یعنی وہ بچے جو بلا کسی نگہداشت۔ بلا تعلیم و تربیت اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں) کا ہوتا ہے۔ آوارہ بچہ چونکہ اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا شروع سے جانتا ہی نہیں کہ 'محبت' کس کو کہتے ہیں اور 'تعاون' کیا چیز ہے۔ اس کے خیال میں تو دنیا کی زندگی میں ان دو چیزوں یعنی 'محبت' اور 'تعاون' کا وجود ہی نہیں ہے پس ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ آوارہ بچہ آگے بڑھ کر جب دنیا کے مسئلوں اور معاملوں سے دوچار ہوگا تو ان کا حل کرنا اس کے لئے بہت مشکل ہوگا اور تنہا کسی کی مدد کے بغیر وہ ان مسئلوں اور معاملوں کو نہ حل کر سکے گا۔ چونکہ بچپن میں سوسائٹی نے اس سے سرد مہری اور لاپروائی کی تھی اس لئے وہ سن شعور کو پہونچ کر سوسائٹی (سماج) سے اسی قسم کے سلوک کا متوقع رہتا ہے۔ اس میں اتنی بات سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ اگر وہ خود کو دوسروں کے لئے مفید ثابت کرے تو ان کی محبت حاصل کر سکتا اور ان کے دلوں میں اپنی عزت اور وقعت قایم کر سکتا ہے۔ آوارہ بچے کی اس ذہنیت کا کہ ساری دنیا اس کے مخالف

ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کو شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے اور خود بھی اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رکھتا۔ اس کی خود اعتمادی جاتی رہتی ہیں۔

ماں کا پہلا فرض دنیا میں ہم سے کسی کے بے لاگ۔ بے لوث محبت رکھنے سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں یہ چیز اس قدر شیریں اور لذت بخش ہوتی ہے کہ بھلائی نہیں جا سکتی۔ ہر ماں کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے بچے کے لئے خود کو ایک قابل بھروسہ ہستی ثابت کرے تاکہ بچے کو اس پر اعتماد ہو جائے پھر وہ بتدریج بچے کے محبت اور تعاون کے جذبات اور احساسات کو اجاگر کرے۔ اگر ماں یہ نہ کر سکے گی تو بچے کے لئے اپنے ہم جنسوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا اور سماج سے دلچسپی پیدا کرنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ ہر بچے میں فطرتاً یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے دلچسپی رکھے پس اگر شروع سے اس صلاحیت کی صحیح اصول پر تربیت نہ کی جائے اور اس سے کام نہ لیا جائے تو یہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

اگر ہم کوئی ایسا بچہ پائیں جس کی بچپن میں کوئی پرورش یا نگہداشت نہیں ہوئی اور جو سوائے نفرت۔ ذلت وحقارت کے اور کچھ نہیں دیکھا تو ہم دیکھیں گے کہ یہ بچہ "تعاون" کے معنی نہیں سمجھ سکتا۔ دنیا میں چونکہ وہ تنہا۔ بے یار و مددگار رہا اس لئے وہ جانتا ہی نہیں کہ دوسروں سے کس طرح میل جول قایم کرے یہ بچہ ان تمام طریقوں سے جن کے ذریعہ دنیا میں لوگوں سے مل جل کر کام کئے جاتے ہیں اور زندگی بسر کی جاتی ہے بالکل ناواقف ہوگا اور دنیا میں زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ تلف ہو جائے گا۔

عام طور پر آوارہ بچوں کی تھوڑی پرورش اور نگہداشت شروع میں ہو جاتی ہے لیکن جیسی چاہئے ویسی نہیں ہوتی۔ اگر مطلقاً نہ ہوتی تو یہ بچے تلف ہو جاتے پس یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب ہم "آوارہ بچے" کہتے ہیں تو ہمارا مطلب ان ہی بچوں سے ہے جن کی بچپن میں کچھ نہ کچھ پرورش اور نگہداشت ہوئی لیکن پوری

طور پر نہیں ہوئی۔ حقیقت میں آوارہ بچہ وہ ہے جس نے شروع سے کسی کو اپنا چاہنے والا۔ محبت کرنے والا نہیں پایا جس پر وہ بھروسہ کرتا جس سے وقت ضرورت مدد لیتا۔

ہمارے تمدن کی بدقسمتی

ہمارے تمدن کی یہ بدقسمتی ہے۔ ایک دردناک کہانی ہے کہ دنیا میں جو لوگ ناکامیاب ثابت ہوتے ہیں ان میں سے اکثر یتیم یا ناجائز اولاد ہوتے ہیں۔ جن کا بچپن میں کوئی نگران۔ پرسان حال اور محبت وشفقت سے دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہوتا۔ حقیقی معنی میں یہی بچے "آوارہ بچے" کہے جاتے ہیں۔

الحاصل ان تین قسم کے یعنی ناقص اعضاء جسمانی رکھنے والے۔ لاڈلے اور آوارہ بچوں میں سے وہ لوگ نکلتے ہیں جو زندگی کے صحیح معنی اور مقصد سمجھنے سے قاصر رہتے اور غلط معنی اور مقصد سمجھ لیتے ہیں پس چاہئے کہ ان بچوں کو ابتداء سے ایسی تعلیم اور تربیت دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات اور دنیوی مسئلوں کو صحیح طور پر کامیابی کے ساتھ حل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان بچوں کو زندگی کے صحیح معنی اور مقصد سمجھنے میں مدد دی جائے۔ اگر ہم خود غور وفکر کرنے کے عادی ہوں تو ہم آسانی سے ان تین قسم کے بچوں کے خیالات اور اعمال کا مشاہدہ کرسکیں گے ان کے معاملوں میں دلچسپی لیں گے اور معلوم کرلیں گے کہ انھوں نے اپنے لئے زندگی کا کیا مقصد قرار دے لیا ہے پھر انھیں سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش کریں گے۔

خواب سے خیالات معلوم کئے جاسکتے ہیں

کسی شخص کے خیالات اور حقیقی جذبات معلوم کرنے کے لئے خواب اور تلازمات مفید ثابت ہوتے ہیں۔ انسان کی شخصیت خواب میں وہی رہتی ہے جو بیداری میں ہوتی ہے فرق اتنا ہوتا ہے کہ خواب میں چونکہ وہ سماجی قیود اور اثرات کے زیر اثر نہیں رہتا اس لئے اس کی شخصیت بلاکسی قید وبند کے اپنی اصلی حالت میں ظاہر

ہو جاتی ہے۔

یادداشتوں سے بھی خیالات معلوم ہوتے ہیں

یہ معلوم کرنے کہ کسی شخص نے زندگی کے معنی اور مقصد کیا سمجھے ہیں اس کی یادداشتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یادداشت خواہ وہ کتنی ہی معمولی نہ ہو بطور یادگار کے ہوتی اور اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اہم اس لئے ہوتی ہے کہ اس شخص کی زندگی پر اس کا کافی اثر پڑتا ہے گویا کہ وہ اس کو کہتی ہے "تم کو یہی توقع رکھنی چاہیئے" "تم کو اس چیز سے پرہیز کرنا چاہیئے" "یا یہ کہ" زندگی یہی ہے"۔ دنیا میں انسان کو اگر کوئی تجربہ ہو تو اس کو اہمیت جب ہی حاصل ہوتی جب وہ اچھی طرح حافظہ میں اتر جا- یاد رہ جائے اور انسان اس سے عملی فائدہ اٹھاتا رہے۔ ہر ایک یادداشت ایک نشانی ہو جاتی ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی نے شروع سے زندگی کے کیا معنی سمجھے اور اپنی زندگی کا مقصد کیا قرار دیا اور پھر کیا طریقہ کار اختیار کیا۔ کسی شخص کی بچپن کی وہ چند باتیں اور واقعات جو اس کو خاص طور پر یاد رہ گئے ہوں ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

بچپن کی یادداشتیں

بچپن کی یادداشتیں دو سبب سے اہم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے ذریعے کسی شخص کی حقیقی حالت کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی رہا اور دنیا کو اس سے جو توقعات تھے انھیں اس نے کس طرح پورا کیا۔ دوسرے یہ کہ یادداشتیں انسان کے اختیار کئے ہوئے راہ حیات کی ابتدا کا پتہ دیتی ہیں اور یہ ابتدا ہوتی ہیں اس کی لکھی ہوئی آپ بیتی کا جو وہ مرتب کر لیتا ہے۔

ان یادداشتوں میں ہم انسان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ اس کی پر عزم تمناؤں اور آرزوؤں کی جھلک بھی پاتے ہیں۔

نفسیاتی تحقیق کے لئے یہ بات اہم نہیں ہے کہ کسی شخص کی کوئی یادداشت جسے وہ پہلی سمجھتا ہو حقیقت میں پہلی ہی ہو یا وہ کسی حقیقی واقعہ کی یاد بھی ہو یا نہ ہو

یادداشتوں کی اہمیت صرف اِن کی تعبیر کے لئے ہی ہے یعنی وہ زندگی کے موجودہ اور آیندہ واقعات کو کس رنگ میں پیش کرتی ہیں۔

چند یادداشتیں

اب بچپن کی چند یادداشتیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ ان یادداشتوں نے مقصد زندگی قایم کرنے پر کیا اثر ڈالا۔

یادداشت نمبر۱

ایک عورت نے اپنی یادداشت کی ابتدا اس جملے سے کی:- "بچپن میں ایک دفعہ گرم گرم کافی دان میز پر سے مجھ پر گر پڑا اور میں جل گئی اور میں نے دل میں کہا کہ کیا دنیا ایسی تکلیف دہ ہوتی ہے۔" ہم کو یہ معلوم کر کے تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ اس عورت نے جس جملے سے اپنی یادداشت شروع کیا اس سے اس کا لاچاری کا احساس ظاہر ہوتا اور ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے معمولی خطرات اور مشکلات کو وہ ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور اس سے ہم یہ بھی معلوم کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل میں دوسروں (یعنی اپنے بزرگوں اور ملازمین) کو ملامت بھی کرتی ہو گی کہ انھوں نے اس کی خاطر خواہ خبر گیری اور حفاظت نہیں کی بلکہ اس سے غفلت برتی اور بچپن میں جب وہ ناسمجھ چھوٹی بچی تھی اس کو خطرہ میں ڈالا۔

یادداشت نمبر۲

ایک دوسری یادداشت میں بھی دنیا کی اسی قسم کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ کہتی ہے:- "مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں تین سال کی تھی تو ایک روز بچوں کی گاڑی میں سے گر پڑی۔" اس واقعے کے بعد اس نے کئی دفعہ خواب میں دیکھا کہ دنیا ختم ہو رہی ہے اور یہ دیکھ رہی ہے کہ آسمان سرخ ہو گیا ہے۔ اس میں آگ لگ گئی ہے۔ تارے ٹوٹ رہے ہیں اور دنیا تاروں سے ٹکرانے کو ہے۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس لڑکی سے پوچھا گیا کہ آیا وہ کسی چیز سے ڈرتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے خوف ہے کہ میں زندگی میں کامیاب نہ ہوں گی۔" اس جواب سے ظاہر ہوا کہ اس کی بچپن کی یادداشت یعنی گاڑی سے گرنا اور پھر کئی بار خواب دیکھنا کہ دنیا ختم ہو رہی ہے اس میں یہ

نا امیدی کا احساس اور آیندہ زندگی کامیاب نہ ہونے کا خیال پیدا کر دیا۔

یادداشت نمبر ۳ ایک بارہ ۱۲ برس کا لڑکا جو راتوں کو بستر میں پیشاب کر لیا کرتا تھا اور اپنی ماں سے ہمیشہ لڑتا۔ حجت و تکرار کیا کرتا تھا طبی مشورے اور علاج کے لئے میرے پاس رجوع کیا گیا۔ جب اس سے کہا گیا کہ اپنی بچپن کی کوئی یادداشت بیان کرے تو کہا "بچپن میں ایک روز میں الماری میں چھپ گیا اور میری ماں نے یہ سمجھ کر کہ میں کہیں چلا گیا اور گم ہو گیا پریشان ہوئی۔ مجھے پکارتی ہوئی سڑک پر نکل گئی حالانکہ میں گھر میں الماری میں چھپا ہوا تھا" اس بچے کی اس یادداشت سے ہم نے نتیجہ نکالا کہ اس نے اپنا نصب العین زندگی یہ قرار دے لیا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دے کر۔ انھیں دق کر کے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے اور یہ کہ دھوکہ دے کر۔ دوسروں کو بے وقوف بنا کر اپنے دلی مقاصد حاصل کرے اور اپنی حفاظت کے سامان کرے۔ اس بچہ کا بار بار بستر اور کپڑوں میں پیشاب کر لینا بھی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ وہ دوسروں کو دق کر کے انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ ہماری اس تشخیص سے ماں نے اتفاق کیا اور بچے کی آیندہ زندگی کے متعلق تشویش ظاہر کی۔ جیسا کہ سابقہ یادداشتوں میں بتایا گیا ویسا ہی اس بچے کے دماغ میں یہ خیال بچپن ہی میں جم گیا کہ دنیا کی زندگی خطروں سے بھری ہوئی ہے اور جب تک دوسرے اس کی خبر گیری اور دیکھ بھال نہ کریں وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کی زندگی کا انحصار دوسروں کی نگہداشت اور حفاظت پر ہے۔

یادداشت نمبر ۴ ایک عورت نے جس کی عمر ۲۵ سال کی تھی اپنی بچپن کی یہ یادداشت بیان کی:-

"جب میں تین سال کی تھی تو ایک روز گھر کے سرداب (تہ خانہ) میں گئی۔ جب میں اندھیرے میں سیڑھیوں پر تھی میرا چچیرا بھائی جو عمر میں مجھ سے کچھ بڑا تھا تہ خانہ کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور میں اس کو دیکھ کر ڈر گئی" اس عورت کا

بچپن کا یہ واقعہ یاد رکھ لینا ثابت کرتا ہے کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی عادی نہیں تھی اور خاص کر لڑکوں کی صحبت اس کو پسند نہ تھی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ہمارا خیال صحیح تھا۔ وہ ماں باپ کی یک لوتی لڑکی تھی اور باوجود ۳۵ سال عمر ہو جانے کے اس نے شادی نہیں کی۔

یادداشت نمبر ۵

ایک لڑکی نے اپنی یادداشت یوں بیان کی۔ "مجھے یاد ہے کہ جب میری ماں مجھے میری چھوٹی بہن کی گاڑی ڈھکیلنے کی اجازت دی تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔" اس یادداشت سے لڑکی میں سماجی احساس کا اعلیٰ درجہ پر نشوونما پایا جاتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی صرف اپنے سے کم عمر لوگوں میں خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے۔ ماں کی مدد اور نگرانی کی محتاج ہے۔

جب فیملی میں بچہ پیدا ہو تو اس کی پرورش میں گھر کے بڑے بچوں کو شریک کرنا اور نومولود کی نگرانی۔ دیکھ بھال میں ان کی دلچسپی پیدا کرنا اور نومولود کی بھلائی بہتری کا انھیں ذمہ دار قرار دینا بڑے بچوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔

کسی شخص کا یار باش ہونا اور ہمیشہ محفلوں اور صحبتوں میں وقت گزارنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ دوسروں سے حقیقی دلچسپی یا ہمدردی رکھتا ہے۔ ایک لڑکی نے اپنی یادداشت اس طرح بیان کی:۔ "میں اور میری بڑی بہن مدرسے کے دو لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔" اس سے ظاہر ہوا کہ یہ لڑکی سماجی جذبات رکھتی ہے۔ آگے چل کر لڑکی کہتی ہے۔ "میں تنہا رہنے ڈرتی ہوں۔" اس سے معلوم ہوا کہ اس میں خود اعتمادی اور آزادی کا احساس کم ہے یہ دوسروں کی مدد کی محتاج ہے۔

کسی کی شخصیت معلوم کرنے کا طریقہ

کسی کی شخصیت معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ دریافت کریں اور پتہ چلائیں کہ اس نے زندگی کے کیا معنی سمجھے ہیں اور اپنی زندگی کا نصب العین یا مقصد کیا قرار دے رکھا ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ انسان کی عادتیں اور اطوار بدل نہیں سکتے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف ان لوگوں کے اطوار اور عادتیں نہیں بدل سکتیں جو زندگی کے صحیح معنی اور مقصد نہ سمجھ سکے۔

بچوں کی اصلاح تعاون کی تعلیم سے ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا جب تک بچے کی ابتدائی طبعی کمزوری معلوم نہ ہو اس کی اصلاح صرف سمجھانے منانے سے نہیں ہوسکتی۔ اصلاح کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ بچے کو اتحادی اور سماجی زندگی بسر کرنے اور زندگی کے مسائل کا دلیری سے مقابلہ کرنے کا عادی کیا جائے۔ اگر ہم بچوں کو آپس میں مل جل کر کام کرنے کی تعلیم دیں تو ہم انھیں اعصابی امراض اور عصابی رجحانات سے بچا سکتے ہیں پس یہ ضروری اور لازمی ہے کہ بچوں کو تعاون اور مل جل کر کام کرنے کی تعلیم و تربیت دی جائے اور انھیں آزادی دی جائے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل جل کر مختلف کاموں اور کھیلوں کے ذریعے اپنے لئے جگہ پیدا کریں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا اور بچوں کو روکا جائے گا تو یہ ان کے لئے مضر اور خطرناک ثابت ہوگا۔

گھر میں بگڑا ہوا بچہ مدرسے اور جوانی میں بھی ناکامیاب ہوتا ہے۔

وہ بچہ جو گھر میں لاڈ کی وجہ خود بیں اور خود غرض ہوجاتا ہے وہ اپنی یہ بری عادتیں لئے ہوئے مدرسہ جاتا ہے اور مدرسہ کے ماحول میں خود کو اجنبی پاتا ہے۔ مدرسے کے سبقوں میں وہ اسی وقت تک دلچسپی لیتا ہے جب تک کہ استاد کی توجہ اور کرپا حاصل کرنے کی اس کو توقع رہتی ہے۔ وہ جماعت میں ان ہی باتوں کو غور سے سنتا ہے جو اس کے فائدے کی ہوتی ہیں۔ یہ بچہ جب سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کے سماجی احساسات اور جذبات اور زیادہ تکلیف دہ اور پُر آفت ہوجاتے ہیں۔ چونکہ شروع سے اس بچے کو خود اعتمادی کے ساتھ ذمہ دارانہ طور پر زندگی بسر کرنے کی عادت نہیں ڈالی گئی اس لئے سن بلوغ کو پہونچ کر بھی خود کو زندگی کی

کشمکش کے لئے تیار نہیں پاتا۔ ایسے بچے کو ملامت اور سرزنش نہ کرنی چاہیئے بلکہ اس کی مدد کرنی چاہیئے اس طرح سے کہ اس کی کمزوری اس کو بتا دینی چاہیئے۔ جب وہ اپنی کمزوری محسوس کرے گا تو اپنی اصلاح کی کوشش کریگا۔

ایک ایسے بچے سے جس نے کبھی جغرافیہ پڑھا ہی نہیں ہم توقع نہیں رکھتے کہ وہ جغرافیہ میں امتحان دے سکے گا اور کامیاب ہوگا اسی طرح اس بچے سے جس کو شروع سے تعاون کی تعلیم و تربیت نہ دی گئی ہو۔ ہمیں امید نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ ان مشاغل میں کامیاب ہوگا۔ جن میں تعاون اور امداد باہمی کی ضرورت ہے۔

زندگی اور تعاون

زندگی کا ہر مسئلہ تعاون اور امداد باہمی سے ہی حل ہو سکتا ہے۔ ہر کام کے انجام دینے کے وقت ہمیں سماج اور ماحول کا خیال اور لحاظ رکھنا چاہیئے اور اس کام کو اس طرح انجام دینا چاہیئے کہ وہ انسانی سماج کے لئے بھلائی کا باعث ہو۔ دنیا میں وہی زندگی کی سختیوں اور الجھنوں کا ہمت سے ڈٹ کر مقابلہ کرسکتا اور کامیاب ہوسکتا ہے جس نے زندگی کے معنی تعاون کرنا سمجھے ہوں اور جس کا نصب العین دوسروں کی خدمت کرنا ہو۔

اساتذہ۔ والدین اور ماہر نفسیات کا فرض۔

اگر اساتذہ۔ والدین اور ماہر نفسیات یہ بات سمجھ لیں کہ زندگی کے غلط معنی سمجھ لینے اور زندگی کا غلط مقصد قرار دینے سے کیا لغزشیں واقع ہوتی ہیں اور یہ لوگ خود بھی غلطی نہ کریں تو ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان بچوں کی جو سماجی رجحانات نہیں رکھتے اصلاح ہو جائے گی۔ بچے اپنی اندرونی فطری صلاحیتوں کو سدھار کر زندگی کے موقعوں سے اچھا فائدہ اٹھائیں گے۔ جب بچوں کو زندگی کے مشکلوں کا سامنا ہوگا تو یہ ان سے بچ کر نکل جانے یا جان بچانے یا دوسروں کی مدد کے طالب ہونے یا دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی ان تھک کوشش کرنے اور بالآخر تھک کر عاجز آکر مایوس ہو کر دوسروں سے بدلہ لینے اور یہ کہہ دینے کہ "یہ زندگی بے کار ہے اس میں ہمارے لئے کچھ بھی نہیں ہے" کے عوض خود اپنی ذات

سے زندگی کے مشکل مسئلوں کو حل کرنے کی لگاتار کوشش کریں گے اور کہیں گے کہ ”ہمیں خود اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہیے۔ یہ کام ہمارا ہے اور ہم ہی اسے انجام دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے افعال و اعمال کے مختار ہیں۔ اگر ہمیں کوئی نیا کام کرنا ہے یا کسی پرانے کام کو نئے ڈھنگ سے کرنا ہے تو یہ سب کسی مدد کے بغیر ہم کو خود کو کر لینا چاہیے۔“

دوسری فصل

نفس اور جسم

یہ مسئلہ کہ نفس جسم پر حکومت کرتا ہے یا جسم نفس پر حکمراں ہے۔ ہمیشہ معرض بحث میں رہا ہے۔ اس بحث میں فلسفہ داں بھی شریک ہو گئے بعض نے ایک رائے ظاہر کی تو بعض نے دوسری بعض نے خود کو تصوریتی کہا تو بعض نے اپنے کو مادہ پرست بتایا اور اس مسئلہ کے متعلق ہزاروں دلائل پیش کئے لیکن اس پر بھی مسئلہ جہاں کا وہیں رہا۔ ممکن ہے کہ انفرادی نفسیات سے اس مسئلہ کے تصفیے میں کوئی مدد ملے اس لئے کہ انفرادی نفسیات کا نفس اور جسم کے تفاعل سے تعلق ہے۔ انفرادی نفسیات میں جسم یا نفس میں سے کسی ایک کا علاج کرنا پڑتا ہے پس اگر ہمارا علاج غلط ہوگا تو ہم مریض کی اصلاح نہ کر سکیں گے۔ ہمارا نظریہ قطعاً تجربہ پر مبنی ہونا چاہیے اور انطباق کی کسوٹی پر پورا اترنا چاہیے۔ ہم نفس اور جسم کے باہمی تعلقات میں زندگی بسر کرتے ہیں اور زندگی کے حقائق ہر لحظہ ہمارے اختیار کردہ نقطہ نظر کی کڑی جانچ کرتے رہتے ہیں۔

انفرادی نفسیات کے نظریئے

انفرادی نفسیات نے جو نظریئے قایم کئے ہیں ان سے یہ مسئلہ بہت کچھ صاف ہوجاتا ہے۔ یہ بحث باقی ہی نہیں رہتی کہ نفس جسم پر حکمران ہے یا معاملہ اس کے برعکس ہے بلکہ ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ نفس اور جسم دونوں کے ذریعے انسانی زندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے لئے ان دونوں کا وجود لازمی ہے اور یہ کہ یہ ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

انسان کے لئے جسم اور نفس دونوں کی ضرورت کیوں ہے

انسان ایک حرکت کرنے والی ہستی ہے اس لئے اس کے لئے صرف جسم کی نشو ونما کافی نہیں ہے۔ درخت جو جڑ رکھتا ہے ایک جگہ ساکن ہوتا ہے حرکت نہیں کرسکتا اس لئے اگر کہا جائے کہ درخت مثل انسان کے نفس رکھتا ہے تو یہ بات بڑی حیرت اور تعجب کے ساتھ سنی جائے گی۔ اگر درخت میں واقعات اور خطرات کی پیش بندی یا پیش بینی کی صلاحیت ہو بھی تو اس کے لئے بیکار ثابت ہوگی مثلاً اگر درخت میں یہ غور کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہو کہ "کوئی میری طرف آرہا ہے ایک دقیقہ میں مجھے روند دے گا اور میں مردہ یا نیم جان ہوجاؤں گا" تو درخت کا یہ غور یہ خیال اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے گا اس کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کرسکتا۔

تمام حرکت کرنے والے ہستیاں پیش بینی کی صلاحیت رکھتی ہیں اور تصفیہ کرسکتی ہیں کہ انھیں کس جانب حرکت کرنی چاہئے اور اس بنا پر ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ سب نفس یا روح (آتما) رکھتی ہیں۔ شکسپیر کہتا ہے:-

"تو عقل و حواس رکھتا ہے ورنہ تو متحرک نہ ہوتا۔" (ہملیٹ ایکٹ ۳ سین ۴)

نفس کا عمل

کسی ذی روح کا اپنی حرکت کا رخ قرار دینے کی صلاحیت رکھنا نفس کا مرکزی اصول ہے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں تو پھر ہم آسانی سے سمجھ لینگے کہ کس طرح نفس جسم پر حکومت کرتا ہے۔

محض حرکتوں کا صادر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ حرکتیں کسی خاص مقصد سے ہونی چاہئیں۔ چونکہ نفس کا یہ کام ہے کہ حرکت کا رخ قایم کرئے حرکت کا مقصد قرار دے اس لیئے ہم کہتے ہیں کہ نفس جسم پر حکومت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی معلوم ہونا چاہئے کہ جسم بھی نفس پر اپنے اثرات رکھتا ہے مثلاً نفس کی ہدایت پر حرکت کرتا ہے نفس جسم کو اتنا ہی متحرک کر سکتا ہے جتنی کہ جسم میں حرکت کی صلاحیت اور قابلیت موجود ہو یا تربیت سے اس میں پیدا کی جائے مثلاً نفس اگر جسم کو حکم دے کہ چاند میں چلا جا تو جسم اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے گا۔ البتہ نفس اگر کسی بیرونی ذرائع سے جسم کو چاند تک پہونچنے کے قابل کر دے تو جسم اس کے اس حکم کی تعمیل کر لے گا اور اس کی اس خواہش کو پوری کر دے گا۔

انسانی حرکات اور ان کا مقصد

حرکت کرنے کی صلاحیت سب سے زیادہ انسان میں پائی جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جدھر چاہتے ادھر حرکت کرتے ہیں اور ان سے ہر قسم کی پیچیدہ حرکتیں واقع ہوئی ہیں یہی نہیں بلکہ انسان اپنی حرکتوں کے ذریعہ ماحول کو بھی متحرک کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں لہذا ہمارے خیال میں نفس انسانی پیش بینی اور پیش بندی کی صلاحیت سب سے زیادہ رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ خاص مقاصد اور اغراض کے ساتھ حرکت کرتا ہوا اپنے ماحول میں اپنے لئے ایک اچھا مقام پیدا کر لے۔

ہر انسان کے افعال میں جو معمولی سے معمولی مقصد کی انجام دہی کے لئے سرزد ہوتے ہیں۔ ہم حرکت پاتے ہیں۔ ہماری جتنی کوششیں ہوتی ہیں ان کا رخ صرف ایک ہی ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہم امن اور سلامتی حاصل کریں۔ ہماری مشکلات دور ہو جائیں۔ ہم اپنے ماحول میں کامیاب اور سلامت رہیں۔ جب کہ ہماری حرکات اور کوششوں کا مقصد یہ ہوتا ہے تو پھر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی حرکات اور افعال میں ربط وضبط اور اتحاد قائم کریں نفس کی ایسی تربیت کریں کہ وہ اپنے مقصد کو پا سکے اور مطلوب کو حاصل کر سکے۔

نفس اور جسم کی متفقہ کوشش نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔

جسم کی حالت نفس سے مختلف نہیں۔ مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ نفس کو کام کرنا پڑتا ہے ویسا ہی جسم کو بھی کام کرنا اور اس میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ نفس اور جسم کی متحدہ کوشش سے انسان دنیا میں اپنے مقاصد حاصل کرتے اور اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً جسم کے کسی حصے کا چمڑا اجل جائے تو تمام جسم متفقہ طور پر اس کو درست کرنے اور اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں نفس کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ جسم کی نشو و نما کا بار صرف جسم پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نفس بھی جسم کی نشو و نما میں اور اس کی اندرونی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو ابھارنے میں مدد دیتا ہے۔ اصول حفظان صحت کی پابندی۔ ورزش وغیرہ کے فوائد کو سب مانتے ہیں۔ اور حقیقت میں یہی امدادیں ہیں جو نفس کی جانب سے جسم کو پہونچائی جاتی ہیں اور جو انسان کو کامیابی کے ساتھ منزل مقصود کو پہونچاتی ہیں۔

نفس اور جسم کا یہ میل ملاپ یہ تعاون مہد سے لحد تک مسلسل قائم رہتا ہے۔ نفس اور جسم متحدہ طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ نفس کی مثال ایک موٹر کی ہے جو جسم کی ممکنہ قوتوں کو کھینچ لاتا ہے اور جسم کو مدد دیتا ہے کہ وہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے زندگی کے سختیوں اور ہر الجھنوں پر قابو پالے۔ کامیابی حاصل کرلے۔ جب کوئی شخص حرکت کرتا ہے تو اس حرکت کے کوئی معنی ہوتے ہیں کوئی مقصد ہوتا ہے مثلاً جب وہ اپنی آنکھوں۔ زبان۔ چہرے کے عضلات کو متحرک کرتا ہے تو اس وقت اس کے چہرے سے ایک خاص کیفیت ظاہر ہوتی ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے کچھ غرض و غایت ظاہر کرتی ہے۔ وہ نفس ہی ہوتا ہے جو چہرے کو اس قابل کرتا ہے کہ اپنے مختلف اعضا کو حرکت میں لاکر ایک خاص مقصد اور مطلب کا اظہار کرے۔

نفسیات کی تعریف

اس تفصیلی بحث کے بعد ہم اب سمجھ سکتے ہیں کہ علم نفسیات کس کو کہتے ہیں۔ نفسیات وہ علم ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم کسی شخص کے چہرے اور اس کے حرکات و سکنات سے اس کے اندرونی جذبات اور خیالات کا

پتہ چلاتے ہیں اور اس کے مقاصد دلی معلوم کرسکتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ اس نے زندگی کے کیا معنی سمجھ رکھے ہیں۔ زندگی کا نصب العین کیا قرار دے لیا ہے اور پھر اس کے نصب العین کا دوسروں کے نصب العین سے مقابلہ کرتے ہیں۔

نفس کی ہدایت ضروری ہے۔

اگر کسی کا نصب العین زندگی 'حفاظتِ ذاتی' ہو تو اس کے نفس کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے جسم کی اس بارے میں صحیح رہنمائی کرے۔ جسم کو ہدایت کرے کہ "اس طرف جا اس میں تیری خیریت ہے"۔ اگر اس وقت نفس کی صحیح رہنمائی اور ہدایت جسم کو نہ ہوگی تو جسم بلا کسی مقصد بلا کسی نصب العین (یعنی حفاظت ذاتی) کے حرکت کریگا تو اپنی حفاظت کے عوض خود کو خطرے میں ڈال دے گا۔

نفسیاتی غلطی

اگر تم دیکھتے ہو کہ کوئی خطرناک چیز تمہاری طرف آرہی ہے تو تم نفس کی ہدایت پر فوراً حرکت کرتے ہو۔ بھاگنے لگتے ہو۔ تمہاری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تم خطرہ سے دور ہو جاؤ۔ خطرے کے موقعوں پر عام طور پر نفس کی ہدایت صحیح اور درست ہوتی ہے اور تم خطرے کی دوسری جانب یا رخ پر حرکت کرتے ہو لیکن بعض اوقات نفس غلطی کرتا اور غلط رہنمائی کر دیتا ہے اور تم غلط راستہ اختیار کرکے خطرے کی جانب دوڑ پڑتے ہو اس کو نفسیاتی غلطی کہتے ہیں۔ زندگی میں انسانوں کا اپنے لئے زندگی کے غلط راستوں کا انتخاب کرلینا ہی نفسیاتی غلطی ہے۔

حفاظت ذاتی ہر انسان کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور ہر انسان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسے صحیح راستے اختیار کرے کہ وہ محفوظ رہ سکے لیکن بعض لوگ غلط راستے اختیار کرتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔

چوری کا مسئلہ

اگر ہم کسی شخص کے کسی عمل یا فعل کے معنی اور مطلب نہ سمجھ سکیں کہ کیوں اس نے ایسا کیا۔ کیوں اس سے یہ فعل سرزد ہوا تو ہمیں چاہئے کہ اس کی حرکات وسکنات پر غور کریں۔ مثلاً چوری کے مسئلہ کو لیجئے اور غور کیجئے کہ آخر چور کیوں چوری کرتا ہے۔ کسی شخص کا کسی دوسرے کی چیز کو اس کی بلا اجازت اپنے قبضہ میں لے لینا

ہے۔ اگر چور کی اس حرکت پر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ چوری سے اس کا مقصد یہی تھا کہ اپنا مال بڑھائے۔ اپنی ملکیت میں اضافہ کر کے اپنے کو محفوظ اور قوی کرے۔ دوسرے الفاظ میں چور خود کو مفلس اور محروم تصور کرتا تھا اس لئے اس نے یہ حرکت یعنی چوری کی۔ چور کی چوری کرنے کا مقصد یا وجہ معلوم کرنے کے بعد ہم کو غور کرنا چاہئے کہ اس کے حالات اور واقعات زندگی کیا ہیں۔ آخر وہ خود کو کیوں مفلس و محروم سمجھتا ہے۔ اگر وہ واقعتاً مفلس اور نادار ہے تو مال و دولت حاصل کرنے کے لئے اس نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے یا غلط ہے۔ ہم چور کے نصب العین یعنی دھن دولت حاصل کرنے کے متعلق کوئی اصولی اعتراض نہیں کرسکتے اس لئے کہ ہر نادار اور مفلس شخص چاہتا ہے کہ مال اور دولت کے ذریعے اپنی اور اپنے متعلقین کی حالت درست کرے لیکن ہم اس کے (یعنی چور کے) طریقہ کار پر جو اس نے حصول مقصد (یعنی حصول دولت) کے لئے اختیار کیا اعتراض کرسکتے اور کہہ سکتے ہیں کہ اس نے غلط راستہ یا غلط طریقہ اختیار کیا۔

نفس اور جسم

انسانی نسلوں نے اپنے ماحول میں جو ادل بدل کیا ہے اسی کا نام کلچر (تہذیب) ہے۔ ہمارا کلچر نتیجہ ہے ان ان گنت حرکتوں کا جو انسانوں کے نفوس نے جسموں کے لئے تجویز کئے۔ ہمارے جتنے مشاغل ہوتے ہیں وہ نفس کے زیر ہدایت ہوتے ہیں ہمارے جسموں کی نشو و نما نفس کی مدد اور رہنمائی سے ہوتی ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کی ہر حرکت میں نفس کا کوئی مقصد پنہاں ہوتا ہے۔ ان تمام امور کے باوجود یہ سمجھ لینا بھی درست نہ ہوگا کہ جو کچھ ہے وہ نفس ہی ہے جسم کوئی چیز نہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ دنیوی مشکلات کو حل کرنے کے لئے جسم کا صحیح اور تندرست حالت میں رہنا بھی لازمی اور ضروری ہے جسم کی حفاظت کرنے اور اس کو بیماری۔ موت۔ صدموں۔ حادثوں سے بچانے اور اپنے مختلف اعضائے نقصان دہ کام نہ لینے کے متعلق نفس ہمیشہ انسان کو ہدایت

دیتا اور رہبری کرتا رہتا ہے۔ نفس کے ہی وجہ ہمیں خوشی اور غم کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ہم مختلف وہمی خیالات پیدا کر لیتے اور اپنی حالت کو اچھی یا بری قرار دے لیتے ہیں۔ جب کوئی معاملہ یا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ہم اپنے تصورات اور توہمات کے مطابق اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہمی خیالات ایک قسم کی انسانی پیش بندیاں ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ انسانی جذبات اور احساسات میں وہمی خیالات ہیجان پیدا کر دیتے ہیں اور اس ہیجانی حالت میں جسم کام کرتا ہے۔ کسی شخص کے جذبات کا غور سے معائنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس نے زندگی کے کیا معنی سمجھے ہیں اور اس کی زندگی کا نصب العین یا مقصد حیات کیا ہے کہ جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ کوشاں ہے۔ انسان کے احساسات۔ تاثرات اور جذبات اگرچہ اس کے جسم پر قابو رکھتے ہیں اس کو متاثر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی وہ اس کے جسم سے بے نیاز بھی ہوتے ہیں اور مقدم طور پر اس کے اختیار کردہ طرز زندگی کے ہر وقت تابع رہتے ہیں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی فرد اپنے اختیار کئے ہوئے طرز زندگی کا ہی تابع نہیں ہوتا۔ اس کی ذہنی کیفیات بلا امداد غیرے کسی قسم کے افعال و حرکات کو رو بہ عمل نہیں لا سکتیں۔ ہر فعل کے لئے احساسات کی مدد ضروری ہے۔

انفرادی نفسیات کا جدید نظریہ

انفرادی نفسیات کا جدید نظریہ یہ ہے کہ انسانی جذبات اور خیالات کبھی اس کے طرز زندگی کے متضاد نہیں ہوتے۔ انسان زندگی کا جو بھی مقصد یا نصب العین قرار دے لے اس کے جذبات اور خیالات اس کے حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ انسانی جذبات و خیالات کا تعلق عضویات یا حیاتیات سے نہیں ہے۔ جذبات و خیالات کا وجود ہم کسی کیمیاوی نظریئے یا تجربے سے نہیں بتا سکتے۔ انفرادی نفسیات میں اگرچہ ہم عضویاتی عمل کے وجود کو مانتے ہیں لیکن اس کا تعلق زیادہ تر عضویاتی نصب العین یا منزل مقصود سے ہوتا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ پریشانی اور بے چینی میں انسان کے مثار کی اعصاب متاثر ہوتے ہیں یا نہیں ہم جو دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آخر

انسان کو یہ پریشانی اور یہ اضطراب کیوں پیدا ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

بعض حکماء کا خیال ہے کہ جنسی خواہشات کے دبا دینے۔ یا بچپن کے تلخ تجربوں سے نفس میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بچہ جو ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ رہنے اور وقتاً فوقتاً اس کی مدد حاصل کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ "اضطراب" اور "اظہار پریشانی" کو اپنی ماں کو اپنے قابو میں رکھنے کا ذریعہ اور آلہ بناتا ہے۔ (یعنی اضطراب اور پریشانی کا اظہار کرکے ماں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرالیتا ہے)۔

غصہ کیوں آتا ہے۔

غصے کی حالت میں انسان کی جو جسمانی حالت بنائی جاتی ہے۔ اس سے ہمیں تشفی نہیں ہوتی ہمارا تجربہ تو ہم کو یہ بتاتا ہے کہ 'غصہ' کسی فرد پر یا کسی موقع پر قابو پالینے یا غالب آجانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

جذبات کا تعلق طرزِ زندگی سے

ہم یہ مان لینے تیار ہیں کہ انسان کا ہر جسمانی فعل یا دماغی مظاہرہ مبنی ہوتا ہے۔ ان چیزوں یا اس مواد پر جو اس نے اسلاف سے بطور ورثہ پایا ہے لیکن ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر فرد کے جذبات اتنی ہی حد تک نشو و نما پاتے ہیں جتنا کہ اسے اپنا نصب العین زندگی حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہے۔ ہر انسان کی فکر اور پریشانی اس کی ہمت اس کی خوشی اور غم منحصر ہوتا ہے اس کے اس طرزِ زندگی پر جو اس نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہو۔ مثلاً ایک ایسا شخص جو سمجھتا ہو کہ وہ مغموم و محزون رہ کر یا خود کو مغموم و محزون بتا کر دوسروں پر غالب آجا سکتا اور اپنا نصب العین حاصل کر سکتا ہے تو وہ کبھی خوش اور بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ روتی صورت بنائے رہے گا وہ اسی وقت خوش رہے گا جب وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو۔ ایک ایسا شخص جو مرض گذر ترسی (یعنی مجمعوں میں جانے یا کھلے میدان میں ٹھیرنے سے ڈرنا) میں مبتلا ہو وہ جب اپنے گھر پہونچ جاتا یا اس کو کسی پر چھا جانے اور حکومت کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو اس کی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔

وہ سب لوگ جو فساد اعصاب کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں اپنی زندگی میں

ہمیشہ ایسے موقعوں سے جہاں انھیں کامیابی کی توقع نہیں رہتی بھاگتے اور بچ کر نکل جاتے ہیں۔

کسی شخص کا جیسا کہ طرز زندگی قائم ہو جاتا ہے ویسا ہی اس کی جذباتی کیفیت بھی ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے مثلاً ایک بزدل شخص اپنے سے کم زور لوگوں کے مقابلہ میں اکڑتا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا رہتا ہے اور اگر اس کو کوئی حامی اور مددگار مل جائے تو اپنی بہادری دکھاتا ہے لیکن حقیقتاً وہ بزدل ہی ہوتا ہے۔ اس کی بزدلی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے اپنے کمرے کے دروازہ کو تین قفل ڈالتا۔ مزید حفاظت کے لئے کتے پالتا۔ چور گھنٹی۔ اگھر میں لگاتا ہے اور پھر بھی اپنی دلیری اور بہادری کا ڈنکا بجاتا اور اعلان کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی اس کی بزدلی اور پریشانی اور فکر کو ثابت بھی نہ کر سکے تو ان تدبیروں سے جو اپنی حفاظت کے لئے اتنی زحمت اٹھا کر اس نے اختیار کی ہیں اس کی بزدلی اور ڈرپوک پن ثابت ہو جاتا ہے۔

طرز زندگی اور جنسی معاملات

عشق و محبت کے واقعات اور جنسی معاملات پر غور کرنے سے بھی ہمیں اپنے قائم کردہ نظریے کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً کسی شخص میں جنسی جذبات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ وہ جنسی فعل کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ اس وقت اپنے دل و دماغ سے دوسرے پریشان کن خیالات اور جذبات کو بالکلیہ دور کر کے اپنی پوری توجہ ایک مقصد کے حاصل کرنے پر لگا دیتا ہے اور جنسی جذبات کو ابھارتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ دوسرے خیالات جذبات اور افکار کو دل و دماغ سے دور کر کے اپنی توجہ اور جنسی فعل کی انجام دہی پر نہ لگائے گا تو اس کے جنسی جذبات کبھی ہیجان میں نہ آئیں گے اور وہ جنسی فعل پر قادر نہ ہو گا۔ نامردی۔ سرعت انزال اور سرد مہری (یعنی مرد یا عورت میں شہوت کا نہ ہونا) کی بھی یہی وجہ ہوتی ہے۔ اس قسم کی غیر فطری اور غیر معمولی خرابیاں کسی شخص میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کے دل میں 'برتری' کا غلط خیال پیدا ہو جاتا اور راسخ ہو جاتا ہے اور اس کے وجہ وہ غلط طریقہ زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کے لوگ در عوض اپنی بری عادت چھوڑ دینے کے دوسروں سے رعایت اور

مزاج داری کی توقع رکھتے ہیں۔ ان میں سماجی جذبات مثلاً ہمت اور امید پرستی وغیرہ کا فقدان ہوتا ہے۔

میرا ایک مریض جود الدین کا دوسرا لڑکا تھا اس خبط میں مبتلا ہو گیا کہ وہ گنہگار اور مجرم ہے۔ اس کا باپ اور بھائی ہمیشہ اسے سمجھاتے اور اس کے ذہن نشین کرتے تھے کہ وہ ایک ایمان دار لڑکا ہے۔ جب یہ سات سال کا تھا تو ایک روز استاد نے اس کو ہوم ورک دیا اور گھر میں اس کے بھائی نے ہوم ورک کر دیا۔ لڑکا دوسرے دن ہوم ورک مدرسہ لے گیا اور استاد سے کہا کہ خود اس نے ہوم ورک کیا ہے۔ کہنے کو تو ایسا کہہ دیا لیکن یہ خیال کہ جھوٹ کہا تین سال تک اس کو ستاتا رہا یہاں تک ایک دن اسی استاد کے پاس جا کر اس نے اپنے جھوٹ کہنے کا اقرار کیا۔ استاد نے یہ سن کر کچھ نہ کہا صرف ہنس دیا۔ پھر لڑکا روتا ہوا گھر جا کر اپنے باپ کے سامنے قصور کا اقرار کیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ کامیاب رہا۔ باپ کو اپنے لڑکے کی راست گوئی بہت پسند آئی اور اس نے اس کی تعریف اور دل جوئی کی۔ اگرچہ کہ باپ نے اس کو قصور اور خطا سے بری قرار دیا لیکن اس پر بھی غلطی اور قصور کا خیال اس کو اداس رکھتا تھا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لڑکے کا ایک معمولی واقعے یا قصور کو اس قدر اہمیت دے کر خود کو اس قدر ملامت کرنے کا دلی مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ دوسروں پر اپنا تدیّن اور راست گوئی ظاہر اور ثابت کرنا اور اس طرح برتری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر والے چونکہ سب دیانت دار اور راست گو تھے اس لئے ان صفات میں وہ خود کو سب سے افضل اور برتر بتانا چاہتا تھا۔ یہ لڑکا اپنے بڑے بھائی سے تعلیم اور سماجی خوبیوں میں کم تھا اس لئے اپنے بھائی پر فوقیت حاصل کرنے کا اپنا یہ خودساختہ اور انوکھا طریقہ اس نے ایجاد کر لیا۔ آگے چل کر اس نے دوسرے بھی اسباب اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے پیدا کر لئے دست بازی میں بڑھ گیا اور تعلیمی معاملات میں استادوں کو دھوکا دینے اور غلط بیانی کرنے لگا۔ اس کے خود کو ملامت کرنے کے جذبات ہمیشہ مدرسہ کے امتحان کے قبل شدت

اختیار کرتے تھے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس کی مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چونکہ فطرۃً وہ حساس تھا اس لئے اپنی ہر ناکامی اور ناکامیابی کو اپنے ملامتی جذبات پر محول کر کے خود کو ذمہ داری سے بری قرار دے لیتا تھا۔ جب اس نوجوان نے یونیورسٹی چھوڑی تو کسی صنعتی کام میں لگ گیا لیکن اب اس کا خبط اس قدر بڑھ گیا کہ کام کاج چھوڑ کر دن رات دعائیں مانگنے میں مصروف ہو گیا کہ خدا اس کے گناہ معاف کر دے بتدریج اس کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ اسے پاگل خانہ بھیج دیا گیا۔ وہاں پہلے تو اسے لاعلاج بتایا گیا لیکن چند روز علاج کرنے کے بعد اس کی حالت درست ہو گئی او پاگل خانے سے گھر آ گیا۔ آتے ہوئے پاگل خانے کے عہدہ داروں سے وعدہ لیا کہ اگر پھر اس کی طبیعت بگڑ جائے تو اسے شریک کر لینگے۔ اب اس نے اپنا شغل بدل دیا ا فنون لطیفہ کی تعلیم پانا شروع کی۔ جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو ایک عام تعطیل کے دن گرجا گیا اور ایک بڑے مجمع کے سامنے خود کو زمین پر گرا دیا اور چلانے لگا "میں انسانوں میں ایک بدترین گنہگار انسان ہوں"۔ اس حرکت سے اس نے لوگوں کی توجہ اپنی ایمانداری کی طرف مبذول کرائی۔ اس کو پھر پاگل خانہ بھیج دیا گیا اور و کچھ عرصہ کے بعد گھر آیا۔ ایک روز دوپہر کے کھانے کے لئے میز پر برہنہ چلا آیا یہ ایک قوی اور توانا نوجوان تھا اور اس معاملے میں اپنے بھائی اور دوسروں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ یہ شخص اپنے قصور اور خطا کا ہمیشہ اسی لئے اقرار کیا کرتا تھا کہ لوگوں اس کی غیر معمولی ایمان داری اور پاکبازی ظاہر ہو اور وہ دوسروں سے بہتر اور افضل سمجھا جائے۔ اس کا نصب العین زندگی "حصول برتری" تھا۔ اس کی تمام کوششیں زندگی کے بیکار اور فضول کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا تعلیم سے بھاگنا او امتحانات سے گریز کرنا اس کی نااہلیت اور بزدلی کی دلیلیں تھیں۔ اس کا اعصا مرض اور خبط خود ساختہ چیزیں تھیں جن سے وہ اس وقت کام لیتا تھا جب کہ ا کامیابی کی امید نہ ہوتی تھی۔ اس کا گرجے میں زمین پر گر کر چلانا اور کھانے کے میز برہنہ آنا ثابت کرتا ہے کہ ان مذموم حرکات کے ذریعہ وہ اپنی "برتری" ظاہر کرتا

تھا۔ چونکہ اس کا ایک خاص 'طرز زندگی' قایم ہو گیا اس کے جذبات بھی اس طرز زندگی کے تابع ہو گئے اور یہ رنگ دکھلانے لگے۔

انسان کا طرز زندگی پانچویں سال میں قائم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہر فرد کے نفس اور جسم کا تعلق اور باہمی اتحاد اس کی عمر کے پہلے چوتھے یا پانچویں سال میں قائم ہوتا ہے۔ عمر کے اس ابتدائی زمانہ میں وہ اپنے موروثہ مواد اور ماحول کے اثرات کو اپنے لئے حصول برتری کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ پانچویں سال کے ختم پر اس کی ایک 'شخصیت' معین ہو جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں یعنی زندگی کے کیا معنی ہیں مقصد حیات کیا ہے۔ اس کا خود نصب العین زندگی کیا ہے اور کیوں کر حاصل کیا جا سکتا ہے اسے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک جذباتی مزاج بن جاتا ہے اور اس کا ایک 'طرز زندگی' قائم ہو جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کی زندگی بری ہو تو وہ اسے اچھی کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اگر ابتدائی زمانہ یعنی زمانہ تعین شخصیت کے وقت اس کا 'طرز زندگی' غلط قائم ہو گیا ہو تو اس 'طرز' کو ترک کرے اور بالکلیہ بدل دے۔ پہلے چونکہ اس نے زندگی کا صحیح مقصد نہیں سمجھا اس لئے اس کا 'طرز زندگی' غلط قائم ہو گیا اب اگر وہ زندگی کا صحیح مقصد سمجھ لے کر اس مقصد کے حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جائے تو اس کا طرز زندگی بھی صحیح اور درست ہو جائے گا۔ اور اس کی زندگی اچھی ہو جائے گی۔

ہر شخص اپنے اعضاء کے ذریعہ اپنے ماحول سے تعلق پیدا کرتا اور ارتسامات حاصل کرتا ہے۔ پس جس طریقہ اور طور سے وہ اپنے جسم کی تربیت کرتا ہے اس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماحول سے کس قسم کے ارتسامات حاصل کر رہا اور تجربہ حاصل کر رہا ہے اور انھیں کس طرح کام میں لائے گا۔ اگر ہم غور کر کے معلوم کر لیں کہ وہ کس طرح دیکھتا اور سنتا ہے۔ کون چیزیں اس کو متوجہ کر لیتی ہیں تو ہم اس شخص سے بہت کچھ واقف ہو جائیں گے اور معلوم کر لیں گے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کے اٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے کے طرز کو اس قدر

اہمیت دی جاتی ہے۔ ان سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعضاء جسمانی کو کس طرح تربیت دے رہا ہے اور ان کے ذریعے اپنے ماحول سے کس طرح ارتسامات حاصل کر رہا ہے۔ جسمانی پوزیشن ہمیشہ 'معنی' کے تابع ہوتے ہیں (یعنی کسی شخص کے جسمانی پوزیشن اس کے اندرونی جذبات اور خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں)۔

نفسیات کی تعریف

ہم نے علم نفسیات کی اوپر جو تعریف کی تھی اس میں اب اضافہ کر سکتے اور کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات وہ علم ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے اعضاء جسمانی کے ذریعہ جو ارتسامات حاصل کرتا ہے ان سے وہ کیا کام لیتا ہے اور کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی علم نفسیات کے ذریعے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی نفسیاتی حالت ایک دوسرے سے بہت جدا ہوتی ہے۔

جسم اور ماحول

وہ جسم جو اپنے ماحول سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں رکھتا وہ ماحول کے مطالبات کو پورا نہیں کر سکتا اور ایسا جسم اپنے نفس کے لئے وبال جان ہو جاتا ہے۔

ناقص اعضاء کا اثر زندگی پر

یہی وجہ ہے کہ جن بچوں کے اعضاء جسمانی ناقص ہوتے ہیں وہ ان کی نفسیاتی نشو و نما میں مشکلات پیدا کرتے اور مانع ہوتے ہیں۔ ان بچوں کے نفوس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنے جسموں کو اس طرح متحرک کریں یا ان سے اس طرح کام لیں کہ اپنا مقصد یعنی 'برتری' حاصل کر سکیں۔ ان بچوں کو اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے بہ نسبت دوسروں کے اپنے نفوس پر زیادہ بار ڈالنا پڑتا اور نفسیاتی توجہ سے بہت زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے نفوس تھکے ماندے خود غرض اور اپنے آپ میں محو ہو جاتے ہیں۔ ناقص اعضاء رکھنے والا بچہ چونکہ ہمیشہ اپنی جسمانی خرابی پر غور کرتا رہتا اور ہمیشہ اسی خیال میں محو رہتا ہے اس لئے اپنے سوائے دوسرے امور اور مسائل پر دھیان نہیں دے سکتا۔ اس کا تمام وقت اپنی حالت پر غور کرنے اور سوچتے رہنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے ماحول میں دلچسپی لینے کے لئے نہ تو وقت پاتا اور نہ شوق رکھتا ہے جس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ اس کے سماجی جذبات خاطرخواہ نشو و نما نہیں پاتے اور دوسروں سے مل جل کر متحدہ طور پر کام کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔

ناقص اعضاء اگرچہ انسان کی ترقی میں سنگ راہ ثابت ہوتے اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں لیکن یہ انسان کو بالکل ناکارہ نہیں کر سکتے۔ اگر کسی شخص کے اعضاء کم زور اور ناقص ہوں لیکن اس کا نفس صحیح ہو اور اس طرح تربیت پا جائے کہ مشکلات کو عبور کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جائے تو یہ شخص اپنی کوششوں اور مشاغل میں ویسا ہی کامیاب ہوگا جیسا کہ ایک صحیح اعضاء رکھنے والا انسان کامیاب ہوتا ہے۔ دیکھا گیا کہ اکثر ناقص اور کم زور اعضاء رکھنے والے بچے باوجود اپنی اس کمزوری کے صحیح اور تندرست بچوں سے زیادہ نمایاں کام انجام دیتے اور زندگی میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کا جسمانی نقص اور کمزوری ان کے لئے محرک ثابت ہوتی ہے اور انھیں ترقی کے راستے پر لگا دیتی ہے۔ مثلاً ایک لڑکے پر جس کی آنکھیں خراب ہوں زیادہ بار پڑتا ہے لیکن وہ اپنی کمزوری بصارت کو محسوس کرتے ہوئے ہر چیز کو خوب غور و خوض کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کرتا اور اشیاء ماحول پر خاص دھیان دیتا ہے۔ مختلف چیزوں کے رنگ اور روپ معلوم کرنے میں خاص دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہ نسبت صحیح و تندرست بچوں کے جنھیں اس قسم کی خاص کوشش اور توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی زیادہ تجربہ حاصل کر لیتا ہے پس ظاہر ہوا کہ ناقص اعضاء یا جسمانی عیب انسان کے لئے بعض وقت مفید اور نفع بخش ثابت ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ نفس میں مشکلات پر عبور کرنے اور رکاوٹوں پر غالب آجانے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو۔

مشہور ہے کہ اکثر ماہر مصور اور نقاش ضعف بصارت رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنے نفوس کی تربیت کی اور اپنے اس جسمانی نقص پر غلبہ حاصل کیا اور اپنی کمزور آنکھوں سے ایسا بہترین کام لیا جو اچھی آنکھیں رکھنے والے نہ لے سکے۔ یہی چیز الٹے ہاتھ سے کام کرنے والے بچوں میں ہم کو نظر آتی ہے۔ گھر یا مدرسہ میں کوشش کی جاتی

ہے کہ انھیں سیدھے ناقص اور کمزور ہاتھ سے لکھنا اور کام کرنا سکھایا جائے لیکن کامیابی نہیں ہوتی اور فرض کرلیا جاتا ہے کہ یہ بچے لکھنے اور ڈرائنگ کرنے اور دستکاری کے قابل نہیں ہیں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر ان بچوں کے نفوس کو اس طرح کی تربیت دی جائے کہ وہ اس کمزوری پر غالب آجائیں تو یقین ہے کہ یہ بچے اپنے ناقص اور کمزور ہاتھوں سے مصوری اور نقاشی کے بہترین نمونے پیش کریں گے چنانچہ دیکھا گیا کہ بعض الٹے ہاتھ سے کام کرنے والے بچے جب اپنے سیدھے ہاتھ استعمال کرنے لگے تو بہ نسبت صحیح اور تندرست بچوں کے بہتر خطاط ثابت ہوئے اور مصوری۔ ڈرائنگ۔ دستکاری میں اعلیٰ درجے کا کمال حاصل کیا۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ ان بچوں نے اپنے نفوس کی تربیت کرکے ان سے صحیح طریقۂ کار معلوم کیا اور پھر شوق دلچسپی اور محنت سے خوب مشق کیا اور اس طرح ایک ناموافق صورت کو اپنے موافق اور مفید بنا لیا۔

معذور بچے زندگی میں کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں

صرف وہی بچہ اپنے نقائص جسمانی کے مقابلے میں کامیاب ہوسکتا ہے جس نے اپنے نفس کو ایسی تربیت دی ہو کہ اس کا نفس اپنے پورے ماحول سے دلچسپی رکھے اس میں حصہ لے۔ یہ بچہ خود غرض نہ ہو اور اپنے آپ میں محو نہ رہے۔

اگر بچے صرف اپنے نقائص جسمانی اور کمزوریوں کے دور کرنے کی فکر میں لگے رہیں گے تو ہمیشہ پھسڈی رہیں گے ایسے بچے اسی وقت ہمت اور امید کے ساتھ کام لے سکیں گے جب کہ وہ اپنے نقائص پر غور کرتے رہنے اور اس کی فکر میں پڑے رہنے کے عوض اپنے لئے کوئی "مقصد زندگی" قرار دے لیں اور اپنے جسمانی نقائص کے خیال اور فکر سے مقصد زندگی کے حاصل کرنے کو زیادہ اہم سمجھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ بچے کس چیز میں اور کس طرح دلچسپی پیدا کرتے ہیں اور نصب العین یا مقصد زندگی کیا قرار دیتے ہیں؟ اگر بچے کسی ایسی چیز سے دلچسپی پیدا کرلیتے ہیں جس کا تعلق صرف انھیں سے نہ ہو بلکہ وہ ایک خارجی شئی ہو تو وہ اس کے حاصل کرنے میں خود کو منہمک

کر لیتے اور اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انھیں جو بھی مشکلات پیش آتی ہیں انھیں وہ معمولی سمجھ کر ان پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر بچے صرف اپنے نقائص جسمانی اور دوسری کمزوریوں کی فکر میں رہتے اور ان کو رفع کرنے کی کشمکش میں پڑ جاتے ہیں تو دنیا میں ترقی نہیں کرتے اور کامیاب نہیں ہوتے۔ اگر کسی شخص کا سیدھا ہاتھ کمزور ہو تو رات دن اس کمزوری کا خیال کرتے رہتے اور یہ کہتے رہنے سے اے کاش میرا ہاتھ قوی اور تندرست ہوتا ہاتھ نہ تو قوی ہو سکتا ہے اور نہ کار آمد و مشاق ہو سکتا ہے۔ ہاتھ جب ہی قوی اور کار آمد ہو سکتا ہے جبکہ اس سے عملی کام لئے جائیں اور ان کی خوب مشق کی جائے اور ہاتھ سے کام لینے اور مشق کرنے کا شوق اور ذوق ہاتھ کی کمزوری اور نقص کے خیال پر ہمیشہ حاوی اور غالب رہے۔ مختصر یہ کہ اگر کوئی ناقص اعضاء رکھنے والا بچہ اپنے تمام قابلیتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لا کر مشکلات پر عبور کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ (اپنی فکر چھوڑ کر) اپنا ایک نصب العین قرار دے اور اس کے حصول کے لئے ہاتھ پیر مارے۔ یہ نصب العین ایسا ہو کہ اس کو (یعنی بچے کو) حقائق زندگی اور دوسرے انسانوں سے دلچسپی لینے اور لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا موقع ملے۔

جب میں بعض خاندانوں کے ان لوگوں کا جو گردوں کی بیماریوں میں مبتلا تھے علاج کر رہا تھا تو دوران علاج میں مجھے اس کی اچھی مثالیں ملیں کہ موروثی مواد کیا ہوتا ہے اور یہ زندگی پر کیا اثر ڈالتا ہے اور اس سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

بچے کیوں کپڑوں اور بستر میں پیشاب کر لیتے ہیں

مجھے معلوم ہوا کہ ان خاندانوں کے اکثر بچے بستر اور کپڑوں میں پیشاب کر لینے کے عادی تھے۔ طبی امتحان سے معلوم ہوا کہ ان میں اعضاء کی کمزوری موجود ہے ان کے گردے یا مثانے کمزور ہیں لیکن یہ اعضاء کی کمزوری ہی صرف پیشاب نکل جانے کی وجہ قرار نہیں دی جا سکتی اس لئے کہ بچہ اپنے اعضاء کے قابو میں اور ان کا محکوم نہیں رہتا بلکہ وہ ان سے جیسا چاہتا ویسا کام لیتا ہے مثلاً بعض بچے رات کو بستر میں پیشاب کر لیتے ہیں لیکن دن میں

ایسا نہیں کرتے بعض وقت ماحول کے یا ماں باپ کا برتاؤ بدل جانے سے بچے یہ بری عادت چھوڑ دیتے ہیں۔ سوائے ان بچوں کے جو کمزور طبیعت اور دماغ رکھتے ہیں دوسرے سب بچے جو اس عادت میں مبتلا رہتے ہیں کوشش سے اس عادت کو چھوڑ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے عضو کی کمزوری کا خیال ہمیشہ اپنے پیش نظر نہ رکھیں اور اس کو عذر اور حیلہ کے طور پر پیش نہ کریں۔

ہوتا یہ ہے کہ جو بچے پیشاب کر لینے کی شکایت میں مبتلا رہتے ہیں ان کی یہ عادت چھڑانے کے عوض ان کے لئے ایسے اسباب فراہم کر دیے جاتے ہیں کہ وہ اس کو جاری رکھیں۔ ایک سمجھدار اور ماہر ماں اپنے بچے کو ایسی تربیت دے سکتی ہے کہ یہ بری عادت چھوڑ دے۔ لیکن اگر ماں سمجھدار نہ ہو تو بچے کی یہ کمزوری باقی رہ جاتی ہے۔ ان خاندانوں میں جن کے افراد گردہ اور مثانے کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں بچوں کے پیشاب کر لینے کی عادت کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ بچوں کی مائیں جان توڑ کوشش کرتی ہیں کہ اپنے بچوں کی یہ عادت چھوٹ جائے لیکن یہ ان کی غلطی ہے اس لئے کہ جب بچہ دیکھتا ہے کہ اس چیز پر زور دیا جا رہا تو پھر وہ بھی اس کی شدت سے مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بچے کو اچھا موقع مل جاتا ہے کہ والدین کی اصلاحی کوشش کی مخالفت کرے۔ اس کا جو بھی علاج کیا جاتا ہے وہ ضد سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور تصور کر لیتا ہے کہ یہی ایک ایسا معاملہ کہ جہاں اس کے والدین اس سے کمزور ہیں اور وہ انھیں نیچا دکھا سکتا ہے۔

جرمنی کا ایک مشہور ماہر عمرانیات نے معلوم کیا کہ زیادہ تر تعداد مجرمین کی ان خاندانوں سے ہوتی ہے جن کے افراد جرائم کو روکنے کا کام کرتے ہیں مثلاً حکام عدالت۔ پولس والے اور قید خانوں کے نگہبان وغیرہ۔ اسی طرح مدرسین کے بچے تعلیم میں عام طور پر پھسڈی ہوتے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ اس جرمن ماہر عمرانیات کا یہ نظریہ صحیح اور درست ہے اور ہم نے دیکھا کہ اکثر وہ بچے جو اعصابی امراض میں مبتلا رہتے ہیں ڈاکٹروں کے ہوتے ہیں اور مجرم بچے مذہبی پیشواؤں (یعنی پادری وغیرہ

کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ بچے جن کے والدین ان کی پیشاب کرلینے کی عادت کو اہمیت دیتے ہیں ضد اور مخالفت کرتے اور بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بھی قوت ارادی رکھتے ہیں۔

خوابوں کا اثر

بچوں کی پیشاب کرلینے کی عادت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں خوابوں کو بھی دخل ہے۔ خواب میں بچوں کے وہ جذبات متحرک ہوجاتے ہیں جو ان سے ایسی حرکات کرادیتے ہیں جن کی ہم ان سے توقع رکھتے ہیں مثلاً ہم بچے کو ہمیشہ سمجھاتے اور تاکید کرتے رہتے ہیں کہ وہ بیت الخلا جاکر پیشاب کرے تو اب وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ بیت الخلا گیا اور پیشاب کیا حالانکہ وہ بستر پر سورہا تھا۔ اب اگر بچے کو ملامت کی جائے تو وہ اپنا خواب بیان کرکے خود کو بے قصور ثابت کرتا ہے۔ جو ایک طرح سے درست بھی ہے۔

اکثر بچے اپنی پرورش کرنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے۔ یا ان کو نیچا دکھانے اور بعض وقت ان کی مخالفت میں پیشاب کرلیتے ہیں گویا کہ اس چیز کے ذریعہ دشمنی کا اعلان کرتے ہیں۔ جو بچے رات میں پیشاب کرلیتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ماؤں کی توجہ دن کے علاوہ رات میں بھی حاصل کریں۔ ہر پہلو سے غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا پیشاب کرلینا تخلیقی فعل کے اظہار کا طریقہ ہے۔ بچہ درعوض منہ سے کچھ بولنے کے مثانہ کے ذریعہ بات کرتا ہے۔ جسمانی کمزوری کو بچہ اظہار خیالات کا ذریعہ بناتا ہے۔

وہ بچے جو اس طریقے سے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے اکثر اندرونی نفسیاتی الجھن اور بے چینی میں مبتلا رہتے ہیں۔ عام طور سے یہ وہی بچے ہوتے جو بچپن میں تو لاڈ و پیار میں پلے لیکن بعد میں گھر والوں کی توجہ کا مرکز نہ رہے۔ مثلاً ماں کو دوسرا بچہ ہوجائے تو اس وقت پہلے بچے کے لئے امکان باقی نہیں رہتا کہ ماں کی پوری توجہ اب وہ اپنی طرف منعطف کرائے۔ بچوں کا کپڑوں میں یا بستر پر پیشاب کرلینا ان کی ایک تدبیر اور ترکیب ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی

ماں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور اس کے نزدیک ہو جاتے ہیں اگرچہ یہ ایک بری اور تکلیف دہ تدبیر ہے۔ بچہ اپنی اس حرکت سے (یعنی پیشاب کر لینے سے) گویا کہ ماں کو کہتا ہے "میں ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا اور اتنا سمجھدار نہیں ہوا (جتنا کہ تم سمجھتی ہو)۔ ابھی مجھے تمہاری نگرانی اور مدد کی ضرورت ہے"۔

یہ بچے اگر کوئی اور جسمانی نقص رکھتے تو دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ مثلاً بعض بچے اپنی آواز کو ماں کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں، رات کو رو کر اٹھتے۔ چیختے چلاتے اور بےچین رہتے ہیں بعض بچے نیند میں چلتے ہیں یا انھیں کابوس ہوتا ہے۔ بعض بچے بستر سے گر جاتے ہیں اور بعض بار بار نیند سے ہشیار ہو کر پانی مانگتے ہیں۔ ان سب علتوں کی نفسیاتی وجہ وہی ہے یعنی ماں کی توجہ حاصل کرنا مختلف بچے اپنے ناقص اعضاء اور اپنے ماحول کے مطابق اپنے حصول مطلب کے لئے مختلف تدابیر اور طریقے اختیار کرتے ہیں۔

نفس کا اثر جسم پر پڑتا ہے

یہ صورتیں صاف طور پر بتاتی ہیں کہ نفس کا اثر جسم پر کس قدر پڑتا ہے۔ غالباً نفس صرف کسی ایک حصہ جسم میں کوئی خاص بات پیدا نہیں کرتا بلکہ پورے جسم پر قابو رکھتا اور اس کی ساخت اور نشوونما پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ ہم ہمارے اس مفروضے کے متعلق کوئی راست ثبوت پیش نہیں کر سکتے اور ہمارے خیال میں ثبوت پیش کرنا مشکل ہی ہے لیکن اس کے متعلق جو شہادت ملتی ہے وہ کافی اور واضح ہے مثلاً اگر کوئی لڑکا ڈرپوک ہوتا ہے تو اس کے ڈرپوکپن کا اثر اس کی جسمانی نشوونما میں نظر آ جاتا ہے۔ ایسا لڑکا جسمانی مشاغل (یعنی ورزشوں اور کھیلوں) میں حصہ نہیں لیتا اور تصور کر لیتا ہے کہ وہ ان مشاغل کے قابل نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے رگ پٹھوں کی درستی کا خیال بھی کبھی نہیں آتا اور وہ ان تاثرات کو جو اسے رگ پٹھوں کی درستی اور نشوونما کی جانب متوجہ کرتے ہیں اپنے ذہن سے دور رکھتا ہے۔ دوسرے بچے جو اپنے رگ پٹھوں کو قوی بنانے کا شوق رکھتے ہیں جسمانی طاقت اور صحت کے لحاظ سے اس سے بڑھ جاتے اور یہ بچے

چونکہ اس چیز سے دلچسپی نہیں رکھتا پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ پورا جسم اور اس کی نشو و نما نفس سے متاثر ہوتی ہے اور نفس کی غلطیاں اس کی کمزوریاں جسم کی حالت سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ غور کرنے سے ہمیں ایسے جسمانی نقائص نظر آجاتے ہیں جو نفسیاتی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جن کی اصلاح نفس کی صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ نہ ہو سکی مثلاً انڈوکرائین غدود زندگی کے پہلے چار یا پانچ سال تک (خارجی اثرات) سے متاثر ہوتے ہیں۔ ناقص غدود انسان کی چال چلن پر مجبور کن اثر نہیں ڈالتے بلکہ پورے ماحول سے اور بچے کے ارتسامات حاصل کرنے کے طریقے اور اس کے نفس کی تخلیقی سرگرمی سے خود متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

نفسیاتی جذبات کا جسم پر اثر

ایک دوسری شہادت پیش کی جاتی ہے جو آسانی سے سمجھ میں آسکتی اور مان لی جا سکتی ہے اس لئے کہ یہ زیادہ عام فہم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نفسیاتی جذبے کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ انسان اپنا جذبہ جسمانی حرکات سے ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً اٹھنے بیٹھنے کے طریقے سے۔ چہرہ سے۔ پاؤں اور گھٹنوں کے کانپنے وغیرہ سے۔ اسی طرح جذبات سے اعضا جسمانی کی حالت میں تغیر پیدا ہوتا ہے مثلاً شرم یا غصہ کی حالت میں انسان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ خوف یا صدمے سے زرد پڑ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان جذبات کا اثر دوران خون پر پڑتا ہے۔ خوف۔ فکر۔ غم یا اور کسی جذباتی حالت میں انسان کا جسم بولنے لگتا ہے لیکن ہر ایک انسان کا جسم اپنی ایک خاص نوعیت سے بولتا ہے۔ (یہاں بولنے سے مطلب ظاہر کرنا ہے یعنی نفسیاتی جذبات کا وجود اعضا جسمانی ظاہر کر دیتے ہیں اور ہر انسان میں یہ کیفیت جدا طور پر ظاہر ہوتی ہے)۔ مثلاً حالت خوف میں ایک شخص کانپنے لگتا ہے تو دوسرے کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تیسرے کو دھڑکا شروع ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ بعض کا دم گھٹ جاتا ہے بات نہیں کر سکتے آواز ہی نہیں نکلتی۔ بعض اپنے جسم کو سکڑا کر دبکنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات خوف کی حالت میں طبیعت بگڑ جاتی ہے مثلاً بھوک مرجاتی یا قے ہونے لگتے ہیں۔ بعض لوگوں کے

مثانے اور عضو تناسل میں ایک قسم کی خراش پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر بچے جب امتحان دینے میں مشغول رہتے ہیں تو اپنے عضو تناسل میں ہیجان اور تناؤ محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ اکثر مجرمین جرم کرنے کے بعد بیویوں یا اپنی معشوقہ عورتوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جنس اور فکر و تشویش کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور بعض ماہرین کا خیال ہے ان دو چیزوں میں دور کا بھی تعلق نہیں ہے ان لوگوں کا یہ اختلاف رائے ان کے تجربوں کی بنا پر ہے۔

مختصر یہ کہ مختلف لوگ مختلف طریقوں سے اپنے جذبات کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ جذبات ظاہر کرنے کے طریقے موروثی ہوتے ہیں اور ان سے ہمیں لوگوں کے خاندانی کمزوریوں اور دوسری خصوصیات کا پتہ چل جاتا ہے۔

غصے کی حالت

اب جو بہت ہی دلچسپ مسئلہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ نفس جذبات کے ذریعے جسمانی تحریکات کس طرح پیدا کرتا ہے۔ جذبات کا پیدا ہونا اور ان کی وجہ سے جسمانی علامتوں کا ظاہر ہونا ہمیں بتاتا ہے کہ کسی خاص موقع پر نفس کس طرح عمل کرتا ہے اور اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے اور نفس اس ردعمل کو اپنے موافق سمجھتا ہے یا مخالف مثلاً جب کسی کو غصہ آجاتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی کمزوریوں اور نقائص پر حاوی ہو جائے پس وہ فوراً دوسرے شخص کو مار بیٹھتا ہے اس پر حملہ کر دیتا یا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ نفس جب غصے کا جذبہ پیدا کرتا ہے تو اس جذبے کا اثر اعضاء جسمانی پر پڑتا ہے اور اعضاء حملہ کرتے تیار اور مستعد ہو جاتے ہیں بعض لوگوں کو غصے کی حالت میں پیٹ کا درد ہوتا ہے۔ بعض کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور ان کا دوران خون اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ وہ دردِ سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عام طور سے دیکھا گیا کہ غصیلے لوگ جو ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتے ہیں دردِ سر یا کسی اور اعصابی درد کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بعض کو مرگی کے دورے ہونے لگتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ جذبات اعضاء جسمانی پر

کس طرح اثر ڈالتے ہیں اس کے ذرائع کیا ہیں اور کیا عجب کہ یہ راز ہم پوری طور سے کبھی بھی معلوم نہ کر سکیں۔

نفسیاتی کشمکش ارادی اعصابی نظام اور نموئی اعصابی نظام۔ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ جب کسی شخص میں نفسیاتی کشمکش کی حالت پیدا ہوتی ہے تو اُس کا نموئی اعصابی نظام متحرک ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار میز پر ہاتھ مارتا اور اپنے ہونٹ چبانے لگتا یا کاغذ کے ٹکڑے پھاڑنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے بعض وقت پنسل یا سگار کو چبا کر اپنا غصہ نکالتا ہے۔ اس شخص کی یہ حرکات ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ایسے موقعہ میں آ گیا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا اس کے لئے مشکل اور ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کا اجنبی لوگوں کی صحبت میں شرمانا یا خوف سے کانپنے لگنا یا اس کا چہرہ اتر جانا۔ سب نفسیاتی اندرونی کشمکش کی علامتیں ہوتی ہیں۔ نموئی اعصابی نظام کے ذریعے نفسیاتی کشمکش کا اثر پورے جسم پر پڑتا ہے اس لئے ہر جذبے کے ساتھ پورے جسم میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی اندرونی کشمکش کا اثر ہر وقت ظاہر نہیں ہوتا بلکہ خاص اوقات اور حالات میں نمایاں ہوتا ہے۔

اگر ہم بہت غور سے تحقیق کریں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی جذبے کے پیدا ہوتے ہی اس سے پورا جسم متاثر ہو جاتا ہے اور مختلف علامات اعضا جسمانی سے جو ظاہر ہوتے ہیں وہ نفس کے جسم پر اثر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ہمیشہ نفس اور جسم کے ان اثرات کو جو یہ ایک دوسرے پر ڈالتے رہتے ہیں غور سے دیکھتے رہیں اس لئے کہ نفس اور جسم دونوں سے انسان بنا ہے۔

اس شہادت سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہر شخص کا طرز زندگی اور اس کے جذبات اس کے جسم کی نشو و نما پر لگاتار اثر ڈالتے رہتے ہیں۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہو کہ بچہ اپنا طرز زندگی بچپن میں قائم کر لیتا ہے تو اگر ہم تجربہ کار ہوں تو ہم بچے کی ابتدائی حالات سے معلوم کر لیں گے کہ آئندہ اس کی جسمانی حالت کیا ہو گی۔ مثلاً ایک بہادر بچے کی اس صفت یعنی بہادری کا مظاہرہ اس کے قوائے

جسمانی سے ہو جائے گا اس طرح کہ بہ نسبت دوسرے بچوں کے اس کا جسم زیادہ قوی اور زیادہ تندرست ہوگا۔ اس کے رگ پٹھے مضبوط ہونگے۔ اس کی رفتار استوار اور پائیدار ہوگی۔

انسان کے اٹھنے بیٹھنے۔ کھڑے ہونے کے طور طریق کا جسم پر بہت اثر پڑتا ہے اور رگ پٹھوں کا مضبوط یا کمزور ہونا اس پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے۔ بہادر بچہ ہو یا کوئی بڑا شخص ہو اس کا بشرہ بلکہ تمام خدوخال ہی دوسروں سے جدا ہوتے ہیں۔ آج ہمارے لئے مشکل ہے کہ ہم اس نظریہ کی کہ نفس کا اثر جسم پر پڑتا ہے تردید کریں یا اس کو غلط قرار دیں علم تشخیص الامراض نے کئے مثالیں پیش کردی ہیں کہ کسی فرد کے دماغ کے بائیں نصف کرہ میں اگر خرابی یا خلل پیدا ہو جائے تو اس میں لکھنے پڑھنے کا مادہ باقی نہیں رہتا لیکن جب وہ اپنے دماغ کے دوسرے حصوں کو تربیت دے کر ان سے کام لینے لگتا ہے تو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پھر پیدا ہو جاتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مرگی کے دوروں کی وجہ دماغ کا کچھ حصہ خراب ہو جاتا ہے اور یہ خرابی لا علاج ہو جاتی ہے لیکن اس وقت دماغ کے دوسرے حصے مدد کرنے لگتے ہیں اور دماغ کے ایک حصے کی خرابی کا بدل ہو کر پورے قوائے دماغی کو پھر چالو اور بحال کر دیتے ہیں۔ یہ صورت حال خاص طور سے اہم ہے اس لئے کہ اس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم انفرادی نفسیات سے کس حد تک تعلیم میں کام لے سکتے ہیں۔ اگر نفس کا اثر دماغ پر پڑتا ہے۔ اگر دماغ سوائے اس کے کہ وہ نفس کا آلہ کار ہے اور ایک نہایت اہم آلہ کار ہے بلکہ ایک ہی صرف آلہ کار ہے اور کچھ بھی نہیں تو پھر ہمیں چاہئے کہ اس آلہ کار یعنی دماغ کی پوری نشو ونما اور ترقی کے لئے مختلف طریقے معلوم کریں۔ ایک شخص جو ایک ناقص قسم کا دماغ لے کر پیدا ہوتا ہے اس کے لئے ضروری نہیں کہ اسی دماغی حالت سے وہ اپنی زندگی گزار دے وہ ایسی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے جو اس کی دماغی حالت کو درست کر سکتی اور بہتر بنا سکتی ہیں اور وہ زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

نفس کی غلط رہنمائی اگر کسی شخص کا نفس زندگی کا غلط مقصد قرار دے لے مثلاً دوسروں

سے تعاون، نہ کرنا۔ اپنا شعار بنا لے تو ایسا نفس دماغ کی نشو و نما پر مفید اثر نہیں ڈال سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ بچے جو آپس میں مل جل کر کام کرنے کے عادی نہیں ہوتے وہ آگے چل کر ذہین نہیں ہوتے اور ان کی سوچ بوجھ کمزور ہوتی ہے۔ چونکہ ہر نوجوان کے حالات اور اطوار زندگی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ابتدائی عمر یعنی چار یا پانچ سال کی عمر میں اس نے کیا طرز زندگی اختیار کر لیا کیا اور اکی اسکیم بنالی اور نصب العین زندگی کیا قرار دے لیا اس لئے ہم آسانی سے ان رکاوٹوں کو جو اسے دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے سے روک رہی ہیں معلوم کر لے سکتے اور ان رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی اصلاح کر لینے میں اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ انفرادی نفسیات میں اس سائنس کے ابتدائی منازل شامل ہیں۔

نفس جسم پر کیوں اثر ڈالتا ہے

اکثر مصنفین بتاتے ہیں کہ نفس اور جسم کے مظاہروں میں تعلق ہوتا ہے لیکن کسی نے بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آخر یہ تعلق کیوں اور کس وجہ سے ہوتا ہے کرشمیر بتاتا ہے کہ ایک خاص قسم کا نفس رکھنے والے شخص کی جسمانی نشو و نما بھی ایک خاص طور پر ہوتی ہے۔ اس نے انسانوں کے خاص نمونے قایم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور دنیا کے اکثر انسانوں کو ان نمونوں کے مطابق بتایا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ پست قد۔ گول چہرے۔ چپٹی اور چھوٹی ناک رکھنے والے موٹے لوگ جن کے متعلق جولیس سیزر کہتا ہے "مجھے اپنے اطراف ایسے لوگ جمع کرنے دو جو موٹے تازے چکنے چپڑے ہوں اور راتوں کو خوب سونے والے ہوں" (جولیس سیزر ایکٹ پہلا سین دوسرا) ان لوگوں کی بعض خاص نفسیاتی خصوصیات ہوتی ہیں لیکن اپنی تصنیف میں کہیں یہ نہیں بتاتا کہ آخر جسم کی بناوٹ کا نفس پر کیوں اثر پڑتا ہے جسم اور نفس کا یہ تعلق کیوں ہے۔ اب ہمارے زمانہ کے حالات کے تحت تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس صورت اور وضع قطع کے لوگوں میں کوئی نقص نہیں ہوتا وہ صحیح تندرست اور ہمارے کلچر کے لئے موزوں ہوتے ہیں جسمانی حیثیت سے وہ خود کو دوسروں کے برابر پاتے ہیں اور اپنے کس بل پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ غصیلے اور جوشیلے نہیں ہوتے لیکن اگر کسی سے لڑنا چاہیں تو

خوب لڑ سکیں گے۔ اس قسم کے لوگ دوسروں کو خواہ مخواہ اپنا دشمن نہیں سمجھتے اور نہ دنیوی زندگی کو اپنا مخالف سمجھ کر ہمیشہ اس سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ نفسیات کا ایک مکتب ان لوگوں کو عملی آدمی کہتا ہے۔ ہم انھیں عملی آدمی اس لئے سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی جسمانی تکلیف میں مبتلا نہیں رہتے اور اس سے کوئی زحمت نہیں اٹھاتے۔

کریشمر متذکرہ بالا قسم کے افراد کے متقابل انسانوں کی ایک اور قسم بیان کرتا ہے یعنی خیالی اور خبطی جن کے سر بیضاوی ہوتے ناک اونچی اور لمبی ہوتی اور جو پست یا بلند قامت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اس کے خیال میں تاملی یعنی اپنے خیالات میں آپ محو رہنے والے۔ خاموش اور کم گو ہوتے ہیں اور اگر ان میں کوئی نفسیاتی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو پھر یہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق سیزر کہتا ہے۔ "وہ کیسیس بھوکا نظر آتا ہے اور دبلا پتلا ہے۔ وہ ہمیشہ سونچتا رہتا ہے ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔" (جولیس سیزر۔ ایکٹ ۱۔ سین ۲)۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ناقص اعضا کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور خود غرضانہ اور قنوطی یعنی مایوسانہ جذبات کے ساتھ ان کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ اپنے آپ میں محو رہتے ہیں۔

یہ لوگ ضرورت سے زیادہ دوسروں سے مدد کے طالب ہوتے ہیں اور توقعات رکھتے ہیں اور جب انھیں ان کے حسب دلخواہ مدد نہیں ملتی اور ان کی توقعات پوری نہیں ہوتیں تو یہ اہل دنیا سے بدگمان اور ان کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

کریشمر ان دو اقسام کے علاوہ اور بھی مخلوط اقسام کے انسانوں کا ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ بعض وقت پست قد اور بونے قسم کے لوگ بلند قد اونچی ناک والوں کی خصوصیات ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے ذریعے بچوں کے خصائل اور خصوصیات بدل سکتے ہیں مثلاً مسلسل روک ٹوک سے ہم ایک بچے کو بلند قد اور اونچی ناک والے اپنے آپ میں محو رہنے والے قسم کا انسان کر دے سکتے ہیں۔

زندگی میں تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ہم جہاں دیدہ اور تجربہ کار ہوں تو ہم کسی فرد کے

تمام جزوی حرکات اور جذبات سے بھی معلوم کر لیں گے کہ اس میں تعاون کی صفت کس حد تک موجود ہے۔ تعاون اور امداد باہمی کی زندگی میں سخت ضرورت ہے۔ سائینس کی رو سے نہیں بلکہ وجدانی طور پر ہم کو بعض اشارے مل گئے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ اس افراتفری کے زمانہ میں ہمیں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی تاریخی انقلاب ہوتا ہے تو اس کے قبل لوگوں کی نفسیاتی حالت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ لوگ انقلاب کی ضرورت محسوس کرنے لگتے اور انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تک یہ کوشش جبلّی رہتی ہے اس میں غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔

معذور لوگوں کو بھی مفید بنایا جاسکتا ہے

اکثر لوگ ناقص اعضاء رکھنے والے معذور لوگوں کو مثلاً لنگڑے لولے اور کوبڑوں کو ناپسند کرتے اور انھیں بری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سے پوری طور سے واقف ہونے کے بغیر انھیں ناکارہ اور ناقابل تعاون سمجھتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ غلطی ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ ان کے ذاتی دیرینہ تجربہ پر مبنی ہو۔ واقعہ تو یہ ہے کہ لوگ خود ان معذوروں کو اس طرح تربیت نہ دے سکے کہ ان میں تعاون کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی اور وہ مفید ثابت ہوتے بلکہ ان کی کمزوریوں اور جسمانی نقائص کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان بیچاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور یہ عوام کے توہم کا شکار ہو گئے۔

خلاصہ بیان

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا اب ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:- عمر کے پہلے چار یا پانچ سال میں بچہ اپنی نفسیاتی کوششوں کو جمع کرتا اور متحد کرتا ہے اور نفس اور جسم کے درمیان بنیادی تعلقات قائم کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا طرز قائم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی جذبات اور جسمانی ساخت بھی ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اب بچے کی نشو ونما منحصر ہوتی ہے اس کی تعاون کی صلاحیت کی کمی یا زیادتی پر اور اسی درجہ تعاون سے ہم کسی فرد کی زندگی کو جانچتے ہیں۔ (مطلب یہ ہے کہ بچے کی آیندہ نشو ونما اور اس کا زندگی میں کامیاب ہونا یا ناکامیاب رہنا منحصر ہوتا ہے اس کی تعاون اور اتحاد عمل کی صلاحیت پر۔ اگر یہ صلاحیت زیادہ ہوگی تو وہ زندگی میں کامیاب

ہوگا اگر نہ ہوگی یا بالکل کم ہوگی تو ناکامیاب ہوگا۔ لوگ زندگی میں جو ناکامیاب ہوتے ہیں اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں تعاون اور اتحاد باہمی کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے یا بہت ہی کم ہوتی ہے۔

نفسیات کی تعریف

ہم نفسیات کی ایک اور تعریف بیان کرتے ہیں۔ نفسیات وہ علم ہے جو ہم کو انسانوں میں تعاون اور امداد باہمی کی صلاحیت کا نہ ہونا یا کم ہونا معلوم کرنے کے قابل بناتا ہے۔

جب کسی کا ایک دفعہ طرز زندگی قائم ہوجاتا ہے تو اب اس سے جتنے نفسیاتی مظاہرے یا جذبات ظاہر ہوتے ہیں وہ اس قائم شدہ طرز زندگی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہوئے کہ کسی فرد کے جذبات اس کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور اس کے لئے مضر ثابت ہو رہے ہیں اور ان جذبات کو بدل دینے کی کوشش کریں تو یہ کوشش کامیاب نہ ہوگی اس لئے کہ یہ جذبات لازمی نتیجہ ہیں اس کے طرز زندگی کا جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ تاوقتیکہ وہ طرز زندگی نہ بدلے اس کے نفسیاتی جذبات بدل نہیں سکتے۔

طرز زندگی بدلنے سے اصلاح ہوسکتی ہے

یہاں انفرادی نفسیات کی جانب سے ہمارے تعلیمی اور معالجاتی نظریہ کو ایک خاص اشارہ ملتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کسی فرد کی کسی ایک کمزوری یا ایک خرابی کا ہرگز علاج نہ کریں بلکہ اس کے طرز زندگی پر پورے طور سے غور کر کے معلوم کریں کہ اس میں خرابی کیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم کریں کہ اس کے نفس نے اس کی زندگی کے تجربوں کی کس طرح ترجمانی کی ہے۔ زندگی کے معنی اور مقصد اس کو کیا سمجھایا ہے نفس نے جسم اور ماحول کے تاثرات کو کس طرح قبول کیا اور اس پر ان کا ردعمل کیا ہوا نفسیات کا دراصل حقیقی کام یہی ہے نفسیات یہ نہیں ہے کہ ہم کسی بچے کو سوئیاں چبوئیں اور دیکھیں وہ کتنا اچھل کود جاتا ہے یا یہ کہ بچے کو گدگدائیں اور دیکھیں کہ کتنی آواز سے وہ ہنستا ہے۔ اس قسم کی چیزوں پر ماہرین نفسیات اکثر عمل کرتے ہیں ان سے کسی فرد کی نفسیاتی حالت پر تو کچھ روشنی پڑ جاتی ہے لیکن

اس حد تک کہ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس نے اپنا کوئی طرزِ زندگی قائم کر لیا ہے یا نہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔

نفسیات کا درحقیقت تعلق افراد یعنی انسانوں کی طرزِ زندگی سے ہے۔ ان مکاتب کے لوگ جو نفسیات سے سوائے اس کے دوسرے کام لیتے ہیں وہ دراصل نفسیات سے کام نہیں لیتے بلکہ علم عضویات اور حیاتیات کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو محرّکات اور ان کے ردعمل۔ چوٹ یا کسی صدمے کا اثر دیکھنے کی فکر اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو افراد کی موروثی صلاحیتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہتے اسی زمرہ میں داخل ہیں۔ انفرادی نفسیات کا تعلق نفس سے ہے۔ اس علم کے ذریعہ ہم معلوم کرتے ہیں کہ انسانوں نے دنیا کے اور خود اپنے وجود کا کیا مقصد سمجھ رکھا ہے۔ زندگی میں ان کا نصب العین یا منزل مقصود کیا ہے۔ ان کی کوششیں کس قسم کی ہیں اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے کیا طریقے انھوں نے اختیار کئے ہیں۔

مختلف انسانوں کے نفسیاتی حالات کا فرق معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی تعاون کی صلاحیت کو جانچا جائے۔

تیسری فصل

کم تری اور برتری کے جذبات

احساس کم تری اور اس کا علاج

'احساس کمتری' کو جو انفرادی نفسیات کا ایک بڑا انکشاف ہے دنیا میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ مختلف مکاتب کے ماہرین نفسیات نے اس اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے اور اسے عام طور پر استعمال کر رہے

ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ لوگ اس کے صحیح معنی سمجھے اور اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی شخص کو کہہ دیں کہ وہ 'احساس کم تری' کے مرض میں مبتلا ہے تو اس کا علاج بتانے کے بغیر اس طرح کہہ دینا نہ اس شخص کے لئے مفید ہوگا نہ ہمارے لئے بلکہ ایسا کہہ دینا اس کے جذبات کم تری میں اور شدت پیدا کردے گا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس شخص کی 'طرز زندگی' کے نقص اور کمزوری کو معلوم کریں اور پھر اس کو عمدگی کے ساتھ اس کی کمزوری بتا کر اصلاح کرلینے کی ترغیب دیں۔ ہر وہ شخص جو خلل اعصاب کا مریض ہوتا ہے احساس کم تری رکھتا ہے۔ ان سب مریضوں کی حالت کم وبیش یکساں ہوتی ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کبھی بھی یہ نہیں پایا گیا کہ کوئی خلل اعصاب کا مریض ہو اور احساس کم تری نہ رکھتا ہو۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ بعض مریض کسی خاص موقعوں پر مشکلات محسوس کرتے اور اپنی زندگی کو مفید راستہ پر نہیں لگا سکتے تو بعض کی دوسرے موقعوں پر یہ حالت ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص درد سر میں مبتلا ہو اور ہم اُس کو صرف یہ کہتے ہیں کہ "تم کو درد سر ہے" تو اس سے اس کا درد سر جا نہیں سکتا۔ اسی طرح ہم اگر کسی شخص کو کہہ دیں کہ تم 'احساس کم تری کا مرض رکھتے ہو تو صرف یہ کہہ دینے سے نہ تو اس میں ہمت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

ایسے متعدد مریضوں سے اگر سوال کیا جائے کہ کیا تم احساس کم تری رکھتے ہو تو وہ جواب دیں گے "نہیں"۔ بلکہ بعض تو یہ کہیں گے کہ "ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنے آس پاس والوں سے بہتر ہیں"۔ حقیقت میں ہمیں چاہیئے کہ ہم ان مریضوں سے سوال ہی نہ کریں بلکہ ان کے عادات و اطوار کا بغور مشاہدہ کریں اور معلوم کرلیں کس چال اور حیلے سے وہ اپنے دلوں کو اپنی اہمیت اور برتری کا یقین دلا رہے ہیں "مثلاً" اگر ہم کسی شخص کو مغرور و متکبر پائیں تو ہم فوراً سمجھ جائیں کہ وہ احساس کم تری رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی کافی عزت نہیں کرتے۔ اس کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لئے اکڑ کر بتانا چاہتا ہے کہ میں بھی کچھ چیز ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص باتیں کرتے وقت ہاتھ وغیرہ خوب ہلاتا ہے ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ میرے

الفاظ مخاطب کو متاثر کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں اس لئے مجھے ہاتھوں وغیرہ کی حرکات سے الفاظ کو موثر بنانا چاہئے۔" ہر وہ شخص جو خود کو دوسروں سے برتر بنانے کا عادی ہوتا ہے وہ درحقیقت احساس کم تری رکھتا ہے اور مختلف تدبیروں سے اپنی مفروضہ برتری ظاہر کر کے اپنے حقیقی احساس کم تری کو چھپاتا ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک پست قد شخص کو جب اپنی پست قدی کا خیال آتا ہے تو پاؤں کی انگلیوں پر چل کر ظاہر کرتا ہے کہ وہ دراز قد ہے۔ بعض وقت بچوں کو ہم یہی حرکت کرتے دیکھتے ہیں کہ وہ بچہ جو بہ نسبت دوسرے بچوں کے پست قد ہوتا ہے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ اونچا نظر آئے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تم پست قد ہو؟ تو کبھی اس کا اقرار نہیں کرتا۔ اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ شخص جو اپنی کم تری کا زبردست احساس رکھتا ہو مطیع۔ خاموش طبیعت۔ اپنے پر قابو رکھنے والا یعنی ضابطہ۔ صلح پسند نہیں ہو سکتا۔

احساس کم تری کی مثال

احساس کم تری کا مظاہرہ بے شمار طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم ایک حکایت کے ذریعہ اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک دفعہ تین لڑکوں کو جانور گھر لے گئے جب یہ تینوں بچے ببر کے پنجرے کے پاس پہونچے تو ایک لڑکا ڈر کر اپنے ماں کے پیچھے چھپ گیا اور کہا "میں گھر جانا چاہتا ہوں۔" دوسرا لڑکا جس کا خوف سے چہرہ زرد پڑ گیا اور کانپنے لگا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا اور کہا "میں بالکل نہیں ڈرتا۔" تیسرا لڑکا ببر کو خوب گھور کر دیکھا اور ماں سے پوچھا "کیا میں اس پر تھوکوں؟" اب ان تینوں لڑکوں نے احساس کم تری کا اظہار کیا لیکن ہر ایک نے اس کا اظہار ایک خاص طریقے سے اپنی "طرز زندگی" کے مطابق کیا۔

چونکہ ہمیں دنیا میں مشکلات کا سامنا ہوتا رہتا ہے اور ان پر عبور حاصل کرنا پڑتا ہے اور چونکہ ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی زندگی کو بہتر بناتے رہیں اس لئے تقریباً ہم سب ایک حد تک احساس کم تری رکھتے ہیں۔ اب اگر ہم ہمت و استقلال سے کام لے کر اور حقایق زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اطمینان بخش طریقہ پر کسی مشکل موقع کا مقابلہ کرنے کا خود کو عادی بنالیں تو ہم اپنے احساس کم تری پر قابو پا جائیں گے اور اس کو دور کر سکیں گے

کوئی انسان ایک زمانہ دراز تک احساس کم تری کے مرض میں مبتلا رہتا نہیں چاہتا اس لئے کہ اس کیفیت سے اس میں ایک بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ خود کو اس حالت و کیفیت سے نکالنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو پست ہمت ہو گیا ہو اور جس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہ آتا ہو کہ اگر وہ ارادے کے ساتھ کوشش کرلے تو مشکل کو آسان کر سکتا اور الجھے معاملہ کو سلجھا سکتا ہے وہ بھی احساس کم تری کو برداشت کرنا اپنے لئے باعث تکلیف پاتا اور اس احساس کو دور کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے لیکن اس کی کوشش کے طریقے ایسے ہوتے ہیں جو اسے کامیاب ہونے نہیں دیتے۔ اگرچہ اس کا مقصد ہوتا ہے کہ مشکلات پر غالب آجائے لیکن (ایک با اصول اور منظم کوشش کے ذریعہ) مشکلات پر حاوی ہونے کی بجائے وہ اپنے لئے نوم توجہ پیدا کرنا اور جذبات برتری سے خود کو مست و سرشار کر لیتا ہے درآنحالیکہ اس کے جذبات کم تری بڑھتے جاتے ہیں اس لئے کہ اس احساس کا اصلی سبب باقی رہتا ہے۔ ہر قدم جو وہ اٹھاتا ہے وہ اس کو نفس کے دھوکے میں ڈالتا جاتا ہے اور اس کی مشکلات اور اس کے معاملات کا اصلاح اور درستی کے لئے اس پر تقاضا سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اگر بغور خوب غور کرنے اور سمجھنے کہ ہم اس شخص کے اصلاحی تدابیر پر نظر ڈالیں گے تو ہم انھیں اٹکل پچو اور بے سر و پا پائیں گے اور کہیں گے کہ ان تدبیروں اور طریقوں سے تو اس شخص کی نجات ممکن نہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ شخص مثل دوسروں کے مشکل کو حل کرنے اور کسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش میں بظاہر مصروف تو ہے لیکن دل میں کامیابی کی توقع نہیں رکھتا اس لئے اس کی سب اصلاحی تدابیر بے ربط اور بیکار ہوتے جا رہی ہیں۔ اب جب کہ وہ خود کو بالکل لاچار اور کمزور پاتا ہے تو ایسے حالات اپنے لئے پیدا کر لیتا ہے جن میں وہ خود کو تربیت کے ذریعہ قوی اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے والا بنانے کی منظم کوشش نہیں کرتا بلکہ خود کو قوی تصور کر لینے کا عادی بنا لیتا ہے۔ اس کی اس طرح خود کو بے وقوف بنانے اور اپنے نفس کو دھوکہ دینے کی عادت اس کو کامیابی کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتی ہے اور بس۔ اب جبکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ زندگی کے مشاغل اور مسائل کا

عمدگی کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا اور کامیاب نہیں ہوسکتا تو اپنے نکمے پن کو مٹانے کے لئے وہ گھر والوں پر من مانی حکومت شروع کر دیتا۔ اور گھر کا ایک جابر فرماں روا ہو جاتا ہے یا یہ کہ نشہ بازی کا خود کو عادی کر لیتا ہے اور نشہ میں ہمیشہ مدہوش رہنے لگتا ہے۔ ان تمام حالتوں میں اس میں احساس کم تری حسب حال موجود اور بحال رہتا ہے اور رہ رہ کر احساس کم تری کے جذبات اور خیالات اسکو آتے اور ستاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کی نفسیاتی زندگی کا جز بن جاتے اور بالآخر اس میں کم تری کا وہم یا خبط پیدا ہو جاتا ہے۔

کم تری کا وہم

اب ہم وہم یا خبط کم تری کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ جب کسی شخص کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا ہے جس کے حل کرنے کی وہ اپنے میں قابلیت اور صلاحیت نہیں پاتا اور اپنی ان کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے مسئلہ کے حل کر سکنے سے اپنی عاجزی ظاہر کر دیتا ہے تو اس وقت اس میں وہم کم تری پیدا ہو جاتا ہے۔

غصہ۔ رونا وغیرہ وہم کمتری ہے

اس تعریف سے ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ غصہ بھی وہم کمتری کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ رونا۔ آنسو بہانا۔ معافیاں مانگنا ہے۔ چونکہ جذبات کم تری سے اندرونی ہیجان اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کیفیت کو دور کرنے کے لئے انسان ایک تلافی کرنے والا جذبہ برتری کا پیدا کر لیتا ہے لیکن اس سے اصل مسئلے یا مشکل کے حل کرنے میں اس کو کوئی مدد نہیں ملتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ برتری کا بے کار جذبہ اس کو زندگی کے غیر مفید اور فضول راستے پر لگا دیتا ہے اور وہ مسائل اور مشکلات جو حل طلب تھے پس پشت ڈال دیئے جاتے اور طاق نسیان کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ انسان اپنا دائرہ عمل محدود کر لیتا اور اپنی مشکلات پر قابو پانے کے عوض شکست اور ناکامی کے خوف سے ان مشکلات سے دور بھاگنے لگتا ہے اور اپنے حرکات و سکنات اور وعمال سے ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب مشکلات درپیش ہوتی ہیں تو وہ ٹال مٹول میں پڑ جاتا ہے اور تصفیہ نہیں کر سکتا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

اور کیا نہ کرنا چاہیئے اور بالآخر ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھ جاتا ہے۔

انسان کی یہ کیفیت کہ ناکامیابی کے خوف سے مشکل مواقع سے بچ نکلنا عارضہ گذر ترسی (یعنی پبلک مقامات میں جانے کا خوف) میں پورے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس عارضہ کا مریض اپنا یہ عقیدہ ظاہر کر دیتا ہے کہ "مجھے حد سے نہ بڑھنا چاہیئے اور نئے مقامات میں داخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ اپنے قدیم اور مانوس حالات کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ زندگی خطروں سے پُر ہے پس مجھے چاہیئے کہ میں خود کو ان خطروں سے محفوظ رکھوں" جب یہ عارضہ گذر ترسی کا بہت بڑھ جاتا ہے، تو پھر مریض خود کو ایک کمرہ میں بند کر لیتا ہے یا بستر پر پڑا رہتا ہے۔

خودکشی

مشکلات سے بچنے کی کوشش کی آخری اور انتہائی صورت خودکشی ہے۔ اس نوبت پر انسان زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنا بالکل ترک کر دیتا اور خیال کر لیتا ہے کہ اب وہ دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہا (اس لئے خودکشی کر لیتا ہے) خودکشی میں جو احساس برتری ہے وہ صاف ظاہر ہے اس لئے کہ خودکشی ایک قسم کا انتقام ہے۔ (یعنی جب انسان مشکلات زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو وہ خودکشی کر کے اپنے کو مشکلات سے برتر اور بالاتر ظاہر کرتا ہے اور اسی طرح گویا مشکلات سے انتقام لیتا ہے)۔ ظاہر ہے کہ اس طریقہ کو فکر صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

ہر خودکشی کرنے والا خود کو نہیں بلکہ دوسروں کو اپنی خودکشی اور موت کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے "میں ایک بہت ہی نرم دل اور حساس طبیعت رکھنے والا انسان تھا لیکن تم (یا دنیا) نے مجھ سے بہت ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کیا۔"

خلل اعصاب کے مریض کی حالت

خلل اعصاب کا ہر مریض اپنا دائرۂ عمل محدود کر لیتا ہے اور مشکل موقع کا سامنا کرنے سے خود کو جہاں تک ہو سکے بچاتا رہتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ زندگی کے تینوں اہم تعلقات یا مسائل (جن کا ذکر پہلی فصل میں کیا گیا) سے خود کو دور رکھے اور اپنی زندگی صرف ان ہی حالات میں بسر کرے جن میں وہ دوسروں پر چھایا ہوا رہے۔ یہ شخص یہ طریقہ زندگی اختیار کر کے

گویا کہ اپنے لئے ایک تنگ و تاریک کمرہ بنا لیتا ہے اس کے دروازے بند کر لیتا اور بلا تازی ہوا اور روشنی کے زندگی بسر کرتا ہے۔ اب یہ کہ وہ دوسروں پر کس طرح تسلط حاصل کرنا اور چھا جاتا ہے۔ انھیں ڈرا دھمکا کر یا اُن کی چاپلوسی کر کے اپنا مطلب نکال لیتا ہے اس کا انحصار اس کی تربیت پر ہوتا ہے۔ وہ وہی تدابیر اختیار کرتا ہے جو اس کی آزمائی ہوئی ہوں جو پچھلے موقعوں پر مفید اور کامیاب ثابت ہوئی ہوں بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ایک تدبیر نہیں چلتی تو وہ دوسری اختیار کرتا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اس کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کی کوشش کرنے کے عوض اپنی برتری جتاتا رہے۔

ضدی اور روتی صورت بچہ

ایک ہٹیلا یا نکما بچہ جب یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ رو کر دوسروں کو مجبور اور لاچار کر دے سکتا ہے اور ان پر چھا جا سکتا ہے تو پھر وہ "روتی صورت" بچہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ عادت بچے سے ترک نہ کرائی جائے تو یہ بڑا ہو کر مرض مالیخولیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ رونا دھونا اور ہمیشہ شاکی رہنا جس کو میں "آبی طاقتیں" کہتا ہوں یہ دو زبردست ہتھیار ہیں جو صلاحیت تعاون کو نقصان پہونچاتے اور دوسرے لوگوں کو غلام بنا دیتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں اور ان لوگوں میں جو شرمیلے ہوتے ہیں اور پھر ان شرمیلے افراد میں جو خود کو گنہگار، قصور وار سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں کم تری کا وہم سطحی ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ فوراً اپنی کمزوری کا اظہار کر دیتے اور اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی آپ مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن یہ لوگ دل میں برتری کا خیال چھپائے رکھتے ہیں۔ ان کا حقیقی اور دلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سب سے بڑھ جائیں اور اول نمبر رہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم دیکھیں کہ کوئی بچہ ہمیشہ شیخی کرتا رہتا ہے تو ہم سمجھ لیں کہ اس کا شیخی کر کے برتری ظاہر کرنا سطحی چیز ہے وہ حقیقت میں دل میں احساس کم تری رکھتا ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ اُوڈِی پَس وہم

اُوڈِی پَس وہم (یعنی فرائیڈ کا نظریہ کہ بچپن میں لڑکے ماں سے اور لڑکیاں باپ سے اُنس رکھتے ہیں اور یہ باستف

جنسی جذبات کی وجہ ہوتی ہے) ایک اعصابی خلل کے مریض کے خود کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر لینے کی ایک اچھی مثال ہے۔ اگر کوئی شخص اس دنیا میں عشق و محبت اور شادی کے مسئلے کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہو تو وہ نہ تو عشق بازی میں کامیاب ہوگا اور نہ شادی کر سکے گا۔ یہ شخص محبت کی حد تک اپنا دائرہ عمل اپنی فیملی (یعنی گھر والوں) تک محدود رکھے گا۔ اس کی جنسی کوششیں گھر کی چار دیواری کے اندر ہی ہوں گی۔ ناکامی کے خوف سے وہ سوائے ان لوگوں کے جن سے یہ بخوبی واقف اور مانوس ہے اور دوسروں سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتا۔ اسے ہمیشہ یہ خوف لگا رہتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اجنبی لوگوں پر حاوی نہ ہو سکے گا ان پر چھا نہ سکے گا۔ اُوڈِی پَس وہم کا وہی بچے شکار ہوتے ہیں جن کی مائیں انھیں بے موقع لاڈ دیتی ہیں اور جن کی نشو و نما اس خیال کے تحت ہوتی ہے کہ دنیا میں انھیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ہر خواہش پوری کریں یا دوسروں سے پوری کروا لیں اور جنھوں نے کبھی یہ تصور ہی نہیں کیا کہ دنیا میں سوائے والدین کی محبت کے انھیں اپنی آپ کوششوں سے گھر کی چار دیواری کے باہر بھی دوسروں کی چاہ اور محبت حاصل کرنا ہے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر بھی ماں کا پلو تھامے رہتے ہیں عشق و محبت کی دنیا میں ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ کسی برابر کے ساتھی کا انتخاب نہ ہو بلکہ ایک ملازمہ اور اطاعت گزار شریک زندگی مل جائے۔ چونکہ اس قسم کے لوگ اپنی ماؤں سے زیادہ کسی دوسری عورت کو اطاعت گزار اور ان کی مرضی کے موافق عمل کرنے والی نہیں پاتے اس لئے کسی عورت سے بھی عشق و محبت نہیں کرتے اور اپنی محبت اور دلچسپی کو ماں تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو کسی بچے میں بھی اُوڈِی پَس وہم پیدا کر سکتے ہیں اس طرح سے کہ ہم ماں کو کہہ دیں کہ بچے کو غیر معمولی اور ضرورت سے زیادہ لاڈ و پیار کرنے لگے اور بچے کو اپنے سے ایسا مانوس کر لے کہ اس کو دوسروں سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہنے دے اور باپ سے کہہ دے کہ وہ بچے سے بالکل انجان رہے اور اس سے اظہار محبت وغیرہ نہ کرے۔

ہکلانے کا سبب اعصابی خلل کے مریض ایک جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں ان لوگوں کی

جن کا دائرہ عمل دنیا میں محدود ہوتا ہے۔ مثلاً ہکلے جب تقریر کرتے وقت ہکلاتے ہیں تو گویا اپنی طبیعت کا تذبذب اور کمزوری ظاہر کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اگرچہ اس قسم کے لوگوں کی پرورش گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے لیکن جو تھوڑے سے سماجی جذبات ان میں فطری طور پر موجود رہتے ہیں وہ انھیں مجبور کرتے ہیں کہ اپنے ہم جنسوں سے ربط قائم کریں ان سے بات چیت کریں چنانچہ وہ ایسا کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان میں احساس کم تری پیدا ہو جاتا ہے اور انھیں خوف ہونے لگتا ہے کہ وہ بات چیت میں کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ احساس کم تری اور ناکامیابی کا خوف ان کے ہکلانے کا باعث ہوتا۔

احساس کم تری کی خرابیاں

وہ بچے جو مدرسے میں غبی اور کند ذہن سمجھے جاتے ہیں۔ وہ مرد اور عورتیں جو تیس ۳۰ سال عمر جانے کے بعد بھی کوئی پیشہ اختیار نہیں کرتے اور شادی کرنے کا خیال تک انھیں نہیں آتا۔ وہ خلل اعصاب کے مریض جو ایک ہی کام لگاتار کرتے یا ایک ہی خیال میں ہمیشہ ڈوبے رہنے کا عصبی خلل رکھتے ہیں یعنی مجبور شدہ خبطی اور وہ لوگ جو بدخوابی میں مبتلا رہتے اور اپنی راتیں فکر و پریشانی میں جاگتے جاگتے گزار دیتے ہیں یہ سب کے سب احساس کم تری کا شکار ہوتے ہیں اور یہ احساس کم تری انھیں اپنی اصلاح کرنے مشکلات پر عبور حاصل کرنے میں مانع ہوتا ہے اور یہ لوگ جہاں کے وہیں رہ جاتے ہیں۔

جلق بازی۔ سرعت انزال۔ نامردی وغیرہ اسی احساس کم تری کے علامات ہوتے ہیں۔ مرد اپنی کمزوری کی وجہ ناکامیابی کے خوف سے عورت کے قریب جانے سے ڈرنے لگتا ہے۔

احساس برتری کا متلازم مقصد اس سوال کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے کہ "آخر یہ ناکامیابی کا اس قدر خوف کیوں ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہوگا" اس لئے کہ فرد نے اپنی کامیابی کا معیار بہت بلند مقرر کر لیا"

احساس کم تری ترقی اور ارتقاء کا باعث ہوتا ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جذبات

کم تری بطور خود کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہیں۔ یہ انسان کی ترقی اور ارتقاء کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً سائنس کی ترقی ان ہی جذبات کم تری کی وجہ ہوتی ہے۔ انسان اس عالم کے اسرار پر نظر ڈالتے اور ان سے خود کو ناواقف پاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کی حقیقت معلوم کریں۔ انسانوں کی یہ کوششیں بالآخر ان پر ان اسرار عالم کو کھول دیتی ہیں اور انسان ان پر قابو پالیتے ہیں۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ انسانی کلچر کی بنیاد جذبات کم تری ہی ہیں۔ فرض کیجیے کہ کسی دوسری دنیا کا ایک باشندہ ہماری زمین پر اتر آئے وہ یہاں کی حالت دیکھ کر کہے گا "یہاں کے لوگ باوجود اپنی انجمنوں۔ اتنے اداروں کے۔ اپنے مضبوط اور مستحکم مکانوں کے۔ اپنی اچھی سڑکوں اور شاہراہوں کے پھر بھی خود کو اپنی دنیا کے دوسرے حیوانوں سے کم زور سمجھتے ہیں" حقیقت میں ہے بھی ایسا ہی کہ سب حیوانوں سے انسان کم زور ہے مثلاً انسان ببر یا گوریلا بندر کی طاقت اور قوت نہیں رکھتا اور بہت سارے جانور اپنی زندگی کے خطرات اور مشکلات کا تنہا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ بعض جانور اپنی انفرادی کمزوری کو جتھہ بندی کے ذریعہ دور کر لیتے ہیں یعنی اپنے گلے بنا لیتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے گہرے تعاون کی ضرورت ہے جو دنیا کے کسی حیوان میں نہیں پایا جاتا۔ انسان کا بچہ بہت کم زور ہوتا ہے اور کئی سال تک اس کی پرورش اور حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہر انسان ایک دفعہ سب سے چھوٹا اور سب سے کمزور رہ چکا ہے اور چونکہ انسانوں کے بلا تعاون اور امداد باہمی کے نسلِ انسان ماحول کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ بچہ جس نے شروع سے خود کو تعاون کا عادی نہ کیا ہو بڑا ہو کر قنوطی ہو جائیگا اور احساس کم تری کے وہم یا خبط میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی میں اس شخص کو بھی جو تعاون کا عادی ہو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنی زندگی میں برتری کی آخری منزل کو پہونچ گیا اور جس نے اپنے ماحول پر پورا قابو حاصل کر لیا ہو۔

زندگی مختصر ہوتی ہے اور ہمارے جسم بہت کم زور ہیں اور زندگی کے تین اہم مسائل جو ہیں ان کے حل کرنے کے طریقے متعدد اور مشکل ہیں ایسی صورت میں ہمارا فرض

یہ ہے کہ زندگی کے ہر مسئلے کا مقابلہ کریں اور اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ یہ کوشش اگر دوسروں سے تعاون کے ساتھ دوسروں کی شرکت اور مدد سے ہوگی تو زیادہ مفید ہوگی اور نوع انسان کی ترقی اور بھلائی کا باعث ہوگی۔

ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس خیال سے کہ اس نے اپنے مقاصد زندگی پورے طور پر حاصل نہیں کئے رنج کرتا ہوگا۔ بالفرض اگر کوئی شخص ایسا ہو یا کوئی قوم ایسی ہو جو زندگی کی کٹھن راہ کامیابی سے طے کرتے ہوئے ایسی منزل پر پہونچ گئی ہو جہاں مشکلات باقی نہیں رہیں اور زندگی کی کشمکش غائب ہوگئی تو ہمارے خیال میں اس منزل کی زندگی بہت ہی بے لطف رہے گی۔ وہاں ہر چیز پہلے سے ہی معلوم ہو جائے گی۔ ہر چیز کا پہلے سے ہی اندازہ کرلیا جائے گا۔ آج کا دن ختم ہونے کے بعد کل کا دن جو آئے گا تو اپنے ساتھ نہ کچھ مشکلات لائے گا نہ نئے مواقع پیش کرے گا۔ مستقبل بھی غیر دلچسپ رہے گا اس لئے کہ اس میں کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کے لئے ہم امید باندھے بیٹھیں۔

ہم ہماری لاعلمی اور بے یقینی کی وجہ اپنی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر ہم ہر چیز کا علم رکھتے۔ ہر چیز کی حقیقت یقین کے ساتھ ہم پر کھل جاتی تو پھر ہم تحقیق اور تفتیش ہی نہ کرتے اور دنیا میں آئے دن نت نئے ایجادات نہ ہوتے۔ سائنس کا خاتمہ ہو جاتا اور ہمارے اطراف جو عالم سماوی ہے (یعنی آسمان۔ چاند۔ سورج اور ستارے) اس کے متعلق ہمارے معلومات ان ہی قصے کہانیوں تک محدود رہ جاتے جو ہمارے بزرگ ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے۔ مذہب اور فنون لطیفہ جو ہمیں باغ سبز دکھا کر خوش کرتے اور دل بڑھاتے ہیں ہمارے لئے بیکار و فضول ثابت ہوتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ زندگی ہمارے لئے ایک لامتناہی کشمکش بنادی گئی۔ دنیا میں انسان کے لئے کام کرنے کے بے شمار مواقع ہیں۔ انسان آئے دن اپنے لئے نئے مسائل پیدا کرسکتا نئے مشاغل معلوم کرسکتا اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر انھیں انجام دے سکتا ہے اور اس متفقہ عمل کے نتیجہ سے نوع انسان مستفید ہوسکتی ہے۔

بیمار اور تندرست انسان کا فرق۔

خلل اعصاب کا مریض اپنی کوششوں کی ابتدائی منزل ہی میں ہمت ہار دیتا اور رک جاتا ہے۔ چونکہ اس میں مشکلات پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے وہ اس کے لئے ایک پہاڑ بن جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک صحیح اور تندرست انسان اپنے زندگی کے مسائل کو کوشش اور ہمت سے حل کرتا ہے۔ کسی مسئلہ کے حل کرنے میں جب ایک مشکل سامنے آتی ہے تو اس کو دور کر کے آگے بڑھتا ہے اسی طرح ہر ایک مشکل کا مقابلہ کرتے ہوئے کامیابی کی آخری منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ یہ شخص اپنے مسائل کے حل سے دوسروں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ زندگی کے راستے میں نہ تو دوسروں سے پیچھے پڑ جاتا اور نہ نوع انسان کے لئے باعث زحمت ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے کسی امداد یا رعایت کا طالب نہیں ہوتا بلکہ اپنی ہمت اور خود اعتمادی سے اپنے مسائل زندگی کو سماجی جذبے کے ساتھ حل کر لیتا ہے۔

ہر شخص کا نصب العین برتری جدا ہوتا ہے

ہر شخص کا نصب العین برتری ایک خاص نوعیت کا ہوتا ہے جس کا انحصار زندگی کے اس معنیٰ اور مقصد پر جو اس نے اپنے لئے قرار دے لئے ہیں ہوتا ہے۔

انسان اپنی زندگی کے جو معنی سمجھتا ہے یا مقصد قرار دیتا ہے اس کا تعلق محض الفاظ سے نہیں ہوتا بلکہ یہ نتیجہ ہوتا ہے اس کی طرز زندگی کا اور یہ زندگی پر مثل نغمہ شیریں کے اثر ڈالتا ہے۔

کسی کا نصب العین زندگی سمجھنا آسان نہیں

کسی انسان کے طرز زندگی سے اس کا نصب العین زندگی صاف اور واضح طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم اس کو سمجھ کر اس کے متعلق چند اصول بنا لیں چونکہ انسان اپنے نصب العین کو مبہم طور پر ظاہر کرتا ہے اس لئے جو علامات اس سے ظاہر ہوتے ہیں ان سے ہم کو قیاس کر لینا پڑتا ہے کہ اس کا زندگی میں نصب العین۔ مطمح نظر کیا ہے۔

کسی کے طرز زندگی کا سمجھنا کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے موافق ہے۔ شاعر اپنے

کلام میں چند الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن اس کا دلی مطلب اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اس کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر کا دلی مطلب سمجھنے کے لئے ہمیں قیاس آرائی کرنی پڑھنی ہے! اور بین السطور پڑھنا پڑتا ہے اسی طرح اس گہرے اور پیچیدہ مخلوق انسان کی طرز زندگی کے معلوم کرنے میں ہمیں عمل کرنا پڑتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کو بین السطور پڑھنا سیکھنا چاہیئے اور زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے کا فن حاصل کرنا چاہیئے اس کے سوائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

انسان کا طرز زندگی کیا اور کیوں کر قائم ہوتا ہے

انسان کا طرز زندگی اس کی عمر کے پہلے چار یا پانچ سال میں قائم ہوتا ہے اور یہ کسی ریاضی کے عمل سے قائم نہیں ہوتا بلکہ اندھیرے میں ٹٹولنے سے۔ ایسے جذبات کے ذریعہ سے جو پوری طور سے سمجھ میں نہیں آتے۔ اشاروں اور کنایوں پر غور کرنے۔ توجیہات اور بیانات کی تلاش کرنے سے طرز زندگی قائم ہوتا ہے۔ (اس جملہ کا بظاہر یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا طرز زندگی کسی اصول یا ضابطہ کے تحت قائم نہیں ہوتا اور نہ خود وہ احساس رکھتا ہے کہ اپنے لئے کوئی طرز زندگی قائم کر رہا ہے بلکہ نا معلوم طور پر اطراف و اکناف کے حالات اور ماحول کے مطابق خود بخود انسان کا کوئی نہ کوئی طرز زندگی قائم ہو جاتا ہے۔ مترجم)

نصب العین برتری کس طرح قائم ہوتا ہے

نصب العین 'برتری' بھی اسی طرح قیاس آرائی اور مثل اندھے کے ٹٹولنے سے قائم کیا جاتا ہے اور وہ پوری زندگی کا مشغلہ اور ایک متحرک رجحان ہو جاتا ہے نہ کہ ایک جغرافوی مقرر کردہ نقطہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی پوری طور سے نہیں جانتا کہ اس کا برتری کا نصب العین یا منزلِ مقصود کیا ہے اور نہ اس کو واضح اور مکمل طور پر بیان کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے پیشے کے مقاصد سے واقف ہوتا ہے لیکن اس سے اس کی کوششوں اور صلاحیتوں کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس صورت میں بھی جب کہ کوئی خاص نصب العین کوئی حقیقی منزل مقصود قرار دے لیا گیا ہو اس نصب العین کو

حاصل کرنے اس منزل مقصود کو پہونچنے کے لئے ہزاروں قسم کی کوشش کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص طبیب بننا چاہتا ہے تو اب اس کی عملی کہی قسمیں ہوتی ہیں۔ کوئی اندرونی طب کا ماہر ہونا چاہتا ہے تو کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ علم الامراض میں کمال حاصل کرے۔ بہرحال ہر شخص اپنی کوششوں اور سرگرمیوں سے ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے کس قدر دلچسپی رکھتا ہے اور دوسروں سے اس کو کتنی دلچسپی ہے۔ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے دوسروں کی مدد کرنے کے لئے خود کو کس حد تک تیار کیا ہے اور اس کی امداد کی وسعت کس قدر ہو سکتی اور کہاں محدود ہو جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جب برتری کا منزل مقصود معین کرتا ہے تو وہ اس کو اپنی احساس کم تری کا معاوضہ یا بدل تصور کر لیتا ہے۔ اگر ہم اس کے پیشہ کے سرگرمیوں کا بغور معائنہ کریں تو ہم ان کمزوریوں اور نقائص کو معلوم کر لیں گے جن کی تلافی کے لئے وہ کوشاں ہے۔

مختلف پیشے اختیار کرنے کی وجہ کیا ہے

اکثر دیکھا گیا کہ جو لوگ طبیب بنے ہیں انھیں بچپن میں بہت کم عمری میں موت کا علم ہوا اور انھوں نے محسوس کیا کہ انسان کی زندگی کے لئے موت خطرناک چیز ہے اور اس احساس کا ان پر زبردست اثر ہوا۔ مثلاً کسی کا بھائی مر گیا یا کسی کے باپ کا انتقال ہو گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے خود کو اس مقصد کے تحت تیار کرنا شروع کیا کہ انھیں ایسی تعلیم و تربیت حاصل کرنی چاہئے جو خود اسے اور دوسروں کو موت سے بچا سکے پس انھوں نے طب پڑھی اور طبیب بن گئے۔ اسی طرح کوئی مدرس بننا اپنا مقصد زندگی قرار دے لیتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ مدرسین کی حالت بالکل جدا ہوتی ہے۔ اگر کسی مدرس میں سماجی جذبات کی کمی ہو تو اس کے احساس برتری کا منزل مقصود یا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے کم تر لوگوں پر حکومت کرے اور وہ خود کو اسی وقت محفوظ پاتا ہے جبکہ اس کو اپنے سے کمزور اور کم تجربہ رکھنے والوں میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی مدرس کے سماجی جذبات درجہ کمال پر

ہوں تو وہ طلبہ کو اپنے برابر سمجھتا ہے اور ان سے برابری کا سلوک کرتا ہے ۔ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نوع انسان کی بھلائی کے کاموں میں حصہ لے ۔ ہم یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ مختلف مدرسین کے مختلف صلاحیتیں ۔ مختلف دلچسپیاں ہوتی ہیں اور ان کا انحصار ان کے برتری کے اس نصب العین پر ہوتا ہے جو وہ اپنے لئے مقرر کر لیتے ہیں ۔ جب انسان ایک نصب العین قرار دے لیتا ہے تو اس کی امکانی قوتیں اور صلاحیتیں اس نصب العین کی مناسبت سے مخصوص اور محدود ہو جاتی ہیں ۔ (یعنی نصب العین معمولی ہو تو معمولی قوت اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر نصب العین اہم اور مشکل ہو تو انسان کو اس کے حصول کے لئے اپنی پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے) ۔ لیکن نصب العین ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ ان حدود کو توڑ کر نکل جائے اور اس کی اس کشمکش میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نصب العین کے رکھنے والے کا طرز زندگی کیا ہے اور اس کا برتری کا مطمح نظر کیا ہے ۔

کسی شخص کی شخصیت کیوں کر معلوم کی جا سکتی ہے

کسی شخص کی پوری شخصیت کا ہم اس کی سطحی حالت دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ ہمیں سطح کے نیچے نظر ڈالنی پڑتی ہے ۔ بعض وقت ایک شخص اپنا نصب العین قائم کرنے کا طریقہ اسی طرح بدل دیتا ہے جیسا کہ وہ نصب العین بدل دیتا ہے یعنی اپنا پیشہ بدل دیتا ہے ۔ کسی فرد کی پوری شخصیت معلوم کرنے کے لئے اس کی اندرونی ربط اور چسپیدگی کو دیکھنا چاہئے ۔ اس کے تمام حرکات اور سکنات کام کاج کو ملا کر اگر ہم دیکھیں تو ہمیں اس کی پوری شخصیت کا پتہ چلے گا ۔ اگر ہم ایک بے قاعدہ مثلث لیں اور اس کو مختلف پوزیشن پر رکھیں تو بظاہر ہر ایک پوزیشن سے اس مثلث کی ایک مختلف شکل ہمیں دکھائی دیگی لیکن اگر ہم خوب غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر حالت میں یہ وہی مثلث ہے اسی طرح کسی شخص کی پوری شخصیت یا پورا نمونہ اس کی کسی ایک بات سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کی مجموعی باتوں اور حرکتوں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ ہم

کسی شخص کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ "اگر تم ایسا کروگے یا ویسا کروگے تو تمہاری 'برتری' کی آرزو پوری ہو جائے گی"۔ 'برتری' کی خواہش لچکدار ہوتی ہے اور جتنا کوئی شخص صحیح و تندرست ہو اتنی یہ خواہش زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنی اس خواہش کو پوری کرنے کے لئے مختلف راستے نکال لیتا ہے۔ جب ایک راستہ بند ہو جاتا ہے تو دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ شخص جو خلل اعصاب کا مریض ہوتا ہے اس کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے وہ صرف ایک ہی راستہ اختیار کرتا اور کہتا ہے "اگر یہ راستہ بند ہو جائے تو پھر دوسرا راستہ اختیار نہ کرونگا"۔

برتری کا نصب العین خدا ہو جانا۔

ہم آسانی کے ساتھ کوئی ایک خاص برتری کے نصب العین کا تعین نہیں کر سکتے جو ہر شخص اختیار کرتا ہو البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ برتری کے ہر نصب العین کی طے میں "خدا کے مثل ہونے کی خواہش" پنہاں ہوتی ہے چنانچہ بعض ایسے بچے پائے جاتے ہیں جو اپنی اس خواہش کو ظاہر کرتے اور علانیہ طور پر کہہ دیتے ہیں کہ "میں خدا ہونا چاہتا ہوں"۔ بعض فیلسوفوں کی بھی یہی خواہش رہی اور بعض معلمین ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی تعلیم و تربیت دیں کہ وہ مثل خدا کے ہو جائیں۔ قدیم مذہبوں میں بھی معلمین اپنے شاگردوں کو یہی تعلیم دیتے اور تلقین کرتے تھے کہ وہ خود کو خدا کے مثل بنانے کی کوشش کریں۔ یہ خدا کے مثل ہو جانے کا نصب العین چھوٹے پیمانہ پر فوق البشر کے نظریہ میں پایا جاتا ہے (جرمن فلسفی نیٹشے کے فلسفے میں وہ شخص جو فوق العادت قوتیں رکھتا ہو اور معمولی اخلاقی معیار سے بالاتر ہو فوق البشر یا فوق الانسان کہا جاتا ہے) یہ عجیب الہامی بات ہے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا نیٹشے جب دیوانہ ہو گیا تو حالت جنون میں اس نے اسٹرائین برگ کو خط لکھا اور خط کے آخر میں اپنا نام لکھنے کی بجائے "صلیب یافتہ" لکھا۔

دیوانوں کی حالت

دیوانے اپنا برتری کا نصب العین صاف طور سے ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً کوئی کہتا ہے کہ "میں نپولین ہوں" تو کوئی کہتا ہے "میں

چین کا شہنشاہ ہوں۔" ان لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ سب کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ ہر کس و ناکس کی نظریں ان پر پڑیں۔ لاسلکی کے ذریعہ تمام دنیا سے تعلق پیدا کر لیں اور دنیا کی باتیں بتائیں۔ آیندہ کے متعلق پیشین گوئیاں کریں اور مافوق الفطرت قوت کے حامل ہوں۔ یقیناً اسی خدا کے مثل ہو جانے کا نصب العین ہے جو بعض لوگوں میں ہر چیز کے معلوم کرنے اور دنیا تمام کی عقل حاصل کرنے اور خود کو زندہ جاوید کرنے کی خواہش اور آرزو پیدا کرتا ہے۔ چاہے ہم اپنی دنیوی زندگی کو دوام بخشنا چاہیں یا ہم تصور کر لیں کہ ہم بار بار دنیا میں جنم لے کر اور مجسم ہو کر آئیں گے یا یہ پیش بینی کریں کہ مرنے کے بعد دوسرے عالم میں ہم لافانی ہونگے ہماری یہ سب توقعات خدا کے مثل ہو جانے کی خواہش پر مبنی ہوتی ہیں۔ مذہبی تعلیم میں بتایا جاتا ہے کہ خدا حیّ اور قیوم ہے اس کو فنا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتا کہ یہ خیالات صحیح ہیں کہ غلط۔ میں صرف یہ کہونگا کہ یہ زندگی کی تعبیریں ہیں۔ زندگی کے معنی ہیں اور ان معنی میں ایک حد تک ہم سب گرفتار ہو گئے ہیں یعنی خدا اور خدا کے مثل۔

دہریہ خدا کا کیوں انکار کرتا ہے۔

ایک دہریہ جو خدا کا انکار کرتا ہے وہ بھی خدا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ خدا سے برتر ہونے کی خواہش رکھتا ہے پس اس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک عجیب لیکن برتری کا زبردست نصب العین ہے۔

جب ایک دفعہ برتری کا کوئی نصب العین قرار دے لیا جاتا ہے تو پھر طرز زندگی قائم کرنے میں غلطی نہیں ہوتی۔ اس نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے انسان جو عادات اختیار کر لیتا اور جو حرکات اس سے سرزد ہوتی ہیں وہ صحیح اور درست ہوتی ہیں۔

مسائلی بچہ کا نصب العین

ہر مسائلی بچہ (یعنی وہ بچہ جس کی تعلیم و تربیت مشکل ہو یا بگڑا ہوا بچہ) ہر خلل اعصاب کا مریض۔ ہر شرابی۔ مجرم یا جنسی

معاملات میں خلاف وضع فطری عمل کرنے والا شخص اپنے لئے ایک برتری کا نصب العین قرار دے لیتا ہے اور اس کے حصول کے لئے مختلف طریقوں سے عمل کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو ان کی عادتوں سے روکنا اور بری حرکات سے باز رکھنا ناممکن ہے اس لئے کہ انھیں اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے ان عادتوں اور بری حرکتوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایک مدرسے میں ایک بہت ہی غبی لڑکے سے استاد نے سوال کیا "تم تعلیم میں سب سے پیچھے کیوں رہتے ہو؟" تو اس نے جواب دیا "چونکہ میں سب سے زیادہ غبی اور کاہل ہوں اس لئے آپ میری طرف ہمیشہ متوجہ رہتے ہیں۔ جو لڑکے اچھے ہیں اپنا مدرسہ کا کام برابر کرتے ہیں ان کی طرف آپ ایسی خاص توجہ نہیں کرتے۔" چونکہ اس لڑکے کا نصب العین یہ تھا کہ استاد کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھے اور اس طرح اس پر حکومت کرے اس لئے اس نے یہ طریقہ اپنے لئے مفید پایا کہ سستی اور کاہلی اختیار کرے۔ اب اس لڑکے کی کاہلی کی عادت دور کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہوگا اس لئے کہ اس کے لئے برتری کا نصب العین حاصل کرنے کا یہ ذریعہ ہے۔ اس نے جو عادت اختیار کرلی (یعنی کاہلی) بالکل صحیح و درست ہے اگر اس نے یہ عادت ترک کردی تو گویا بڑا ہی بے وقوف ہوگا۔

ایک دوسرا لڑکا جو بے وقوف اور غبی تھا گھر میں تو بے حد مطیع رہتا تھا۔ لیکن مدرسہ میں پیچھے رہا کرتا تھا۔ اس لڑکے کا ایک بھائی تھا جو اس سے دو سال بڑا تھا اور اس کا طرز زندگی اس سے بالکل جدا تھا۔ یہ بڑا بھائی بہت ہشیار چست و چالاک تھا اور اپنی شوخی اور شرارت کی وجہ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتا تھا۔ چھوٹے بھائی نے اس سے ایک دن کہا "میں بیوقوف رہنا ہی اس سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ مثل تمہارے شریر بنوں اور ہمیشہ مصائب میں گرفتار رہوں"۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس لڑکے نے مصائب (یعنی مار کھانے۔ پٹنے۔ سزائیں پانے) سے خود کو محفوظ رکھنا اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا اور اسی میں 'اپنی برتری' سمجھتا تھا۔ لہذا اس نے خود کو بیوقوف بنا لیا۔ چونکہ لوگ (یعنی مدرسین اور والدین) اس لڑکے کو

بیوقوف سمجھتے تھے اس لئے اس سے ان کی توقعات بھی کم تھیں۔ اگر اس سے غلطیاں سرزد ہوتیں تو یہ ان کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جاتا تھا بلکہ اس کو اس کی کم عقلی پر محمول کیا جاتا تھا۔ اب جب کہ اس لڑکے کے نصب العین برتری کے حصول کا ذریعہ بیوقوفی تھا تو یہ بڑا ہی بیوقوف ہوگا جو اپنی اظہار کم عقلی کو ترک کرکے ہشیاری اور چالاکی اختیار کرے۔

ناقص افراد کا علاج

اس قسم کے ناقص افراد کا علاج کا اب تک یہ طریقہ رہا کہ مرض یا نقص کے علامات کو رفع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ یہ طریقہ علاج انفرادی نفسیات کے اصول کے بالکل خلاف ہے چاہے وہ علاج طب کے ذریعہ ہو یا تعلیم کے اگر کوئی بچہ حساب میں کمزور ہو یا اس کی مدرسہ کی رپورٹیں خراب آتی ہوں تو اگر ہم صرف ان چیزوں کی اصلاح پر اپنی توجہ بالکلیہ منعطف کردیں گے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ بچے کا حساب میں کمزور رہنا۔ مدرسہ میں برابر کام نہ کرنا اس لئے ہو کہ وہ مدرس کو دق کرنا چاہتا ہو یا اس کی یہ خواہش ہو کہ اسے مدرسے سے خارج کردیا جائے۔ حقیقتاً ایسا ہو تو اگر ہم بچہ کو ایک بات سے روکیں گے تو وہ کوئی دوسری ایسی بات اختیار کرلے گا کہ جس کے ذریعہ وہ اپنا مقصد پورا کرلے۔ اپنا نصب العین حاصل کرے۔

خلل اعصاب کے مریض کا بعینہ یہی حال ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک ایسا مریض وقتاً فوقتاً دردسر میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے یہ دردسر کے دورے بے معنی نہیں ہیں بلکہ خاص موقعوں پر جب کہ اس کو ضرورت ہوتی ہے یہ واقع ہوتے ہیں اور مریض ان سے فائدہ اٹھاتا ہے بعض وقت ان دردسر کے دوروں کے ذریعہ وہ خود کو سماجی مسائل کے حل کرنے سے بچا لیتا ہے اور بعض وقت یہ دورے اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب کہ اس کو نئے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے یا کسی نئے مسئلہ کا تصفیہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ دردسر کے دورے بعض دفعہ اس کو اپنے

دفتر کے کارکنوں۔ اپنی بی بی یا دوسرے گھر والوں پر تشدّد کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں کیوں یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ اس آزمودہ تدبیر کو ترک کرے گا۔ یہ شخص جو دردِ سر پیدا کر لیتا ہے وہ اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ ہمیشہ اپنا مقصد یا نصب العین حاصل کر لیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہم اس شخص کے دوروں کی وجہ بتا کر اسے ڈرا دے سکتے ہیں اور وہ چلے بھی جا سکتے ہیں جیسا کہ جنگ عظیم کے بعد اکثر خللِ اعصاب کے مریضوں کو برقی جھٹکہ کے ذریعہ ڈرا کر ٹھیک کر دیا گیا۔ طبی علاج سے بھی اس شخص کو اچھا کر دینے کا امکان ہے لیکن یاد رہے کہ جب تک یہ شخص اپنا نصب العین نہ بدلے گا تو اگر وہ اس روگ سے چھٹکارا پائے گا تو کوئی دوسرا روگ پیدا کر لے گا۔ مثلاً اگر دردِ سر کے دورے چلے جائیں تو بدخوابی کا مرض پیدا ہو جائے گا یا اور کوئی روگ پیدا ہو جائیگا۔

خللِ اعصاب کے ایسے بھی مریض دیکھے گئے جو ایک علت یا علتوں کو ترک کر کے فوراً دوسری علتیں اختیار کر لیتے ہیں اور بتدریج اعصابی امراض کے مبصر ہو جاتے ہیں اور آئے دن ان کے اعصابی امراض کا خزانہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس قسم کے مریضوں کے لئے علاج بذریعہ توجہ کی کسی کتاب کا پڑھ لینا اور غضب ڈھاتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد انھیں اور بھی ایسے اعصابی امراض کا علم ہو جاتا ہے جن سے یہ پہلے واقف نہ تھے اور اب یہ ان سے بھی فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی اصلاح کے لئے ہم کو درحقیقت یہ دیکھنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنا برتری کا نصب العین کیا قرار دیا ہے کہ جس کے حاصل کرنے کے لئے مختلف علتیں اختیار کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ میں نے جماعت کے کمرے میں ایک سیڑھی منگوائی اور اس کے ذریعہ بلاک بورڈ (تختۂ سیاہ) پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے جو لوگ اس حالت میں دیکھیں گے تو یقیناً خیال کریں گے کہ ڈاکٹر اڈلر دیوانے ہو گئے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ میں نے سیڑھی کیوں منگوائی اس پر کیوں چڑھا اور کیوں اس عجیب و غریب مقام یعنی تختۂ سیاہ پر بیٹھ گیا۔ اگر وہ جان لیں گے کہ میں تختۂ سیاہ پر اس لئے بیٹھ گیا کہ جماعت

میں خود کو میں پست تر سمجھتا تھا اس لئے جسمانی حیثیت سے سب سے بلند تر ہو کر تانا چاہا کہ جماعت کے کمرے میں میں سب سے برتر ہوں تو اس وقت مجھے دیوانہ نہ سمجھیں گے ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سیڑھی میرے نصب العین کے حاصل کرنے کا ایک اچھا ذریعہ تھی اور جو کچھ میں نے عمل کیا ایک سوچے ہوئے منصوبے کے تحت کیا۔ البتہ مجھے میرے برتری کے مفہوم کے متعلق دیوانہ کہا جاسکتا ہے۔ اب اگر مجھے کوئی قائل کر دے کہ میرا برتری کا نصب العین غلط ہے اور میں اس کو بدل دوں تو گویا میں نے اپنی اصلاح کرلی۔ اگر میرا نصب العین برتری وہی رہے اور مجھ سے صرف سیڑھی چھین لی جائے تو یقیناً میں کوشش کروں گا کہ کرسی سے سیڑھی کا کام لوں اور اس کے ذریعے سے بلاک بورڈ پر چڑھ بیٹھوں اور اگر کرسی بھی لے لی جائے تو میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح اچھل کود کر تختہ سیاہ پر چڑھ کر بیٹھ جاؤں۔ یہی حالت خلل اعصاب کے مریضوں کی ہوتی ہے کہ ان کے نصب العین بذاتہ غلط ہوتے ہیں لیکن جو تدابیر اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں ان میں کوئی سقم نہیں ہوتا کوئی بات قابل اعتراض و تنقید نہیں ہوتی۔ پس ہمیں چاہیئے کہ ان مریضوں کے نصب العین کو بدل دینے کی کوشش کریں۔ اگر نصب العین بدل جائیں گے تو خود بخود نفسیاتی عادتیں اور اطوار بدل جائیں گے۔ پرانی عادتوں اور طریقوں کی ضرورت باقی نہ رہے گی نئے نصب العین کے لحاظ سے نئی عادتیں ان کی جگہ لے لینگی۔

مثال نمبر ۱ میں اب ایک تیس سال کی عورت کی مثال بیان کرتا ہوں جو میرے پاس یہ شکایت لے کر آئی تھی کہ وہ کسی سے دوستی نہیں کر سکتی اور یہ کہ اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش پیدا نہ کر سکی جس کی وجہ وہ اپنے خاندان کے لئے بوجھ ہو گئی ہے۔ اس کی حالت یہ تھی کہ اس نے مختلف اداروں میں وقتاً فوقتاً معمولی کام مثلاً مختصر نویسی یا سکرٹری کی خدمات انجام دیئے لیکن بدقسمتی سے جس جگہ بھی نوکر ہوئی مامور کنندہ شخص نے اس سے عشق بازی شروع کی اور اس نے پریشان ہو کر خدمت سے علیحدگی اختیار کی۔ ایک دفعہ اسے ایک ایسی ملازمت ملی کہ مامور کنندہ نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ

نہیں کی اور یہ اس کو اپنی ہتک سمجھ کر نوکری چھوڑ دی۔ اس عورت کا آٹھ سال تک نفسیاتی علاج ہو چکا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ علاج سے نہ تو اس میں سماجی جذبات پیدا ہوئے اور نہ یہ اپنی روٹی کمانے کے قابل ہوئی۔ جب میں نے اس عورت کا معائنہ کیا تو پتہ چلا یا کہ اس کی علت کی ذمہ داری اس کے طرز زندگی پر عائد ہوتی ہے جو اس نے بچپن میں اپنے لئے قایم کر لیا تھا۔ کوئی بھی کسی شخص کو پوری طور پر پہچان نہیں سکتا جب تک وہ اس کے بچپن کے حالات سے خوب واقف نہ ہو جائے۔ یہ عورت ماں باپ کی سب سے چھوٹی اور آخری بچی تھی۔ بہت خوبصورت تھی اور بے موقع لاڈ و پیار سے بے حد بگاڑ دی گئی تھی۔ چونکہ اس کے ماں باپ اس کے بچپن کے زمانہ میں مالدار تھے اس لئے اس کی منہ مانگی چیزیں اسے مل جاتی تھی۔ جب مجھے اس سے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے اس سے کہا "تم تو مثل شاہزادی کی پلیں اور پرورش پائیں" تو اس نے جواب دیا "تم نے عجیب بات کہی یہ واقعہ ہے کہ بچپن میں سب گھر والے مجھے شہزادی پکارتے تھے"۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ بچپن کے چند یادداشتیں بیان کرے تو اس نے کہا "مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں چار سال کی تھی تو ایک روز میں گھر سے باہر گئی اور چند بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھی یہ بچے تھوڑی دیر سے کودنے لگتے اور کہتے تھے کہ جادوگرنی آ رہی ہے یہ سن کر میں ڈر گئی اور گھر واپس آ کر میں نے ایک بوڑھیا سے جو گھر میں رہتی تھی پوچھا کہ کیا درحقیقت جادوگرنیوں کا وجود ہوتا ہے؟ بوڑھیا نے جواب دیا کہ ہاں جادوگرنیاں ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ نقب زن اور چور بھی ہوتے ہیں اور یہ سب تم کو پکڑ لیں گے" معلوم ہوا کہ اس واقعہ کے بعد یہ تنہائی سے بہت ڈرنے لگی اور یہ تنہائی کا خوف اس کی طرز زندگی کا بڑا جز بن گیا۔ اب وہ تنہا گھر سے باہر بھی نہ جا سکتی تھی اور ہمیشہ متوقع رہتی کہ سب گھر والے اس کی ہمیشہ مدد کریں اور خدمت بجا لائیں۔ اس عورت نے ایک دوسری یہ یادداشت بیان کی:۔

"مجھے پیانو بجانا سکھانے کے لئے ایک استاد آیا کرتا تھا اور اس نے ایک

روز میرا پیار لینے کی کوشش کی اور میں پیانو بجانا چھوڑ کر ماں کے پاس گئی اور استاد کی شکایت کی اور اس دن سے میں نے پیانو بجانا چھوڑ دیا۔" اس یادداشت سے ظاہر ہوا کہ یہ عورت بچپن ہی سے خود کو مردوں سے دور رکھنے کی عادی کر چکی تھی لہذا اس کی جنسی نشوونما ایسی نصب العین کے تحت ہوئی کہ وہ عشق اور محبت اور شادی سے خود کو بچائے۔ اس نے خیال قائم کر لیا تھا کہ محبت اور شادی کرنا کمزوری کی علامت ہے۔

لوگ کیوں محبت اور شادی سے بھاگتے ہیں

یہاں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اکثر لوگ جب محبت اور عشق میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے میں ایک قسم کی کمزوری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ محبوب یا محبوبہ سے نرمی کا برتاؤ کریں اور اس کی خاطر ہر طرح کی تکلیف اور زحمت برداشت کریں پس ایسی صورت میں صرف وہ شخص جس کا نصب العین برتری یہ ہو کہ "میں کبھی کمزور نہ بنوں گا۔ میں کبھی اپنے جذبات کسی پر ظاہر نہ ہونے دونگا" عشق و محبت کرنے سے باز رہے گا۔ اس قسم کے لوگ اپنے کو عمداً عشق اور محبت کے خلاف تیار کر لیتے اور اس کے قابل ہی نہیں رہتے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس ذہنیت کے لوگوں کو جب کبھی محبت کے پھندے میں پھنس جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ہنسی مذاق کر کے معاملہ رفع دفع کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں سے انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ انھیں دام محبت میں گرفتار کر لینگے تو ان سے دل لگی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتے اور اس طرح اپنے کمزوری کے جذبے کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عورت نے بھی جب کبھی مسئلہ محبت اور شادی کے متعلق غور کیا تو خود کو کمزور پایا لہذا ملازمتوں کے دوران میں جب اس کے افسروں نے اس سے عشق اور محبت کا اظہار کیا تو اس سے وہ ضرورت سے زیادہ متاثر ہوتی رہی اور ہر وقت نوکری چھوڑ کر اپنی گلوخلاصی کرتی رہی۔ یہ عورت ابھی ان مسائل اور مشکلات میں الجھی ہوئی تھی کہ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا اور اب اس کی دیکھ بھال کرنے اور لاڈ دینے والا فیملی میں کوئی نہ رہا۔ اس نے اپنے چند عزیزوں کو بلا لیا کہ گھر چلائیں اور اس کی خدمت کریں لیکن ان سے

اس کو پہلی جیسی راحت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے عزیز یکے بعد دیگرے اس سے بیزار ہو کر اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیئے اور یہ تنہا رہنے لگی۔ تنہا چھوڑ دیئے جانے پر عزیزوں کو بُرا بھلا کہا اس پر چند عزیز پھر اس کے شریک حال ہو گئے اور اس کے لئے خانہ داری کرنے لگے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کے خاندان والے اس کے شریک حال نہ ہوتے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے تو یہ بالکل پاگل ہو جاتی۔ اس عورت کا برتری کا نصب العین یہ تھا کہ زندگی کے سب مسائل کو نظر انداز کر کے صرف عزیزوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی خدمت کرتے رہیں۔ گویا کہ اس نے اپنے ذہن میں تصور باندھ لیا تھا کہ اس کا تعلق اس دنیا سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسرے سیارے کی رہنے والی ہے اور وہاں کی شہزادی ہے۔ اس دنیا کے لوگ نہ اُسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُس کی عظمت اور وقعت سے واقف ہیں۔ اس عورت کا یہ تصور یہ خیال خام تھوڑا اور بڑھ جاتا تو جنون کی شکل اختیار کر لیتا لیکن چونکہ بعض رشتہ دار ایسے مل گئے جو اس کی خدمت کرتے رہے۔ اس کو سنبھالتے رہے۔ اس لئے جنون کی نوبت نہیں آئی۔

مثال نمبر ۲ اب ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے جس میں احساس کمتری اور احساس برتری دونوں واضح طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میرے پاس علاج کے لئے ایک سولہ برس کی لڑکی رجوع کی گئی۔ یہ لڑکی چھ یا سات سال کی عمر سے چوری کی عادی ہو گئی تھی اور بارہ سال کی عمر سے راتوں کو لڑکوں کے ساتھ گھر سے غائب ہو جاتی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے والدین ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور جب یہ دو سال کی تھی تو اس کی ماں نے طلاق لے لیا اور لڑکی کو ساتھ لے کر اس کی نانی کے گھر میں رہنے لگی۔ نانی اس لڑکی کو بہت لاڈ اور پیار کرنے لگی یہ لڑکی اس زمانہ میں پیدا ہوئی تھی جب کہ اس کے والدین کے تعلقات بےحد خراب تھے اس لئے اس کی ماں اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کر سکتی تھی (اس لئے کہ اس کا اکثر وقت شوہر سے لڑنے جھگڑنے میں گزرتا تھا) بلکہ ماں کو اس لڑکی سے نفرت ہو گئی۔

تھی اور آگے بڑھ کر ماں بیٹی کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ جب یہ لڑکی میرے پاس رجوع ہوئی تو میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ طور سے اس سے گفتگو کی اور پوچھا کہ تم کیوں چوری کرتی ہو اور کیوں لڑکوں کے ساتھ غائب رہتی ہو؟ لڑکی نے جواب دیا کہ نہ میں چوری کرنا چاہتی ہوں اور نہ میں گھر سے لڑکوں کے ساتھ بھاگ جانا پسند کرتی ہوں لیکن یہ دونوں باتیں محض اس لئے کرتی ہوں کہ میری ماں کو بتاؤں کہ وہ ان چیزوں سے مجھے روک نہیں سکتی۔ یہ جواب سن کر میں نے پوچھا کہ پھر کیا تم ماں سے انتقام لینے کے لئے ایسا کرتی ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس لڑکی کا نصب العین یہ تھا کہ وہ خود کو ماں سے زیادہ قوی اور صاحب اختیار ظاہر کرے لیکن درحقیقت احساس کم تری کی وجہ اس نے یہ نصب العین اپنے لئے قرار دے لیا۔ چونکہ لڑکی بخوبی جانتی تھی کہ اس کی ماں اس سے نفرت رکھتی ہے اس لئے اس میں احساس کم تری پیدا ہوگیا اور اب ماں پر برتری اور فوقیت ظاہر کرنے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کرلیا کہ ماں کو دق اور پریشان کرتی رہے۔ عام طور سے دیکھا گیا کہ اکثر بچے اسی قسم کے انتقامی جذبہ کی تحت چوری کرتے اور دوسری بری حرکات کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۳ ایک پندرہ سال کی لڑکی گھر سے آٹھ روز تک غائب رہی۔ جب وہ ملی تو اس کو بچوں کی عدالت میں پیش کیا گیا اور اس نے من گھڑت قصہ بیان کیا کہ اس کو ایک شخص نے جبراً لے گیا اور اپنے گھر لے جا کر ہاتھ پاؤں باندھ کر کمرے میں مقفل کردیا۔ لڑکی کے اس بیان کو کسی نے بھی سچ نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر نے نرمی اور شفقت سے اس سے باتیں کیں اور بہلایا کہ واقعہ جو گزرا وہ سچ سچ بیان کردے۔ ڈاکٹر کا لڑکی کو جھوٹی سمجھنا اس کو سخت ناگوار ہوا اور اس نے ڈاکٹر کو ایک طمانچہ مار دیا۔ جب لڑکی میرے پاس لائی گئی تو میں نے اس سے کہا کہ آخر تم دنیا میں کیا کروگی۔ مجھے تم سے دلچسپی ہے۔ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں اور تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے آمادہ ہوں۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اپنا کوئی خواب جو یاد ہو بیان کرے۔ اس پر

وہ ہنس پڑی اور یہ خواب بیان کیا۔: ”میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ایسی شراب کی دوکان میں ہوں جہاں شراب چوری سے فروخت کی جاتی ہے۔ جب میں دوکان سے باہر نکلتی ہوں تو ماں سے میرا مقابلہ ہو جاتا ہے اور اتنے میں میرا باپ بھی اسی طرف آتا نظر آتا ہے اور ماں سے کہتی ہوں کہ مجھے چھپا لے تاکہ باپ مجھ کو نہ دیکھنے پائے“

بچوں کے جھوٹ بولنے کی وجہ۔

اس لڑکی کا باپ اس کو مار پیٹ کرتا تھا اور چونکہ وہ اس سے ڈرتی تھی اس لئے جھوٹ بولتی اور اس طرح اس سے انتقام لیتی تھی۔ اگر ہم کسی بچے کو جھوٹ بولنے والا پائیں تو سمجھ لیں کہ اس کے والدین اس پر بیجا سختی کرتے ہیں۔ جب تک کہ ہم سچائی یا سچ بولنا اپنے لئے خطرناک نہ سمجھیں ہمارا جھوٹ بولنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لڑکی کر اس خواب سے ظاہر ہوا کہ وہ باپ سے جب ڈرتی ہے اور دور بھاگتی ہے تو ماں سے تعاون کرتی ہے۔ اب اس لڑکی نے قبول دیا کہ کوئی شخص اس کو ورغلا کر شراب خانہ کو لے گیا اور وہ اس شخص کے ساتھ آٹھ روز تک رہی۔ باپ کے خوف سے بڑی مشکل سے اس نے اصل واقعہ بتایا۔ اس کا یہ فعل یعنی ایک شخص کے ساتھ چلا جانا اس نصب العین کے تحت تھا کہ باپ پر اپنی 'برتری' ظاہر کرے۔ چونکہ باپ ہمیشہ اس کو مغلوب رکھتا تھا اس لئے اس کے دل کو دکھا کر اس نے اس پر غالب آنا چاہا۔

غلط نصب العین کی اصلاح تعاون کی تعلیم سے ہو سکتی ہے

اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کی جو 'برتری' کا غلط نصب العین قرار دے لیتے اصلاح کس طرح کی جائے؟ اگر ہم یہ مان لیں کہ 'برتری' اور 'فوقیت' حاصل کرنے کا رجحان لوگوں میں عام طور پر ہوتا ہے تو پھر اصلاح کرنا مشکل نہ ہوگا۔ جب ہم یہ سمجھ لیں گے تو ہم خود کو ان کی جگہ رکھ کر ان کی کشمکشوں سے ہمدردی کریں گے اور انھیں سیدھے راستے پر لگانے کی کوشش کریں گے۔

اس قسم کے لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ زندگی کا بیکار رخ اختیار کر لیتے اور فضول چیزوں کے حاصل کرنے میں اپنی کوشش صرف کرتے ہیں۔ برتری اور فوقیت

کے لیئے کوشش کرنا ہر انسان کی فطرت میں ہے اور یہی چیز ہمارے کلچر کو بڑھانے مالا مال کرنے کی باعث ہوئی ہے۔ انسان کی زندگی کا مدار اسی طریقہ عمل پر ہے۔ نیچے سے اوپر پہونچنا۔ منفی سے مثبت ہونا۔ شکست کے بعد فتح حاصل کرنا سب اسی کے کرشمے ہیں۔

صرف وہی لوگ زندگی کے مسائل کا بخوبی مقابلہ کرسکتے اور ان کو کامیابی کے ساتھ حل کرسکتے ہیں جو اپنی کوششوں سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا مقصد دوسروں کو فائدہ پہونچانا ہے اور جن کی کوششوں سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے بھی ہیں۔

اگر ہم صحیح طریقہ سے لوگوں کو ان کی غلطیاں سمجھا دیں تو پھر انھیں قائل کردینے میں ہمیں زیادہ دقت نہ ہوگی۔ ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو انسان کی کامیابی اس کی بہتری کا انحصار "تعاون" پر ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے تعاون ہی نسل انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ہماری درخواست تم سے صرف اتنی ہے کہ تم ایسا طریقہ زندگی اختیار کرو۔ ایسا نصب العین قرار دو۔ ایسے عادات و اطوار اختیار کرو کہ جو باہمی تعاون کو قائم اور برقرار رکھ سکیں اور اس کو مضبوط کرسکیں۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس میں سماجی جذبات نہ ہوں خلل اعصاب کا مریض اور مجرم دونوں اس کھلے ہوئے راز کو جانتے ہیں اور جب ہی تو یہ پوری کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنے برے طریقہ زندگی کا کسی اور کو ذمہ دار ٹھیرائیں۔ یہ لوگ (یعنی خلل اعصاب کے مریض اور مجرمین) چونکہ ہمت اور استقلال نہیں رکھتے اس لئے غلط طریقہ زندگی کو ترک کرکے صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کا احساس کمتری ان کو ہمیشہ کہتا رہتا ہے کہ "کامیابی کے ساتھ دوسروں سے تعاون کرنا اور عمل بالاشتراک تمہارے لئے نہیں ہے" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کے حقیقی اور مشکل مسائل سے تو منہ موڑ لیا اور چند سطحی مسائل کے حل کرنے میں مشغول ہوگئے تاکہ کامیاب ہوں اور اپنی قوت اور برتری ظاہر کریں۔

انسان کو اپنی زندگی میں ٹھوس اور مفید کام انجام دینے کے بہت موقع ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہر مقصد میں کچھ نہ کچھ خرابی ہونے کا امکان ہے۔

ہر مقصد کے متعلق کچھ نہ کچھ نکتہ چینی کی جا سکتی ہے۔ ایک بچہ ریاضی کے معلومات حاصل کرنا اپنا نصب العین برتری قرار دیتا ہے تو دوسرا فنون لطیفہ کو تیسرا جسمانی قوت حاصل کرنا اپنا نصب العین برتری قرار دیتا ہے۔ ایک وہ بچہ جس کا ہضم کمزور ہو خیال کر لیتا ہے کہ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ غذا کے مسئلوں کی جانب توجہ کرے پس وہ اپنا وقت اپنی دلچسپی کھانے کی چیزوں پر لگا دیتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح میں مشغول ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ بعض وقت یہ نکل آتا ہے کہ اس قسم کے افراد سے کوئی ماہر باورچی بن جاتا ہے تو کوئی غذائیات کا پروفیسر ہو جاتا ہے۔ ان افراد کو جو اس قسم کے مخصوص مقاصد کو اپنا نصب العین برتری بنا لیتے ہیں حقیقی فائدہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے دوسرے امکانات بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی دوسری قوتیں اور صلاحیتیں محدود ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک فلسفی مجبور ہو جاتا ہے کہ فلسفہ کے مختلف مسائل پر غور کرنے اور انھیں لکھنے کے لئے خود کو سوسائٹی سے وقتاً فوقتاً جدا کرے اور تنہائی کی زندگی بسر کرے۔ اگر کوئی شخص اپنا نصب العین برتری حاصل کرنے کی کوشش کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے سماجی جذبات بھی رکھے تو پھر وہ غلط راستہ پر نہ سمجھا جائے گا۔ ہمارے سماجی تعاون کے لئے بہت ساری خوبیوں کی ضرورت ہے۔

چوتھی فصل

بچپن کی یادداشتیں

چونکہ دوسروں پر تفوق یعنی برتری حاصل کرنے کی کوشش اور کشمکش کرنا ہر انسان کی پوری شخصیت کی کنجی ہوتی ہے اس لئے اس کی نفسیاتی زندگی میں وقتاً فوقتاً

ہمیں اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ اگر ہم اس نظریہ کو مان لیں تو پھر کسی شخص کے "طرز زندگی" کے سمجھنے میں ہمیں دو طرح کی مدد مل جاتی ہے۔ پہلی یہ کہ ہم اس شخص کی زندگی کے حالات پر جس نوبت۔ جس منزل سے چاہیں غور کر سکتے ہیں۔ ہم جہاں سے بھی غور شروع کریں ہم یہی پائیں گے کہ اس کی پوری شخصیت ایک ہی مقصد ایک ہی نصب العین کے تحت کام کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرد کے ہر ایک لفظ۔ ہر ایک خیال۔ ہر ایک جذبے۔ ہر ایک حرکت سے اس کی پوری شخصیت ہم معلوم کر لے سکتے ہیں۔ اگر کبھی ہم اس کی کسی ایک حرکت سے کوئی غلط نتیجہ نکال لیں تو اس کی دوسری متعدد حرکات پر غور کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کر لے سکتے ہیں۔ کسی شخص کے کسی حرکات کا مطلب اور مقصد ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اس کو اس کی پوری طرز زندگی کی روشنی میں نہ دیکھیں لیکن ساتھ ہی ہر ایک حرکت کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے اور انسان کی پوری شخصیت اور طرز زندگی کے رازوں کو ہم پر کھولتی جاتی ہے۔ ہماری (یعنی ماہرین نفسیات) کی حالت مثل ایک آثار قدیمہ کے ماہر کے ہے کہ جو برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں۔ آلات۔ عمارات کی شکستہ دیواروں۔ ٹوٹی پھوٹی یادگاروں۔ پتوں پر لکھی ہوئی تحریروں کو جمع کرتا اور ان مختلف اشیاء کے ذریعہ ایک مٹے ہوئے شہر کی حالت معلوم کرتا اور وہاں کے رہنے بسنے والوں کی طرز زندگی اور تمدن کا پتہ چلاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہم ماہرین نفسیات کو مٹی ہوئی اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ ایک تنظیم کے ساتھ مخلوق کردہ انسان بلکہ ایک جیتی جاگتی شخصیت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اپنے مسلسل مطالب۔ مقاصد اور خیالات کا ہمارے سامنے مظاہرہ کرتی ہے۔

انفرادی نفسیات

کسی انسان کو سمجھ لینا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے آسان کام نہیں ہے لہذا انفرادی نفسیات کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ انفرادی نفسیات میں انسان کی مجموعی حالات اور کیفیات کو سننا پڑتا ہے اور جب تک ہم کو کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو کنجی کا کام دے ہم حالت

شک میں پڑے رہتے ہیں۔ انسان کے مختلف اور متعدد علامات (یعنی حرکات و سکنات اقوال و افعال) سے ہم کو اشارات مرتب کر لینا پڑتا ہے مثلاً یہ کہ وہ کمرے میں کس طرح داخل ہوتا ہے۔ لوگوں سے کس طرح ملتا اور ہاتھ ملاتا ہے کس طرح مسکراتا ہے۔ اس کی چال کیسی ہے وغیرہ۔ اگر کسی ایک چیز کے سمجھنے میں ہم غلطی کر جاتے ہیں تو دوسری چیزوں کے ذریعہ اس غلطی کی اصلاح کر لیتے ہیں۔

انفرادی نفسیات کے ذریعے علاج

انفرادی نفسیات کے اصول کے مطابق کسی شخص کا علاج کرنا ہی خود 'تعاون' کی ایک اچھی مشق ہے اور کسی کی 'صلاحیت تعاون' معلوم کرنے کی کسوٹی ہے۔ ہم اس قسم کے علاج میں جب ہی کامیاب ہو سکتے ہیں جب کہ ہم کو دوسروں سے حقیقی دلچسپی ہو اور مریض کو خود اس کی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کے کانوں سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور مریض بھی اس قابل ہو کہ وہ ہم سے تعاون کرے اور ہماری مدد کرے۔ ہم کو مریض کے طرز زندگی اور اس کی بچپن کے ساتھ اس کی مشکلات کو بھی معلوم کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم اس کی اصلی کیفیت اور حالت کو پوری طرح سمجھ جائیں تو یہ کافی نہیں بلکہ مریض کا خود اپنی حالت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

ایک بے تکی بیچ بات بالکل بیچ نہیں ہو سکتی اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم بات جیسا چاہئے سمجھ نہ سکے۔ شاید اسی چیز کو نہ سمجھنے کی وجہ نفسیات کے دوسرے مکاتیب نے منفی اور مثبت انتقال کا نظریہ قایم کیا جو انفرادی نفسیات کے علاج میں نہیں پایا جاتا۔ ایک مریض کو جو پہلے سے ہی بگڑا ہوا ہے محض خوش کرنے کے لیے لاڈ کی باتیں کر کے اور خراب کرنا بہت آسان ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم پر غالب آ جانے کی خواہش اس کے دل میں پنہاں رہے گی۔ اگر ہم مریض کو حقارت سے دیکھیں اور اس کو اہمیت نہ دیں تو وہ ہمارا مخالف ہو جاتا ہے اور ہم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور علاج کرانا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اگر علاج جاری بھی رکھتا ہے تو صرف اس خیال سے کہ ہم پر ظاہر کرے کہ اس کی اصلاح ہو رہی ہے وہ صحیح راستہ اختیار کر رہا ہے۔

اور ہم کو غلط ثابت کر کے نیچا دکھائے۔ لہٰذا ہم مریض کی اصلاح نہ تو اس کا لاڈ اٹھا کر کر سکتے ہیں نہ اس کو حقیر سمجھتے ہوئے بلکہ صحیح طریقہ علاج یہ ہوگا کہ ہم اس میں نوعِ انسان سے دلچسپی پیدا کر دیں۔ اس سے بہتر اور صحیح تر اور کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم مریض کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے خود اس کی اصلاح اور دوسروں کی بھلائی کی خاطر اس کی تمام غلطیاں اس کو بتا دیں۔ اگر ہمارا مطمحِ نظر یہ ہوگا تو ہم اس کے انتقالات کو ہیجان میں نہ لائیں گے اور نہ ہم کو حاکمانہ رنگ اختیار کرنے یا مریض کو ایسے موقف میں لانے جہاں وہ خود کو غیر ذمہ دار اور ہماری مدد کا محتاج سمجھے ضرورت ہوگی۔

یادداشتیں

نفسیاتی مظاہرات میں سب سے بڑھ کر کسی شخص کی حالت پر روشنی ڈالنے والے اس کی یادداشتیں ہوتی ہیں۔ اس کی یادداشتیں ہی وہ ہوتی ہیں جو اس کو اس کی صلاحیت اور قابلیت کے حدود کو یاد دلاتی رہتی ہیں۔ یادداشتیں اتفاقیہ نہیں ہوتیں (یعنی کوئی یادداشت بلا کسی سبب کے یوں ہی ذہن میں نہیں رہ جاتی) بلکہ متعدد ارتسامات اور واقعات میں سے جو انسان کی زندگی میں گزرتے ہیں وہ صرف ان ہی واقعات کو یاد رکھ لیتا ہے جن کا اس پر خاص اثر ہوتا ہے یا جو اس کی شخصیت کو بطور خاص متاثر کرتے ہیں۔ کسی فرد کی یادداشتیں گویا اس کی "زندگی کی کہانی" ہوتی ہیں۔ ایسی کہانی جو وہ ہمیشہ یاد کر کے اور دہرا کر خوش ہوتا ہے یا اس سے سبق حاصل کرتا ہے۔ ایسی کہانی جو اس کو اس کے نصب العین کے حاصل کرنے میں مشغول رکھتی اور گزشتہ تجربوں کو یاد دلاتی ہوئی اس کو اپنے قدیم آزمودہ طریقہ کار کے مطابق آیندہ کے لئے تیار کرتی ہے۔

لوگ اپنی طبیعت میں سکون اور استحکام پیدا کرنے کے لئے اپنی یادداشتوں سے جو کام لیتے ہیں۔ وہ ہم پر روزانہ ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کسی معاملہ میں ناکامی ہوتی اور اس سے اس کی طبیعت ہیٹی ہو جاتی ہے تو اسے اس کی گزشتہ ناکامیاں یاد آجاتی ہیں۔ اگر وہ غمگین اور اداس ہو جاتا ہے تو اسے گزرے

ہوئے غم کی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب وہ خوش وخرم رہتا ہے تو دل میں قوت محسوس کرتا اور اس وقت اس کے سامنے دل خوش کن اور ہمت افزا یادداشتیں آکھڑی ہوتی ہیں اور اس کی مسرت اور رجائیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ جب کبھی اس کا مقابلہ کسی مشکل مسئلہ سے ہو جاتا ہے تو اس کے حل کرنے کے لئے وہ اپنی یادداشتوں سے مدد لیتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

یادداشتیں ایک طرح سے وہی کام دیتی ہیں جو خواب دیتے ہیں۔ اکثر افراد جب انھیں اہم معاملات میں تصفیہ کرنا پڑتا ہے تو وہ خواب میں ان امتحانات کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے کامیاب کر لیئے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی طبیعت میں وہی بات یا کیفیت پیدا کر لیں جو سابق میں ان کی کامیابی کا باعث ہوئی۔ کسی فرد کا طرز زندگی قائم ہو جانے کے بعد اس کی طبیعت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ عام طور پر ہر وقت اس میں پائی جاتی ہیں۔

ایک مالیخولیا کے مریض کو ہمیشہ اداس رہنے کی ضرورت نہیں اگر وہ اپنی زندگی کے اچھے دنوں اور کامیابیوں کو یاد کرلے تو طبیعت کی افسردگی اور اداسی دور ہو جائے گی۔ وہ ہمیشہ یہ نہ سوچتا رہے کہ میں زندگی بھر ایک بدقسمت شخص رہا اور اپنی زندگی کے صرف ان واقعات کو یاد نہ کرتا رہے جن میں وہ ناکامیاب رہا۔

یادداشتیں طرز زندگی کے مطابق ہوتی ہیں

ہر شخص کی یادداشتیں اس کے طرز زندگی کے مطابق ہوتی ہیں اس کے خلاف نہیں ہوتیں مثلاً کسی شخص کا نصب العین برتری اگر اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اس کو ذلیل کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ زندگی کے ان واقعات اور مواقع کو یاد رکھتا ہے جن میں اس کی تذلیل کی گئی تھی اور یہی اس کی اہم یادداشتیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر اس کا طرز زندگی بدل جائے تو اس کی یادداشتیں بھی بدل جاتی ہیں۔ پہلی یادداشتیں ذہن سے غائب ہو جاتی اور دوسری ان کی جگہ لیتی ہیں۔ اگر پہلی باقی بھی رہتی ہیں تو یہ ان کی دوسری تعبیر کرتا ہے۔

بچپن کی یاد داشتیں

بچپن کی یاد داشتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں سب سے پہلے تو ان سے ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی شخص کا طرز زندگی کن ابتدائی بنیادوں پر قایم ہوا پھر ان یاد داشتوں سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا یہ شخص بچپن میں بے جا لاڈ پیار کے ذریعہ بگاڑ دیا گیا تھا یا اس سے غیر معمولی غفلت کی گئی اور لاپروائی برتی گئی تھی۔ تعاون کے لیئے اس نے کس حد تک تربیت پائی۔ زندگی کے کن کن مسائل سے اسے دوچار ہونا پڑا اور اس نے انہیں کس طرح حل کیا۔

ایک ایسے بچے کی جو ضعف یا خرابی بصارت میں مبتلا رہا ہو اور اپنی حالت پر غور کرتے رہنے کا عادی ہو گیا ہو یاد داشتوں میں ہم پائیں گے کہ وہ بصری حیثیت کی یا دوسرے الفاظ میں بصارت سے متعلق ہوتی ہیں مثلاً وہ اپنی یاد داشتیں اس طرح بیان کرے گا میں نے اپنے اطراف نظر ڈالی اور دیکھا" یا وہ اشیاء کے رنگ اور ان کی اشکال بتائے گا۔ ایک دوسرا ایسا بچہ جو چلنے پھرنے کی دشواری رکھتا ہو۔ اور اس کی خواہش رہی ہو کہ اچھی طرح چلے یا دوڑے کودے پھاندے تو اس بچے کی یاد داشتوں میں ان ہی امور سے دلچسپی پائے جائیگی۔

کسی شخص کی بچپن کی یاد داشتوں کا تعلق اس کی ایک خاص دلچسپی یا شوق سے ہوتا ہے پس اگر ہم یاد داشتوں کے ذریعہ اس کی خاص دلچسپی یا شوق معلوم کر لیں تو پھر ہم کو اس کا نصب العین زندگی معلوم ہو جاتا اور اس کے طرز زندگی کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بچپن کی یاد داشتیں نوجوانوں کو پیشوں کے متعلق رہنمائی کرنے میں بے حد مدد دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان یاد داشتوں کے ذریعہ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ بچے کے تعلقات ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کے ساتھ کیسے رہے۔

یاد داشتیں کس طرح بیان کی جائیں

یہ ضروری نہیں کہ یاد داشتیں بالکل صحیح طور پر ٹھیک ٹھیک ہی ہم سے بیان کی جائیں لیکن یہ ضروری ہے کہ

اس طرح بیان کی جائیں کہ بیان کرنے والے کا حقیقی خیال یا رائے کسی چیز یا کسی معاملہ کے متعلق معلوم ہو جائے مثلاً وہ کہے کہ "میں بچپن میں ایسا تھا۔ میری حالت یہ تھی" یا کہے کہ "میں نے بچپن میں دنیا کی یہ حالت دیکھی۔"

کسی فرد کی شخصیت اور اس کی حالت پر سب سے زیادہ روشنی اس کی ابتدائی بچپن کی یادداشتوں کے بیان کرنے کے طریقہ سے پڑتی ہے یعنی یہ کہ وہ ان یادداشتوں کو کس طرح بیان کرنا شروع کرتا ہے اور کن کن واقعات کو یاد کر کے دہراتا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس کی پہلی یادداشت سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کی زندگی کا اصلی اور بنیادی نصب العین کیا ہے اور نوع انسان کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہے اور ایک نظر میں ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس مرکز یا نقطے سے وہ اپنی نشو و نما کے راستہ پر چلنا شروع کیا۔

میں کبھی کسی فرد کی شخصیت کے متعلق چھان بین اس وقت تک شروع نہیں کرتا جب تک کہ اس کی بچپن کی یادداشتوں کے متعلق اس سے سوالات نہ کر لوں بعض دفعہ بعض لوگ واقعات برابر بیان نہیں کر سکتے یا کہتے ہیں کہ "انھیں یاد نہیں آتا کہ کونسا واقعہ بچپن میں سب سے پہلے واقع ہوا جو وہ بطور یادداشت بیان کریں"۔ ان لوگوں کے اس قسم کے جوابات سے خود ان کی حالت پر روشنی پڑھ جاتی ہے۔ اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اصلی اور بنیادی مقصد زندگی کے متعلق کسی سے گفتگو کرنا ہی نہیں چاہتے اور یہ کہ کسی قسم کے تعاون کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

عام طور سے تو لوگ خوشی سے اپنی ابتدائی یادداشتیں بیان کرتے ہیں اور ان میں جو معنی پنہاں ہیں انھیں سمجھنے کے بغیر محض بطور واقعات بیان کر دیتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو سمجھ سکتا ہو کہ اس کی یادداشتیں کیا معنی رکھتی ہیں اور ان سے اس کی حالت اور شخصیت پر کس طرح روشنی پڑتی ہے لہذا اکثر لوگ بلا تکلف اپنی یادداشتیں بیان کر دیتے اور ہم پر اپنا نصب العین زندگی۔ ان کے دوسروں سے تعلقات کا حال اور ماحول کے متعلق اپنے خیالات ظاہر

کر دیتے ہیں۔

یادداشتیں تحقیق کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

دوسری دلچسپ چیز ان یادداشتوں کے متعلق یہ ہے چونکہ یہ مختصر ٹھوس اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اس لئے ہم ان کو عام تحقیقات کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ ہم مدرسہ کی کسی جماعت کے بچوں کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے بچپن کی یادداشتیں لکھیں ان یادداشتوں کی تعبیر سے اگر ہم واقف ہوں تو پھر ان سے ہر ایک بچے کی نفسیاتی حالت کی تصویر ہمارے سامنے کھنچ جائیگی۔

بچپن کی یادداشتوں کی مثالیں

اب میں چند مثالیں ابتدائی بچپن کی یادداشتوں کے دیتا اور ان کی تشریح کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ جن کی یادداشتیں میں بیان کر رہا ہوں ان سے میں مطلق واقف نہیں ہوں بلکہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اس وقت بڑے ہو گئے ہیں یا بچے ہیں۔ ان یادداشتوں سے جو معنی ہم نکال لیتے ہیں یہ صحیح ہیں یا غلط ہیں معلوم کرنے کے لئے ان یادداشتوں کو بیان کرنے والوں کی شخصیت کے کئے علامات پر غور کرنا ضروری ہے تاہم ان معنی سے ہم بہت کچھ مشق حاصل کر سکتے اور قیاس آرائی کی صلاحیت کو ترقی دے سکتے ہیں۔ ان 'معنیٰ' سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ ایک یادداشت کا دوسری سے مقابلہ کر سکتے اور خاص کر یہ معلوم کر لے سکتے ہیں کہ یادداشت بیان کرنے والے نے 'تعاون' کی تربیت پائی ہے یا اس کا مخالف ہے۔ وہ باہمت اور اور مستقل مزاج ہے یا پست ہمت اور متلون۔ وہ دوسروں کی نگرانی اور مدد کا طالب ہے یا اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے والا اور آزاد منش ہے۔ وہ کچھ دینے کے لئے بھی آمادہ ہے یا صرف 'لینے' کا عادی ہے۔

(مثال نمبر ۱) ایک عورت کی بچپن کی یادداشت یوں شروع ہوتی ہے۔ کہتی ہے:۔ "چونکہ میری بہن ...." یہاں غور طلب یہ ہے کہ اس یادداشت میں اس نے کن لوگوں کو یاد رکھا جیسے ہی اس نے اپنی بہن کا ذکر شروع کیا ہم سمجھ گئے کہ اس پر بہن کا بہت اثر پڑا اور اس بہن نے بچپن میں اس کی نشوونما میں

کیڑ لگا دیا۔ عام طور سے دو بچوں میں رقابت ہوتی ہے ایسا کہ وہ ایک دوڑ میں مقابلہ کر رہے ہیں اور یہ رقابت ان کی نشو ونما میں ایک رکاوٹ ہوتی اور مشکلات پیدا کرتی ہے۔ وہ بچہ جو رقابت میں گرفتار رہتا ہے دوسروں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اور نہ دوسروں سے تعاون اور دوستی کر سکتا ہے۔ اس مثال میں ہم جلد بازی سے ابھی کوئی نتائج نہیں نکالیں گے اور یہ فرض کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے کہ یہ کہنے والی اور اس کی بہن آپس میں اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

(سلسلہ یاد داشت) "چونکہ میری بہن اور میں گھر میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے والدین نے تصفیہ کیا کہ مجھے مدرسہ میں اس وقت تک شریک نہ کریں گے جب تک کہ میری چھوٹی بہن بڑی ہو کر مدرسہ جانے کے قابل ہو جائے۔"

اس بیان سے رقابت ظاہر ہوتی ہے اور اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ گویا وہ کہہ رہی ہے کہ میری چھوٹی بہن میری ترقی میں رکاوٹ کا باعث ہوئی۔ اگرچہ کہ وہ مجھ سے چھوٹی تھی لیکن اس کی خاطر مجھے انتظار کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس نے میری ترقی کے امکانات کو محدود کر دیا۔ اگر اس یادداشت کے یہ معنی صحیح تصور کر لئے جائیں تو پھر ہم کو لازماً یہ توقع کرنی پڑے گی کہ یادداشت بیان کرنے والا خواہ لڑکی ہو یا لڑکا اپنے دل میں محسوس کرتا ہوگا کہ کسی شخص کا میری نشوونما اور ترقی میں مانع ہونا۔ اس میں رکاوٹیں پیدا کرنا میرے لئے سخت خطرناک ہے۔ یہ یادداشت (جو ہم بیان کر رہے ہیں) ممکن ہے کہ لڑکی کی ہو اس لئے کہ ایک لڑکے کو چھوٹی بہن کی خاطر مدرسہ سے روک رکھنا قرین قیاس اور ممکن نہیں۔

(سلسلہ یادداشت) "حسب تصفیہ والدین ہم دونوں ایک ہی دن مدرسہ میں شریک کئے گئے اور تعلیم شروع کی"۔ ہم اس چیز کو لڑکی کے لئے کوئی اچھی تعلیم نہیں سمجھتے اس لئے کہ اس سے لڑکی کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے کا امکان ہے کہ چونکہ میں بڑی ہوں اس لئے مجھے ہمیشہ ہر بات میں پیچھے رہنا چاہئے۔ یادداشت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس لڑکی نے تو کم سے کم یہی معنی سمجھے اور یہی محسوس کیا کہ

چھوٹی بہن کی خاطر اس سے بے التفاتی کی گئی۔ اب اس غفلت اور بے التفاتی کے متعلق وہ کسی کو ملزم قرار دے گی اور وہ یقیناً اس کی ماں ہوگی اور یہ لڑکی یقیناً اپنے باپ کی طرف زیادہ مائل ہوگی اور خود کو اس کی لاڈلی بنانے کی کوشش کی ہوگی۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے خوب یاد ہے کہ اماں نے گھر میں ہر ایک کو کہا کہ جب ہم پہلے روز مدرسہ گئے تو انھوں نے بے حد تنہائی محسوس کی اور دوپہر میں گھر سے بار بار باہر نکل کر ہمارے گھر آنے کا انتظار کیا اور خیال کرتی رہیں کہ ہم گھر واپس ہی نہ ہونگے" یہاں ماں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کی یہ حرکت عقلمندی پر مبنی نہ تھی۔ یہ وہ تصویر ہے جو لڑکی نے ماں کی کھینچی ہے۔ ماں کے ان الفاظ سے کہ "اس نے خیال کیا لڑکیاں واپس نہ آئیں گی" لڑکیوں سے ماں کی محبت ظاہر ہوتی ہے اور لڑکیاں اس محبت سے واقف تھے لیکن ساتھ ہی ماں متفکر اور پریشان بھی تھی۔ اگر ہم اس لڑکی سے (جس کی یادداشت بیان کی جا رہی ہے) گفتگو کریں تو ہم کو اور ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی جس سے اس کی ماں کا اس کی چھوٹی بہن کو اس سے زیادہ محبت کرنا ثابت ہو جائے گا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اس لئے کہ عام طور پر سب سے چھوٹے بچے کو زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا ہے۔

اس یادداشت سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ بڑی بہن نے محسوس کیا کہ چھوٹی بہن کی رقابت کی وجہ سے اس کے ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ آگے چل کر اس لڑکی کی طبیعت میں حسد کا مادہ اور مقابلے کا خوف پیدا ہو گیا ہوگا اس کے دل میں اپنے سے کم عمر عورتوں سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو گئی ہوگی۔ بعض لوگ خود کو ہمیشہ بوڑھا سمجھتے ہیں اور اکثر حسد و رشک کرنے والی عورتیں دوسری کم عمر عورتوں سے خود کو کم تر محسوس کرتی ہیں۔

مثال نمبر ۲ یہ یادداشت ایک لڑکی نے لکھی ہے۔ لکھتی ہے۔: "میری سب سے پہلی اور ابتدائی یادداشت میرے دادا کی موت اور اس کی تجہیز و تکفین کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں تین برس کی تھی۔"

یادداشت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موت کا اس پر بہت اثر ہوا اور یہ کہ اسے موت سے اپنی زندگی کی ناپائداری کا پتہ چل گیا اور وہ موت کو اپنے لئے بیحد خطرناک چیز سمجھنے لگی۔ بچپن میں جو یہ واقعہ اس پر گزرا تو اس نے نتیجہ نکالا کہ "دادا مر سکتا ہے۔" ممکن ہے کہ یہ لڑکی اپنے دادا کی چہیتی ہو اور اس نے اسے لاڈ و پیار میں بگاڑ دیا ہو۔ عام طور پر دادا اور نانا اپنے پوتوں اور نواسوں کو لاڈ میں بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ لوگ بچوں کی پرورش کے اتنے ذمہ دار نہیں ہوتے جتنے کہ والدین ہوتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو اپنے سے مانوس کرلیں اور ان پر ظاہر کریں کہ یہ انھیں بہت چاہتے ہیں۔ ہمارے تہذیب ایسی ہے کہ اس میں بڑے بوڑھوں کی قدر اور اہمیت ایسی نہیں رہی جیسا کہ چاہیئے اس لئے یہ لوگ بعض آسان طریقوں سے اپنی قدر وقیمت اور اہمیت منوا لیتے ہیں مثلاً گلے شکوے کرکے یا چڑچڑاپن ظاہر کرکے

اس یادداشت سے ہم سمجھتے ہیں کہ دادا نے لڑکی کو جب وہ کم عمر تھی اس قدر لاڈ و پیار کیا کہ وہ اس سے بہت مانوس ہو گئی۔ جب وہ مر گیا تو اس کو بڑا صدمہ ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کا ناز بردار اور ایک سچا دوست اس سے چھین لیا گیا۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے دادا کو صندوق میں چپ چاپ لیٹا ہوا دیکھا جس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا۔"

بچوں کو میت نہ بتانا چاہیئے

میرے خیال میں ایک تین سال کے بچے کو مردے کو دکھانا کوئی اچھی بات نہیں اگر بتانا ہی ہو تو بچے کو پہلے سے اس کے لئے تیار کر دینا چاہیئے۔ مجھے کئی بچوں نے بتایا ہے کہ مردوں کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے اور وہ مناظر کبھی بھول نہ سکے۔ یہ لڑکی بھی بظاہر نہیں بھولی۔ ایسے بچے ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ موت کے خطرے کو اپنے سے دور کریں یا کم کریں بس ان بچوں کی خواہش اور آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ ڈاکٹر بنیں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر بہ نسبت دوسروں کے موت کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر ہم کسی ڈاکٹر سے کہیں کہ وہ اپنی ابتدائی بچپن کی یادداشت بیان کرے تو وہ موت سے متعلق کچھ نہ کچھ

ضرور رکھے گا۔

اس لڑکی کے ان الفاظ سے کہ "صندوق میں دادا کو چپ چاپ لیٹا ہوا دیکھا جس کا چہرہ بالکل سفید ہو گیا تھا" ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑکی بصری قسم (یعنی اشیاء کو غور سے دیکھنے والی) کی تھی اور دنیا کی مختلف چیزوں کو دیکھنے کی اشتیاق تھی۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے یہ بھی خوب یاد ہے کہ جب میت کا صندوق قبر میں اتار دیا گیا تو اس کے نیچے کے تسمے باہر کھینچ لئے گئے"۔ یہ لڑکی پھر ایک چیز بیان کرتی ہے جو اس نے دیکھا اور اس سے ہمارے اس قیاس کی کہ وہ بصری قسم کی ہے توثیق ہوتی ہے۔

(سلسلہ یادداشت) "اس منظر سے مجھ پر اس قدر خوف اور دہشت طاری ہوئی کہ اس وقت سے مجھے ان عزیزوں۔ دوستوں اور ملاقاتیوں کے جو اس دنیا کی زندگی چھوڑ کر اس کے بعد کی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں نام تک زبان پر لانا گوارا نہیں ہوتا تھا۔"

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس لڑکی کے دل پر موت کا زبردست اثر ہوا۔ مجھے اس لڑکی سے ملنے کا اگر موقع ملتا تو میں اس سے پوچھتا کہ تم آیندہ زندگی میں کیا پیشہ اختیار کرنا چاہتی ہو اور یقیناً وہ جواب دیتی کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ اگر وہ کچھ جواب نہ دیتی، اور ٹال دینا چاہتی تو میں خود بطور تحریک اس سے کہتا کہ کیا تم ڈاکٹر یا نرس بننا پسند کرو گی؟۔

لڑکی کے اس بیان سے کہ "اس دنیا کی زندگی چھوڑ کر اس کے بعد کی زندگی میں داخل ہو گئے" ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ موت کے خوف کے لئے وہ ایک معاوضہ قرار دے رہی ہے۔ (یعنی دل کو سمجھا رہی ہے کہ دنیوی موت کے بعد پھر دوسری زندگی ہے)۔

اس لڑکی کی یادداشت سے جو باتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:- یہ کہ

(الف) اس کا دادا اس کو بہت چاہتا تھا۔

(ب) وہ بصری قسم کی لڑکی تھی (یعنی ہر چیز کو غور سے دیکھنے والی)

(ج) موت کا اثر اس کے دل پر بہت ہوا۔

ان امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی نے زندگی کے معنی یہ سمجھے کہ "ہم سب مرنے والے ہیں اور ہم سب کو بالآخر مرنا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ اس لڑکی نے جو معنی سمجھے وہ صحیح ہیں کہ ہم سب کو مرنا ہے لیکن دنیا میں ہر شخص کو موت سے اس قدر دلچسپی نہیں ہوتی جتنی اس لڑکی نے ظاہر کی۔ دنیا میں متعدد مشاغل اور مسائل ایسے ہیں جن کی انجام دہی میں ہم خود کو مصروف کر سکتے ہیں۔

مثال نمبر ۳ ایک لڑکی اپنی یادداشت اس طرح شروع کر دیتی ہے۔ "جب میں تین سال کی تھی تو میرا باپ .... اس یادداشت میں شروع میں باپ کا ذکر آیا اس سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ لڑکی ماں کی بہ نسبت باپ سے زیادہ مانوس تھی حالانکہ باپ سے انست بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ ہر ایک بچہ ابتداً ماں سے مانوس رہتا ہے اس لئے کہ پیدائش سے دو سال تک بچے کی زندگی ماں کی گود اور نگرانی میں بسر ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ بچہ ماں کا محتاج رہتا ہے اس لئے اس سے ہل جاتا ہے اور اس کی تمام نفسیاتی کوششیں ماں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اگر بچہ ماں کو چھوڑ کر باپ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ماں ہار گئی۔ بچے کو ماں کے سلوک سے اطمینان نہیں رہا اور ایسا عام طور پر اسی وقت ہوتا ہے جب دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس یادداشت میں بھی یہی چیز پاتے ہیں۔ اس یادداشت کو بیان کرنے والی لڑکی کو اگر ہم بڑی بہن سمجھیں تو ہمارا قیاس درست نکلے گا۔

(سلسلہ یادداشت) "میرے باپ نے ہمارے لئے دو ٹٹو خریدے۔" ظاہر ہو گیا کہ ایک سے زیادہ بچے ہیں اور یہ کہ دوسرے بچے کے متعلق آگے چل کر اس یادداشت میں روشنی پڑے گی۔

(سلسلۂ یادداشت) "ہمارا باپ (ٹٹوؤں) کو باگ ڈور باندھ کر گھر لایا اور میری بہن جو مجھ سے تین سال بڑی تھی ......"

ہمارا خیال تھا کہ یہ لڑکی بڑی ہوگی لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ بیان بالا سے ظاہر ہوا کہ وہ تین سال چھوٹی ہے۔ ممکن ہے کہ بڑی لڑکی ماں کی چہیتی ہو اس لئے اس لڑکی نے باپ کا ذکر کیا اور ٹٹوؤں کا بطور تحفہ دینا بیان کیا۔

(سلسلۂ یادداشت) "میری بہن اپنے ٹٹو کی باگ ڈور پکڑ کر اس کو فخریہ طور پر گلی میں لے گئی"۔ یہاں بڑی بہن کی کامیابی اور فخر کرنے کا ذکر کرنا ناظرین نوٹ کر لیں۔

(سلسلہ یادداشت) "میرا ٹٹو بہن کے ٹٹو کے پیچھے اس تیزی سے بھاگا کہ میں اس کو سنبھال نہ سکی اور اس نے مجھے منہ کے بل کیچڑ میں گرا دیا اور میری خوش آئند امیدیں مٹی میں مل گئیں بہن جیت گئی۔ کامیاب ہوگئی"۔ اس بیان سے ہم بلاشک اور شبہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں اس لڑکی کے دل و دماغ میں یہ بات سما گئی ہوگی کہ آئندہ میں احتیاط نہ کروں تو میری بڑی بہن ہر معاملہ میں مجھ سے بازی لے جائے گی۔ میں ہمیشہ شکست کھاتی اور دلدل میں پھنسی رہوں گی۔ میری سلامتی اسی میں ہے کہ میں بہن پر سبقت لے جاؤں۔ اور اس یادداشت سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بڑی بہن ماں کی چہیتی تھی۔ اس لئے یہ باپ سے مانوس ہوگئی۔

(سلسلہ یادداشت) "اگرچہ آگے چل کر میں گھوڑے کی سواری میں بہن سے بہت بہتر ہوگئی لیکن باوجود اس کے پہلی ناکامی کا خیال میرے دل سے دور نہیں ہوا۔" لڑکی کے اس بیان سے ہمارے تمام مفروضات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں بہنوں کے درمیان مسلسل مقابلہ رہا۔ چھوٹی بہن سمجھتی رہی کہ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہوں اس لئے مجھے کوشش کر کے آگے نکل جانا چاہیئے۔ دوسروں سے بڑھ جانا چاہیئے۔ اس قسم کی ذہنیت اکثر دوسرے نمبر کے یا سب سے چھوٹے بچوں میں پائی جاتی ہے یہ لوگ اپنے لئے ایک رفتار نما مقرر

کر لینے اور اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس لڑکی کی یادداشت سے اُسے اپنے طرز زندگی پر قایم رہنے کی تائید ہوتی رہتی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے دل میں کہتی رہتی ہے "اگر مجھ سے کوئی آگے بڑھ جائے تو میرے لئے خطرہ ہے۔ مجھے سب سے پہلے رہنا چاہیئے۔"

(مثال نمبر ۴) "میری ابتدائی یادداشتیں یہ ہیں کہ میری سب سے بڑی بہن جو مجھ سے ۱۸ سال بڑی تھی مجھے پارٹیوں اور سماجی جلسوں میں ساتھ لے جایا کرتی تھی۔" اس لڑکی کو ایک ایسا واقعہ یاد رہا جس کا تعلق سماج سے ہے لہذا ممکن ہے کہ آگے چل کر ہم اس لڑکی کو بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ 'تعاون' کرنے والی پائیں۔ اس کی بڑی بہن اس کے لئے ماں کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اس نے اسے بہت لاڈ و پیار سے بگاڑ دیا تھا لیکن ساتھ ہی ایک عمدہ طریقہ سے اس میں دوسروں سے دلچسپی رکھنے کا مادہ پیدا کر دیا۔

(سلسلہ یادداشت) "چونکہ میرے پیدا ہونے سے قبل میری بہن چار بھائیوں میں ایک ہی لڑکی تھی اس لئے مجھے بہت چاہتی تھی اور ہمیشہ مجھے چار چاند لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتی تھی۔"

تعریفیں انسان کے اخلاق کو بگاڑ دیتی ہیں

اس بیان سے ہمارے پہلے خیال کی کہ اس میں 'تعاون' کا مادہ ہوگا تردید ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جس بچے کی ہمیشہ تعریفیں کی جاتی ہیں اور اس کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ خوشامد پسند ہو جاتا ہے نہ کہ دوسرے سے تعاون کرنے والا اور دوسروں کی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔

(سلسلہ یادداشت) "بڑی بہن ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی حالانکہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ان پارٹیوں کے متعلق مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری بہن مجھے باتیں کرنے پر مجبور کرتی تھی مثلاً کہتی کہ اپنا نام کہو وغیرہ۔"

بچوں کو باتیں کرنے کے لئے مجبور نہ کرنا چاہیئے

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ بڑی بہن نے

اس کی تعلیم کا غلط طریقہ اختیار کیا۔ ہمیں یہ معلوم کرکے مطلق تعجب نہ ہوگا کہ یہ لڑکی ہکلاتی ہوگی یا بات برابر نہ کرسکتی ہوگی۔ جب کسی بچے کے باتیں کرنے پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی جاتی اور اہمیت دی جاتی ہے تو عام طور وہ بچہ ہکلانے لگتا ہے اس لئے کہ بچے کو فطری طور پر اپنے خوشی سے باتیں کرنے دینے کی عوض اسکو وقتاً فوقتاً مجبور کیا گیا کہ باتیں کریں اور اس طرح اس کو خود آگاہ کردیا گیا اور تعریف پسند بنادیا گیا۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں کچھ بات نہ کرتی تھی اور گھر واپس آنے کے بعد مجھے سخت سست۔ برا بھلا کہا جاتا تھا جس کا بتدریج نتیجہ یہ ہوا کہ کہیں جانے اور لوگوں سے ملنے سے مجھے سخت نفرت ہوگئی۔"

اب ہم کو معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی یادداشت کی تعبیر یہ ہے کہ گویا وہ کہتی ہے "میں لوگوں سے ملتی جلتی تھی لیکن تلخ تجربوں کی وجہ میں اس کو ناپسند کرنے لگی اور بالآخر اس قسم کے 'تعاون' سے متنفر ہوگئی۔"

ہمارا خیال ہے کہ یہ لڑکی بڑی ہوکر بھی لوگوں سے ملنا پسند نہ کرتی ہوگی۔ اگر ملتی بھی ہوگی تو اس تصور کے ساتھ کہ وہ محفل میں خود کو برتر اور ممتاز ثابت کرے اور جب ایسا نہ کرسکتی ہوگی تو خود آگاہ اور پریشان ہوجاتی ہوگی۔ اس لڑکی نے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ برابری اور اطمینان کے ساتھ ملنے کا خود کو عادی نہیں کیا۔

(مثال نمبر ۵) ایک لڑکی کہتی ہے کہ "مجھے میری کم سنی کا ایک اہم واقعہ یاد ہے وہ یہ کہ جب میں چار سال کی تھی تو میری پڑنانی ملنے آئی"۔ ہم جانتے ہیں کہ نانی یا دادی بچوں کو لاڈ کرکے خراب کردیتی ہے لیکن ہمیں اب تک معلوم نہ تھا کہ پڑنانی کا بچوں سے کیا سلوک ہوسکتا ہے۔

(سلسلہ یادداشت) "جب وہ ہمارے گھر میں تھی تو ہماری چار پشتوں (پیڑیوں) کی تصویر لی گئی"۔ اس بیان سے ظاہر ہوا کہ لڑکی کو اپنے خاندان سے بہت دلچسپی ہے کیونکہ اس نے اپنی پڑنانی کا گھر آنا اور تصویر کا لیا جانا خوب یاد رکھا۔ اس سے

ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ اپنے گھروالوں سے بہت وابستہ ہو گی۔ اگر ہماری یہ تعبیر صحیح ہو تو پھر ہمیں معلوم ہوگا کہ اس لڑکی کی تعاون اور ملنے جلنے کی صلاحیت اس کے گھروالوں تک محدود ہو گی۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے خوب یاد ہے کہ میں سفید رنگ کے کشیدہ نکلے ہوئے کپڑے پہن کر دوسرے شہر کو فوٹوگرافر کے پاس گئی تھی۔"

چونکہ سفید رنگ کے کپڑوں کا اس لڑکی نے ذکر کیا اس لئے ممکن ہے کہ یہ بصری قسم کی لڑکی ہو۔

(سلسلہ یادداشت) "ہمارے چار پشتوں کی تصویر لینے سے قبل میری اور میرے بھائی کی تصویر لی گئی۔" اس بیان سے پھر لڑکی کی اپنے گھروالوں سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا بھائی اس کے خاندان یا گھر کا ایک فرد ہے ممکن ہے کہ اس کے متعلق لڑکی سے ہم اور کچھ باتیں سنیں۔

(سلسلہ یادداشت) "میرے بھائی کو میرے بازو کرسی کے ہاتھ پر بٹھایا گیا اور اس کو ایک گہرے سرخ رنگ کا گیند دیا گیا۔" اس بیان میں بھی لڑکی نے ایک سرخ چیز کا ذکر کیا۔

(سلسلہ یادداشت) "مجھے کرسی کے بازو کھڑا کر دیا گیا اور کوئی گیند نہیں دی گئی۔"

اس بیان سے ہم پر یہ راز کھل گیا کہ لڑکی کے دل میں کیا گزر رہا ہے۔ وہ دل میں گویا کہہ رہی ہے کہ میرے بھائی کو مجھ پر ترجیح دی گئی۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس لڑکی کو اس کے چھوٹے بھائی کا پیدا ہونا اور اس کی جگہ گھر میں لے کر اس کو لوگوں کے لاڈ و پیار اور توجہات سے محروم کر دینا ناگوارا ہوتا ہوگا۔

(سلسلہ یادداشت) "ہم دونوں کو کہا گیا کہ ہم مسکرائیں" لڑکی نے صرف اتنا کہہ دیا لیکن درحقیقت اس کا مطلب یہ کہ "میرے بزرگوں نے جو ساتھ تھے اصرار کیا کہ میں مسکراؤں لیکن میں کس بات پر مسکراتی انھوں نے میرے بھائی کو تو اچھی جگہ بٹھایا اور سرخ گیند دیا لیکن مجھے کیا دیا؟"

(سلسلہ یادداشت) "اس کے بعد چار پشتوں کی تصویر لی جانے لگی۔ ہر رکن خاندان

کی کوشش تھی کہ تصویر میں اچھا نظر آئے لیکن میں نہیں مسکرائی۔" (اس بیان سے ظاہر ہوا کہ اب یہ لڑکی اپنے خاندان والوں سے جھگڑنے پر تلی ہوئی ہے اس لئے کہ ان لوگوں نے اس سے بُرا سلوک کیا۔ یہ لڑکی اپنی اس یادداشت میں ہم پر ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اس کے بزرگوں کا اس کے ساتھ کیا سلوک تھا۔

(سلسلہ یادداشت) "میرا بھائی بڑا چالاک تھا اس کو جب مسکرانے کے لئے کہا گیا تو بڑی اچھی طرح سے مسکرایا۔ اس دن سے مجھے تصویر لینے سے نفرت ہوگئی" اس قسم کی یادداشتوں سے ہم کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم میں سے اکثر افراد زندگی کے کیا معنی سمجھتے ہیں اور کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ زندگی کا صرف ایک ارتسام لے کر ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہم ہمارے سب اعمال و افعال کو حق بجانب ثابت کریں۔ اس ایک ارتسام سے ہم کئی نتائج اخذ کر لیتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس ارتسام کے یہ لازمی نتائج ہیں اور پھر ان نتائج کی روشنی میں عمل کرنے لگتے ہیں۔

اس لڑکی پر بھائی کے ساتھ تصویر لینے کا واقعہ شاق گزرا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب تک تصویر کشی سے نفرت رکھتی ہے۔

عام طور سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو اس ناپسندیدگی کے لئے ایک عذر تراش لیتا ہے یا اپنے پچھلے تجربوں میں سے کوئی بات بطور عذر ڈھونڈ لیتا ہے اور اپنی ناپسندیدگی کو حق بجانب بتانے کے لئے اس کو پیش کرتا رہتا ہے۔

اس لڑکی کی یادداشت سے ہمیں اس کی شخصیت کے متعلق دو باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ بصری قسم کی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے گھر والوں اور اہل خاندان سے بہت وابستہ ہے۔ اس کی پوری یادداشت کا تعلق خاندانی واقعات سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لڑکی سماجی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

(مثال نمبر ۶) "میری بچپن کی یادداشت ایک واقعہ کے متعلق ہے جو مجھ پر ساڑھے تین سال کی عمر میں گزرا۔ ایک لڑکی جو میرے والدین کی ملازمہ تھی ایک روز

مجھے اور میرے چچیرے بھائی کو گھر کے تہ خانہ (سرداب) میں لے گئی اور سائیڈر شراب کا مزہ چکھایا اور وہ ہم کو پسند آئی"۔

بچوں کے لئے یہ معلوم کرنا کہ گھر میں تہ خانہ ہے اور اس میں شراب رکھی گئی ہے دلچسپ تجربہ تھا۔ گویا کہ اس سے نئی چیزوں کی جانچ پڑتال کرنے کا ان کے لئے دروازہ کھل گیا۔ اگر یادداشت کے اتنے ہی جزء سے ہم کو نتائج نکالنا پڑے تو ہم کو حسب ذیل دو نتائج سے کوئی ایک نتیجہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ایک یہ کہ شاید یہ لڑکی نئے حالات کا مقابلہ کرنا پسند کرتی اور زندگی کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے یا اس کے برعکس اس کا خیال ہے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو مجھ سے زیادہ قوت ارادی رکھتے ہیں اور مجھے بہکا کر غلط راستے پر لگا دے سکتے ہیں۔ اب ان دو چیزوں میں سے کونسی چیز اس لڑکی کے دل میں ہے اس کا تصفیہ کرنے میں باقی یادداشت سے ہمیں مدد ملے گی۔

(سلسلہ یادداشت) "تھوڑی دیر بعد میں نے ارادہ کیا کہ میں خود جا کر پھر سائیڈر چکھوں چنانچہ میں گئی اور پینے لگی"۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ یہ لڑکی دلیر ہے اور وہ آزاد رہنا چاہتی ہے۔

(سلسلہ یادداشت) "تہ خانہ میں تھوڑی دور جانے کے بعد میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور میں چل نہ سکی۔ پہلی دفعہ چونکہ ہم نے پیپے میں کی شراب بہتی ہوئے چھوڑ دی تھی اس لئے تہ خانہ کی زمین بھیگ گئی تھی"۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکی نشہ بندی کی حامی ہونے کا میلان رکھتی تھی۔

(سلسلۂ یادداشت) "میں نہیں کہہ سکتی کہ میرا سائیڈر شراب کو اور دوسری نشہ کی چیزوں کو ناپسند کرنا اس واقعہ سے کوئی تعلق رکھتا ہے یا نہیں"۔

زندگی کا ایک معمولی واقعہ انسان کی طرز زندگی کو کس طرح بدل دیتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ اس کی ایک اور مثال ہے۔ اگر ہم ذرا عقل سلیم کے ساتھ غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ

یہ واقعہ اتنا اہم نہ تھا کہ جس سے اس لڑکی نے وہ نتیجہ نکالا (یعنی واقعہ اتنا اہم نہ تھا کہ لڑکی نے اپنا طرزِ زندگی بدل دیا اور ہمیشہ کے لیئے شراب اور نشہ کی چیزوں سے نفرت پیدا کرلی)۔ بہرحال یہ لڑکی اپنی حد تک اسی واقعہ کو نشیات کو ناپسند کرنے کی وجہ قرار دے رکھی ہے۔ غالباً اس کے اور بیان سے ہم معلوم کرسکیں گے کہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنی غلطیوں سے سبق لینا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ حقیقت میں آزاد طبیعت ہو اور جب کبھی کوئی غلطی کرے تو اس کی اصلاح کرلینا اچھا سمجھتی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس کی یہ خصلت (یعنی غلطی کی اصلاح کرلینا) عمر بھر باقی رہے۔ یہ ایسا ہے کہ گویا وہ کہہ رہی ہے کہ "میں غلطیاں ضرور کرتی ہوں لیکن جب میری غلطیاں مجھے معلوم ہوجاتی ہیں تو پھر میں ان کی اصلاح بھی کرلیتی ہوں۔"

اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ لڑکی آیندہ ایک بہت ہی اچھی لڑکی ہوگی جو اپنی زندگی کے مسائل کا مقابلہ دلیری سے کرے گی۔ اپنی حالت کو بہتر کرتی جائیگی۔ اور عمدگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی ہمیشہ تلاش و فکر میں رہیگی۔

ان تمام مثالوں میں (جو ہم نے بیان کئے) سوائے اس کے کہ ہم قیاس آرائی کی مشق کریں اور کچھ نہ کر رہے تھے۔ ہم اپنے اخذ کردہ نتائج کو اس وقت تک صحیح نہیں قرار دے سکتے جب تک کہ ہمیں ان افراد (یعنی جن کی یادداشتیں بیان کی گئیں) کی شخصیتوں کے متعلق مزید علامات معلوم نہ ہوں۔

اڈلر کے مطب کی مثالیں

اب ہم اپنے مطب کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے بعض افراد کی مربوط شخصیتیں اور مکمل علامات معلوم ہونگے۔

(مثال نشان ۱) ایک شخص جس کی عمر ۳۵ سال تھی میرے پاس علاج کے لئے رجوع ہوا۔ یہ اعصاب کی خرابی کی وجہ فکر و پریشانی کی بیماری میں مبتلا تھا۔ جب کبھی وہ گھر سے باہر جاتا مرض کا اس پر دورہ ہوتا۔ اس نے مختلف ملازمتیں کیں لیکن کہیں کبھی ٹک کر نہ رہ سکا۔ اسے جب کبھی کوئی ملازمت ملتی تو وہ آفس جاتا لیکن وہاں تمام دن بیٹھا ہوا کراہتا۔ سرد آہیں بھرتا۔ روتا اور گھر چلا آتا۔ شام میں گھر آکر جب اپنی ماں کے پاس

بیٹھ جاتا تو اس کو سکون ہو جاتا رونا پلانا غائب ہو جاتا۔

جب اس سے کہا گیا کہ بچپن کی سب سے پہلی یادداشت بیان کرے تو اس نے کہا:-

(یادداشت) "مجھے یاد ہے کہ جب میری عمر ۴ سال کی تھی تو ایک روز میں گھر کی کھڑکی میں بیٹھا ہوا راستے پر مزدوروں کو کام کرتے ہوئے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا" اس بیان سے ظاہر ہوا کہ یہ شخص لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے اور خود بیٹھا ہوا تماشہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اب اگر ہم اس کی اصلاح کرنا چاہیں تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ ہم اس کے دل و دماغ سے اس خیال کو دور کر دیں کہ اس میں دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اب تک وہ اس خیال میں مبتلا رہا کہ اس کے لئے دنیا میں زندہ رہنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ اس کی مدد کرتے رہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کا نظریۂ زندگی بدل دیں صرف ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دواؤں یا غدودودوں کے عرق پلا کر ہم اس کو قائل نہیں کر سکتے کہ وہ غلطی پر ہے۔ اس کی یادداشت سے ہم کو اتنی سہولت ہوتی ہے کہ ہم اس کو کوئی ایسا مشغلہ بتا سکتے ہیں جو اس کے لئے باعث دلچسپی ہو۔ یادداشت سے معلوم ہوا کہ اس کو "دیکھتے رہنے" سے حقیقی دلچسپی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا کہ وہ ضعف بصارت میں بھی مبتلا رہا اور اس کمزوری کی وجہ اس نے چیزوں کو غور سے دیکھنے کا خود کو عادی کر لیا۔ جب وہ مسئلہ ملازمت و فکر معاش سے دوچار ہوا تو درعوض کام کرنے کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے دیکھتا ہوا بیٹھنے کو وہ اچھا سمجھا لیکن یہ دو چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

علاج کرنے سے جب وہ اچھا ہو گیا تو اس نے ایک ایسا مشغلہ اختیار کیا جس سے اسے دلچسپی تھی۔ اس نے کاری گری کی دوکان کھول لی اور اسی طرح اپنی قابلیت کے مطابق سماج کو مدد دینے کے قابل ہو گیا۔

(مثال نشان ۳) ایک شخص جس کی عمر ۳۲ سال تھی میرے پاس علاج کے لئے

رجوع ہوا۔ مرض ہسٹریا کی وجہ اس کی بولنے کی قوت متاثر ہو گئی تھی۔ وہ بہت آہستہ اور دھیمی آواز سے بات چیت کرتا تھا اور دو سال سے اس کی یہ حالت تھی۔ ایک روز یہ شخص موز کے چھلکے پر سے پھسل کر ایک ٹکسی کے دروازہ پر جا گرا تھا اور اس روز سے وہ اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ حادثے کے بعد دو روز تک وہ قے کرتا رہا۔ اور اس کے بعد اس کو آدھے سر کے درد کی بیماری ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ گرنے کے بعد اس کے دماغ کو سخت صدمہ پہونچا تھا لیکن اس کے حلق میں کوئی خرابی نہ تھی لہذا دماغی صدمہ کا اثر قوت گویائی پر پڑنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی بتایا گیا کہ حادثہ کے بعد آٹھ ہفتوں تک وہ بات نہ کر سکا بالکل گونگا سا ہو گیا تھا۔

اس حادثے کو گذر کر اگرچہ عرصہ گذر چکا لیکن ابھی مقدمہ عدالت میں جاری ہے اس مریض نے ٹکسی چلانے والے کو حادثہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کمپنی پر ہرجانہ کا دعویٰ کیا۔ ان واقعات کے علم کے بعد ہم یہ سمجھ گئے کہ اگر وہ خود کو کسی نہ کسی قسم سے معذور بنائے رکھے تو مقدمہ اس کے موافق تصفیہ پانے میں یہ چیز مفید ہو گی (لہذا وہ ظاہر کرتا ہے وہ آواز سے برابر بات نہیں کر سکتا)۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص بدنیتی سے ایسا کر رہا ہو گا لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب تک اس کے لئے کوئی ایسی زبردست محرک چیز پیدا نہیں ہوئی جو اس کو بلند آواز سے بات کرنے پر مجبور کرتی۔

غالباً حادثے کے بعد صدمے سے بولنا اس کے لئے مشکل ہو گیا ہو گا اور اس حالت کو بدل دینے کے لئے اس نے کوئی قوی وجہ نہیں پائی۔ یہ مریض ماہر امراض حلق کے پاس رجوع کیا گیا لیکن اس نے حلق میں کوئی خرابی نہ پائی۔

اس مریض سے کہا گیا کہ اپنی سب سے پہلی بچپن کی یادداشت بتائے تو کہا:

(یادداشت) "میں ایک دفعہ چت لیٹا ہوا جھولے میں جھول رہا تھا کہ دفعتاً جھولا انکڑے میں سے نکل گیا اور میں گر گیا۔ مجھے بری طرح چوٹ آئی" کوئی بھی گرنا پسند نہیں کرتا لیکن اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ یہ شخص گرنے کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس نے اپنی پوری توجہ گرنے کے خطرات پر لگا دی ہے اور اسی کو

اپنا نصب العین بنا لیا اور اپنی خاص دلچسپی کی چیز تصور کرتا ہے۔

(سلسلہ یادداشت) "جب میں گر پڑا تو کمرہ کا دروازہ کھلا اور میری ماں دہشت زدہ حالت میں کمرہ میں داخل ہوئی۔"

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس نے گرنے کی وجہ اپنی ماں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کر لی لیکن ساتھ ہی اس بیان میں ماں کو ملامت کرنا بھی پنہاں ہے اس نے اگرچہ یہ چیز (صاف الفاظ) میں نہیں کہی لیکن دل میں کہتا ہے کہ "ماں نے میری حفاظت نہیں کی"۔ جیسا کہ اس بچپن کے واقعہ کا وہ ماں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے ویسا ہی ٹیکسی ڈرائیور اور ٹیکسی کمپنی کو اس حادثے کا جو اس پر گذرا باعث قرار دیتا ہے اور گویا کہ کہتا ہے کہ نہ ماں نے احتیاط سے کام لیا اور نہ ٹیکسی چلانے والے نے۔ اس قسم کی ذہنیت اور طرز زندگی لاڈ میں بگڑے ہوئے بچے کی ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتا ہے۔

اس مریض کی دوسری یادداشت بھی یہی کہانی دہراتی ہے۔ کہتا ہے۔ "جب میری عمر ۵ سال کی تھی تو ایک دن میں بیس فٹ کی بلندی سے گرا اور ایک وزنی لکڑی کا تختہ بھی مجھ پر گرا۔ چار پانچ منٹ تک میں مطلق بات نہ کر سکا۔" اس بیان سے ظاہر ہوا کہ یہ شخص اپنی قوت گویائی کھو بیٹھنے میں ماہر ہے۔ اس نے گونگے پن کی خوب مشق کر لی اور گرنے کو اس کا سبب قرار دے رکھا ہے۔ اگرچہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہونا چاہیے لیکن اس کے ذہن میں تو یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ اس چیز کا اس کو کافی تجربہ حاصل ہو گیا ہے اور اب جب وہ گرتا ہے تو خود بخود قوت گویائی غائب ہو جاتی ہے اور وہ بات نہیں کر سکتا۔

اس شخص کا صرف ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ وہ خوب سمجھ لے وہ غلطی پر ہے گرنے سے قوت گویائی کو کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ کہ ٹیکسی پہ گرنے کے حادثے کے بعد دو سال تک زیر لب باتیں کرنے کی اس کو ضرورت نہ تھی۔ اس یادداشت سے ظاہر ہوا کہ کیوں وہ اب تک اپنی غلطی سمجھ نہ سکا۔

(سلسلہ یادداشت) "میری ماں دوڑتی ہوئی آئی اور بیحد پریشان تھی" اس بیان میں اس نے بتایا ہے کہ اس کے گر جانے کی وجہ ماں گھبرا گئی اور فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس سے پتہ چلا کہ اس کی بچپن میں یہی خواہش رہی کہ اسے لاڈ کیا جائے اور وہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مصائب کا کیا معاوضہ چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے لاڈ میں بگڑے ہوئے بچے بھی اگر ان پر اس قسم کے حادثے گذریں تو اسی قسم کی حرکات کریں جیسا کہ اس مریض نے کئے۔ غالباً وہ گونگا پن اختیار نہ کریں گے بلکہ اور کوئی ترکیب اختیار کریں گے۔ قوت گویائی کھو بیٹھنا تو ہمارے اس مریض کی خصوصیت تھی اور اس کی طرز زندگی کا ایک جزء ہو گئی تھی جو اس نے اپنے دیرینہ تجربے کی بناء پر اپنے لئے قرار دے لیا اور اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔

(مثال نشان [illegible]) ایک شخص جس کی عمر ۲۶ سال تھی میرے پاس رجوع ہوا اور شکایت کی کہ وہ کوئی اطمینان بخش کام یا دھندہ جو روزی کا ذریعہ ہو حاصل نہیں کر سکتا۔ آٹھ سال قبل اس کے باپ نے اسے دلالی کے دھندے میں لگا دیا تھا لیکن یہ کام اسے پسند نہیں آیا اور چند روز ہوئے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دوسرے کاموں کو تلاش میں رہا لیکن کہیں بھی اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے بدخوابی کی بھی شکایت کی اور کہا کہ اسے خودکشی کر لینے کا اکثر خیال آتا ہے۔ دلالی کا دھندہ چھوڑنے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا تھا اور ایک دوسرے شہر میں اس کو کچھ کام مل گیا تھا۔ لیکن گھر سے خط آیا کہ اس کی ماں بیمار ہو گئی ہے اس لئے وہ گھر واپس آگیا۔

اس شخص کے حالات سے جو اس نے بیان کئے ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ اس کی ماں نے اسے لاڈ میں بگاڑا اور باپ نے اس پر حکم چلانا چاہا۔ اس کے اور حالات سننے کے بعد غالباً ہم کو معلوم ہوگا کہ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مخالفت اور سرکشی کرتا رہا ہوگا۔ جب اس سے سوال کیا گیا کہ فیاملی میں اس کا مقام کیا ہے تو جواب دیا کہ وہ سب سے چھوٹا اور اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی دو بہنیں تھیں اور یہ اس پر ہمیشہ بیجا اثر اور دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس کا باپ ہمیشہ نکتہ چینی

اور ملامت سے اس کا ناک میں دم کرتا تھا اور یہ شخص یہ محسوس کر کے کہ سوائے ماں کے جو اس پر مہربان رہتی ہے باقی سب گھر والے اس پر چھائے ہوئے ہیں کڑھتا رہتا تھا۔ وہ چودہ سال کی عمر تک مدرسہ جاتا رہا اس کے بعد اس کے باپ نے اسے زراعتی مدرسہ میں شریک کرایا تاکہ یہ اس کی (باپ کی) کھیتی باڑی میں مدد دے سکے۔ چند روز تک اس نے شوق سے اس تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا لیکن پھر اسے خیال پیدا ہوا کہ کسان بننا ٹھیک نہیں اس نے زراعتی مدرسہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد باپ نے اُسے دلالی کے دھندے میں لگایا اور تعجب ہے کہ یہ آٹھ سال تک اس میں مشغول رہا۔ اس شخص کا بیان ہے کہ اس نے ماں کی مدد کرنے کی خاطر ایسا کیا۔ بچپن میں یہ غلیظ و کثیف رہا کرتا تھا۔ ڈرپوک تھا اور اندھیرے سے اور تنہا رہنے سے ڈرتا تھا۔ جب ہم سنیں کہ کوئی بچہ غلیظ رہنے کا عادی ہے تو ہم سمجھ جائیں کہ کوئی اس کو نہلانے دھلانے اور صاف رکھنے والا ہو گا۔ جب ہم سنیں کہ کوئی بچہ اندھیرے اور تنہا رہنے سے ڈرتا ہے تو سمجھ لیں کہ کوئی نہ کوئی ایسا ہے جس کی وہ مدد اور ہمدردی چاہتا ہے۔ اس شخص کے لئے اس کی ماں ہی وہ ہستی تھی (جو اس کے لئے سب کچھ کرتی تھی)۔ لوگوں سے دوستی کرنا اس کے لئے آسان نہیں تھا لیکن جب وہ اجنبی لوگوں کی محفل میں ہوتا تو ملنساری اور بے تکلفی کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے کسی لڑکی سے کبھی عشق و محبت نہیں کی۔ اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی اور نہ اس کے دل میں کبھی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ اس نے اپنے والدین کی ازدواجی زندگی کو ناخوشگوار دیکھا تھا اس لئے شادی کے خیال کو دل سے دور کر دیا۔ اس کا باپ اب تک مصر ہے کہ وہ پھر دلالی کا دھندا اختیار کرے لیکن اس کی خواہش ہے کہ تشہیر یعنی اشتہار دینے کا کام کرے لیکن اسے یقین ہے کہ گھر والے اس کام کی تعلیم پانے کے لئے روپیہ نہ دیں گے۔ جب یہ شخص دلالی کا کام کر رہا تھا تو اس کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ تشہیر کی تعلیم پائے حالانکہ اس وقت یہ اپنی ذاتی آمدنی رکھتا تھا۔ اب یہ بات اس کے ذہن میں محض اس لئے پیدا ہوئی کہ باپ

سے روپیہ وصول کرے۔ اس کی پہلی یادداشت سے ایک لاڈلے بچے کی ایک سخت گیر باپ سے مخالفت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو یاد ہے کہ جب وہ اپنے باپ کے ساتھ مطعم (رسٹورانٹ) میں کام کرتا تھا تو برتن دھونا صاف کرنا اور انھیں میزوں پر جمانا پسند کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ گاہکوں کی گفتگو میں بے موقع دخل دے۔ چنانچہ اسی پر ایک دفعہ باپ نے گاہکوں کے سامنے ہی اس کو طمانچہ مارا۔ اس واقعہ کو یاد رکھنے اور بیان کرنے سے ظاہر ہے کہ وہ باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اس کی تمام عمر اس کی مخالفت میں گزری۔ اس شخص کی مطلق خواہش نہیں کی کہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے باپ کو تکلیف پہونچانا اور دق کرنا اپنے اطمینان خاطر کے لئے کافی سمجھتا ہے۔

خودکشی کا خیال کیوں آتا ہے

اس شخص کو جو خودکشی کا خیال آتا ہے تو اس کی وجہ آسانی سے بتا دی جا سکتی ہے۔ ہر قسم کی خودکشی کا مقصد کسی اور فرد کو ملامت کرنا یا سرزنش کرنا ہوتا ہے پس یہ شخص جب خودکشی کا خیال کرتا ہے تو گویا زبان حال سے کہتا ہے "میری ساری خرابی و بربادی کا ذمہ دار میرا باپ ہے"۔ اس شخص کا کوئی کام نہ کرنا بھی باپ سے مخالفت کی وجہ سے ہے۔ باپ جو بھی منصوبہ اس کے لئے باندھتا ہے اس کو یہ پسند نہیں کرتا اس کو نامنظور کرتا ہے لیکن چونکہ لاڈ سے بگڑ چکا ہے اس لئے اپنے طور پر خود اعتمادی کے ساتھ بھی کچھ کام نہیں کر سکتا۔ درحقیقت یہ شخص کچھ کام کرنا ہی نہیں چاہتا بلکہ صرف بیکاری میں اپنا وقت گذارنا چاہتا ہے۔ البتہ اس کو ماں کا لحاظ ہے اور اس سے کسی قدر تعاون کرتا ہے۔ اب غور طلب یہ ہے کہ اس کی بدخوابی کی کیا وجہ ہے؟ باپ سے مخالفت کو بدخوابی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ (ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ) اگر وہ رات کو سو نہیں سکتا تو دن کو کام کے قابل نہیں رہ سکتا۔ اس کا باپ متوقع رہتا ہے کہ وہ کچھ کام کرے لیکن یہ خستہ رہتا ہے اس لئے کام نہیں کر سکتا گویا کہ وہ کہتا ہے کہ میں کوئی کام کرنا نہیں چاہتا اور نہ کوئی کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہوں۔ اس شخص کو اپنی ماں

اور گھر والوں کی مالی مشکلات کا خیال بھی ہے۔ لہٰذا اگر وہ کام کرنے سے بالکلیہ انکار کر دیتا ہے تو گھر والے اس کو ناکارہ سمجھیں گے اور خود اس کی کفالت چھوڑ دینگے لہٰذا اس کو کام کرنے کے لئے کوئی معقول عذر پیش کرنا چاہیئے پس اس نے بدخوابی کی عام شکایت کا عذر اپنے لئے تراش لیا اور پیش کر دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ آیا اس کو خواب بھی پڑتے ہیں تو اس نے پہلے تو کہا کہ وہ خواب نہیں دیکھتا لیکن بعد اسے یاد آیا کہ ایک خواب اکثر پڑتا ہے۔ یہ خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی شخص دیوار پر گیند پھینکتا ہے اور وہ پلٹ جاتی ہے۔ یہ ایک معمولی خواب ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس خواب میں اور اس کے طرز زندگی میں کوئی تعلق پا سکتے ہیں؟ ہم نے اس سے پوچھا کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے جب گیند دیوار کو لگ کر پلٹتی ہے تو تم کیا محسوس کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جب گیند پلٹتی ہے تو میں بیدار ہو جاتا ہوں۔ اس جواب سے ہمیں اس کی بدخوابی کی وجہ پوری طور پر معلوم ہو گئی۔ یہ شخص اس خواب سے الارم کی گھڑی کا کام لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ہر شخص اس کو آگے بڑھانا چاہتا ہے مجبور کرتا ہے کہ وہ کچھ کام کرے اور یہ ایسا کرنا نہیں چاہتا اس لئے اکثر خواب دیکھتا ہے کہ کوئی دیوار پر گیند پھینک رہا ہے اور بیدار ہو جاتا ہے پھر سوتا نہیں دوسرے دن خستہ رہتا ہے اور کام نہیں کر سکتا۔ اس کے باپ کو فکر رہتی ہے کہ یہ کام کرے اور یہ اس پیچیدہ طریقہ سے باپ کو شکست دیتا ہے۔ اگر یہ معاملہ صرف باپ اور بیٹے کی مخالفت کا ہوتا تو ہم کہتے کہ اس نے باپ کے خلاف حربہ (یعنی بدخوابی) معلوم کر لینے میں بڑی ہشیاری سے کام لیا لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے اس کا طرز زندگی اس کے اور دوسروں کے لئے ناقابل اطمینان اور مضر ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اسے اپنا طرز زندگی بدل دینے میں اس کی مدد کریں۔

جب میں نے اس کے خواب کی وجہ اسے خوب ذہن نشین کرا دی تو پھر اس نے خواب دیکھنا چھوڑ دیا لیکن کہتا ہے کہ اب بھی بعض دفعہ راتوں کو

بیدار ہو جاتا ہے چونکہ اس کو معلوم ہو گیا کہ خواب کی وجہ معلوم کر لی جا سکتی ہے تو اب اس میں ہمت نہیں کہ خواب دیکھے اس لئے یوں ہی ہشیار رہ کر خود کو خستہ کر لیتا ہے تاکہ دوسرے دن کام نہ کر سکے۔ اب بتائیے کہ ہم اس کا کیا علاج کریں؟ اب صرف ایک ہی تدبیر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ باپ بیٹے میں مصالحت کرا دیں۔ جب تک باپ کو دق کرنا اور اس کو مایوس کرنا اس کا نصب العین رہے گا اس کی اصلاح نہ ہو گی۔ اس لئے اب میں نے یوں ابتداء کی اور ہر ماہر نفسیات کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ میں نے مریض سے کہا کہ تمہارے طرز اور طریقہ زندگی میں جو تم نے اختیار کر رکھا ہے معقولیت ہے اور تمہارا باپ غلطی پر ہے۔ تمہارے باپ کا تم کو مجبور کرنا اور ہر وقت تم پر دباؤ ڈالنا عقلمندی پر مبنی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خود بیمار ہو اور علاج کی ضرورت رکھتا ہو لیکن اب سوال یہ ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے؟ تم باپ کی حالت تو بدل نہیں سکتے۔ فرض کرو کہ تم باہر ہو اور بارش ہونے لگتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟ تم یہی کرتے ہو کہ چھتری چڑھا لیتے ہو یا کوئی ٹکسی لیکر اس میں بیٹھ جاتے ہو۔ تم بارش سے لڑ کر یا اس سے مقابلہ کر کے موقوف کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے اب جو تمہارا طرز زندگی ہے وہ ایسا ہے کہ گویا بارش سے مقابلہ کرنا۔ تم اس میں اپنی عمر ضائع کر رہے ہو۔ تم اس کو اپنی قوت کا مظاہرہ تصور کر رہے ہو اور سمجھ رہے ہو کہ تم اپنے باپ پر غالب آ رہے ہو لیکن یقین مانو کہ تمہاری یہ مفروضہ کامیابیاں سب سے زیادہ خود تم کو نقصان پہونچا رہی ہیں۔

یہ کہنے کے بعد میں نے مریض کو اس کے تمام علامات آیندہ زندگی کی کامیابی کے متعلق اس کے شکوک و شبہات۔ اس کے خودکشی کے خیالات گھر سے چلے جانے اور بدخوابی کے درمیان جو ربط و تعلق تھا وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا۔ میں نے یہ بات اس کے خوب ذہن نشین کر دی کہ باپ کو سزا دیکر وہ اپنے آپ کو سزا دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ آج جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹے تو یہ تصور کرتا ہے کہ آج وہ وقتاً فوقتاً بیدار ہوتا جائے گا اور کل کوئی کام نہ کرنے کی خاطر خود کو خوب خستہ کر لے گا۔ اور یہ بھی تصور کر لے کہ وہ صبح کو خستہ و ماندہ اٹھا کام کو جا نہ سکا اور اس کا

باپ خوب خفا ہوا۔ میں نے یہ مشورہ مریض کو اس لئے دیا کہ میں چاہتا تھا کہ وہ حقائق کا مقابلہ کرنے کا عادی ہو جائے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس مریض کا نصب العین زندگی یہی ہے کہ باپ کو ستائے دق کرے۔ جب تک کہ باپ بیٹے کی جنگ موقوف نہ کی جائے علاج کامیاب نہیں ہو سکتا خصوصاً اس لئے کہ یہ لاڈ میں بگڑا ہوا بچہ تھا۔ پس میں نے یہ سب باتیں اس پر ظاہر کر دیں اور اب وہ خود اپنی اصلاح کر لے سکتا ہے۔

اس مریض کا معاملہ فرائیڈ کے اس نظریہ سے کہ لڑکا ماں سے مانوس ہوتا اور لڑکی باپ سے مانوس ہوتی ہے ملتا جلتا ہے۔ یہ نوجوان باپ کو نقصان پہونچانے کی فکر میں رہتا ہے اور ماں سے بہت محبت رکھتا ہے لیکن یاد رہے کہ اس میں جنس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بچپن سے ماں اس کو چاہتی رہی اور باپ اس پر سختی کرتا رہا۔ غلط تربیت اور غلط مقصد حیات سمجھنے کی وجہ سے اس نے غلط 'طرز زندگی' اختیار کر لیا وراثت کو اس کی مصائب کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا یہ شخص جبلیت اپنے ان وحشی آباء و اجداد سے لے کر پیدا نہیں ہوا جو اپنے قبیلے کے سردار کو مار کر کھا جاتے تھے۔ بلکہ اس نے اپنے ذاتی تجربوں کے ذریعے اپنے لئے ایک طرز زندگی قرار دے لیا۔ ہم چاہیں تو ہر بچہ کو اسی طرح بگاڑ دے سکتے ہیں۔ اگر کسی بچہ کو مثل اس مریض کی ماں کے لاڈ کرنے والی ماں اور سختی کرنے والا باپ ہم فراہم کر دیں تو وہ بچہ اسی طرح بگڑ جا سکتا ہے جیسا کہ یہ مریض بگڑ گیا تھا۔ اگر کوئی بچہ اپنے باپ کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہے اور پھر خود اعتمادی اور آزادی کے ساتھ اپنے مسائل زندگی حل کرنے میں کامیاب نہ ہو تو وہ وہی طرز زندگی قایم کر لے گا جو اس مریض کا تھا۔

پانچویں فصل

خواب

خواب کیا ہیں

تقریباً ہر انسان خواب دیکھتا ہے لیکن تعجب ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خوابوں کے معنی و مفہوم کو سمجھ سکتے اور ان کی صحیح تعبیر کر سکتے ہیں۔ خواب نفس انسانی کی عاملہ قوتوں یا سرگرمیوں کا مظاہرہ ہوتے ہیں۔ انسان ہمیشہ خوابوں سے دلچسپی لیتے رہے اور خوابوں کی تعبیر سمجھنے کے لئے حیران اور سرگردان رہے ہیں۔ اکثر افراد اپنے خوابوں کو بہت ہی اہمیت دیتے اور انھیں عجیب و غریب اور شاندار تصور کرتے ہیں اور یہ آج کل کی بات نہیں بلکہ خلقت انسان کے زمانہ سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ تاہم اب تک انسانوں کو معلوم نہ ہوسکا کہ جب وہ خواب دیکھتے ہیں تو کیا کرتے ہیں اور خواب کیوں دیکھتے ہیں۔

خواب کی تعبیر

جہاں تک مجھے علم ہے خوابوں کی تعبیر کے صرف دو نظریئے ایسے ہیں جو جامع اور سائنٹفک ہیں۔ دو مکتب جو خوابوں کو سمجھنے اور ان کی صحیح تعبیر بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ایک فرآئیڈ کا مکتب تشریح النفس اور دوسرا مکتب انفرادی نفسیات ہے۔ ان دو مکتبوں کے ماننے والوں سے شاید انفرادی نفسیات کے ماننے والے ہی دعویٰ کرسکتے ہیں کہ خوابوں کے متعلق ان کا بیان ایسا ہے کہ جو عقل کے مطابق ہے۔

پچھلے زمانہ میں خوابوں کو سمجھنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں وہ اگرچہ سائنٹفک

نہیں تھیں تاہم قابل غور ہیں۔ ان سے ہم کو اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے خوابوں کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے اور خوابوں کے متعلق ان کا طریقہ عمل کیا رہا

خواب کیوں پڑتے ہیں

چونکہ خواب نفس کی تخلیقی سرگرمی کا ایک جز ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم یہ معلوم کرلیں کہ لوگ اپنے خوابوں سے کیا توقع رکھتے ہیں تو ہمیں ایک حد تک خوابوں کے پڑنے کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔ جب ہم تحقیق شروع کرتے ہیں تو ابتدا ہی میں ہم ایک اہم واقعے سے دوچار ہوتے ہیں وہ یہ کہ عام طور پر فرض کرلیا گیا ہے کہ خوابوں کا تعلق مستقبل (آیندہ زندگی) سے ہوتا ہے۔ پچھلے زمانہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ خواب میں ارواح۔ کوئی خدا یا کوئی خاندان کے بزرگ آکر ان کے نفوس (یا دماغوں) پر قبضہ کرلیتے ہیں اور ان کو متاثر کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ مشکلات کے وقت اپنے خوابوں کو اپنی رہنمائی اور رہبری کا ذریعہ بناتے تھے۔ قدیم زمانے کے تعبیر ناموں میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواب دیکھنے والوں کے خوابوں سے ان کی آیندہ قسمت یا نصیب پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔ قدیم زمانے کے غیر متمدن لوگ خوابوں سے فال لیتے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ قدیم یونانی اور مصری مندروں میں جاکر سویا کرتے تاکہ انھیں دیوتاؤں کی جانب سے مقدس خواب پڑیں اور وہ ان سے اپنی آیندہ زندگی کے متعلق رہنمائی حاصل کریں۔ اس قسم کے خواب شفا بخش یعنی جسمانی اور نفسیاتی عارضوں کو رفع کرنے والے بھی تصور کئے جاتے تھے۔ امریکا کے سرخ انڈین ریاضت۔ روزوں اور پسینے کے حمام کے ذریعے خواب دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور جب انھیں خواب پڑتے تو پھر ان کی تعبیر سے اپنا طرز زندگی قائم کرتے۔ عہد نامہ عتیق میں بتایا گیا ہے کہ خواب آئندہ زندگی یا مستقبل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اب بھی ایسے لوگ ہیں جو بڑے اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسے خواب دیکھے جو بالکل صحیح نکلے۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ غیب داں ہیں اور یہ کہ خواب میں انسان کو آئندہ کا حال معلوم

ہو جاتا ہے اور خواب پیشین گوئی کرتے اور بتا دیتے ہیں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

سائنس کے نقطۂ نظر سے ایسے خیالات مضحکہ خیز ہیں۔ جب سے کہ میں خوابوں کی گتھی سلجھانے میں مصروف ہوا اسی وقت سے مجھ پر یہ امر واضح ہو گیا کہ وہ شخص جو خواب دیکھ رہا ہو مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرنے کی بہ نسبت اس شخص کے جو بیدار ہو اور اپنے ہوش و حواس پر پورا قابو رکھتا ہو بہت کم صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ ہم حالت بیداری میں جس ہشیاری اور عقلمندی سے مسائل پر غور و فکر کر سکتے اور صحیح نتائج نکال سکتے ہیں ایسا خواب میں نہیں ہو سکتا بلکہ خواب میں پریشانی اور حیرانی ہوتی ہے۔ تاہم انسانوں کے اس روایتی قدیم عقیدے کو کہ خوابوں کا تعلق مستقبل سے ہے ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیئے اس لئے کہ ممکن ہے ہم اس عقیدے کو ایک حد تک صحیح پائیں۔ اس عقیدے پر اگر ہم حسب قواعد تناظر غور کریں تو ہم کو سلسلہ کی وہ گم شدہ کڑی مل جاتی ہے جس کو ہم نے گم کر دیا تھا ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ ان کے خواب ان کی زندگی کے مسائل حل کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی فرد کے خواب دیکھنے کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے مستقبل کے متعلق معلومات اور رہنمائی حاصل کرے اور ان سے اپنے مسائل زندگی حل کرنے میں مدد لے۔ اس نظریئے کے بعد یہ کہنا کہ خوابوں کو پیشین گوئی یا الہام سے کوئی تعلق ہے بے معنی بات ہو جاتی ہے۔ اب ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ کوئی شخص اپنے خواب کے ذریعہ اپنے مسائل زندگی کا حل کس طرح اور کہاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر میں تو یہ بات واضح اور روشن ہے کہ اگر کوئی حل طلب مسئلہ ہمارے پیش نظر ہو اور اس کا حل اگر ہمیں خواب میں ملے تو وہ بہ نسبت اس تصفیے کے جو ہم حالت بیداری میں عقل سلیم کے ساتھ قوت استدلال کو کام میں لاتے ہوئے کرینگے بہت پست تر ہو گا۔ مختصر یہ کہ اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہو گا کہ انسان کے خواب

دیکھنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مسائل کو نیند میں حل کرنا چاہتا ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ

فرائیڈ نے اپنے نظریہ خواب میں کوشش کی ہے کہ خواب کے ایسے معنی بتائے جو سائنٹیفک ہوں لیکن ساتھ ہی ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو ان کے معنی کو حدود سائینس سے خارج کر دیتے ہیں مثلاً فرائیڈ نے فرض کر لیا ہے کہ انسان کا نفس جو کام دن میں کرتا ہے اس کے اور اس کام کے جو رات میں کرتا ہے درمیان خلا رہتا ہے اور یہ کہ حالت شعور اور لاشعوری حالت ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور خواب کے خاص قوانین ہیں جو حالت بیداری کے تفکر اور تعقل کے قوانین سے بالکل جدا ہیں۔

جب کبھی کسی شخص میں ہمیں ایسی متضاد باتیں نظر آئیں تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے سوچ بچار کا طریقہ سائنٹیفک نہیں ہے۔

جب ہم ابتدائی وحشی اقوام کے افراد اور قدیم فلسفیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا میلان طبیعت ہی تھا کہ اپنے خیالات کو متناقص یا تضادی طور پر پیش کریں اور ایک خیال کو دوسرے کا ضد قرار دیں۔ خیالات کا تضادی طور پر پیش کرنے کا رجحان خلل اعصاب کے مریضوں میں صاف طور پر پایا جاتا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ داہنے' اور بائیں' ایک دوسرے کے متضاد ہیں 'مرد' اور 'عورت' اور گرم اور سرد۔ ہلکی اور وزنی چیز۔ قوی اور کمزور ایک دوسرے کے متضاد ہیں حالانکہ سائینس کے نقطۂ نظر سے یہ چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ مختلف اقسام ہیں۔ اسی طرح نیکی اور بدی معمولی اور غیر معمولی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ مختلف اقسام ہیں۔ لہذا جو بھی نظریہ جو نیند کی حالت اور بیداری کی حالت اور خواب میں آنے والے اور دن میں آنے والے خیالات کو متضاد یعنی ایک دوسرے کی ضد تصور کرے تو وہ نظریہ سائنٹفک نہیں سمجھا جا سکتا۔

فرائیڈ کے نظریئے میں ایک اور مشکل چیز یہ ہے کہ وہ خوابوں کو جنسی پس منظر دیتے ہیں۔ ان کے اس خیال کی وجہ خوابوں کا تعلق انسان کے روزمرہ کے معمولی مشاغل اور

کوششوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر یہ خیال کہ خوابوں کا تعلق جنسی جذبات سے ہے صحیح ہو تو پھر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خواب سے کسی شخص کی پوری شخصیت ہم معلوم نہیں کر سکتے بلکہ اس گی پوری شخصیت کے صرف ایک جزو (یعنی جنسی حالت) کی کیفیت ہمیں معلوم ہو سکتی ہے۔ فرآئیڈ کے ماننے والوں نے اس نظریہ کو کہ خواب جنسی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں ناکافی ہے اور غیر تشفی بخش پایا ہے۔

فرائیڈ نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ خوابوں میں غیر شعوری نفس کی موت کی خواہش بھی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال ایک طرح سے صحیح ہو۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا خواب دراصل انسان کی وہ کوششیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ انسان آسانی کے ساتھ بلا کسی زحمت کے اپنے مسائل زندگی حل کر لینا چاہتا ہے اور خواب ہی وہ ہیں جو کسی شخص کی کم ہمتی ہم پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ الغرض فرائیڈ کا نظریہ یا اصطلاح بیحد استعاری ہے اور اس سے کسی شخص کی پوری شخصیت معلوم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس نظریئے کے تحت تو انسان کی خوابوں کی زندگی اور بیداری کی زندگی میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

خوابوں کے معنی اور تعبیر بیان کرنے کے لئے فرائیڈ نے جو کوششیں کیں اور نظریے پیش کئے ان سے ہمیں بہت سے دلچسپ اور قیمتی اشارے اور نکات مل جاتے ہیں خصوصاً یہ نکتہ بہت مفید ہے کہ درحقیقت خواب کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ وہ خیالات جو خواب کے اندر پنہاں ہوتے اور خواب پڑنے کی وجہ ہوتے ہیں اہم ہوتے ہیں۔ انفرادی نفسیات کا بھی یہی فیصلہ ہے (یعنی انفرادی نفسیات میں بھی خواب کے پنہاں خیالات کو اہمیت دی جاتی ہے)

(فرائیڈ کی ایجاد کردہ) تحلیل نفس میں نقص ہے وہ یہ کہ نفسیات کا ایک اصل لازمہ کہ انسان کی پوری شخصیت پر غور کر کے اور اس کے مختلف حرکات اور سکنات کو مجموعی طور پر دیکھ کر نتائج اخذ کرنا چاہیئے غائب ہے یعنی تحلیل کا یہ

یہ عیب فرائیڈ کے اس جواب سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو وہ ہمارے ان سوالات کے کہ خوابوں کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ دیتے ہیں۔ تحلیل نفس کے ماہر (یعنی فرائیڈ) جواب دیتے ہیں کہ خواب کسی فرد کے خواہشات کی جو پوری نہ ہوئی ہوں کی تشفی و تسلی کے لئے پڑتے ہیں۔ (فرائیڈ کے) اس جواب سے خوابوں کے مسئلہ پر روشنی نہیں پڑتی۔ اگر کوئی شخص خواب دیکھے اور بیدار ہونے سے قبل خواب اس کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بھول جائے یا خواب کے معنی نہ سمجھ سکے تو پھر نامکمل خواہشات کی تشفی و تسلی کس طرح ہوئی؟ یوں تو سب انسان خواب دیکھتے رہتے ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنے خوابوں کے صحیح معنی اور تعبیر سمجھ سکتا ہو جب صورت حال یہ ہے تو خواب دیکھنے سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر خواب کی زندگی کو بیداری کی زندگی سے جدا کر دیا جائے اور خواب کی حالت میں انسان کی خواہشات دلی پوری ہو جائیں یا کم از کم تسلی حاصل کریں تو البتہ ہم فرائیڈ کا جواب قبول کر لیتے لیکن ان کے نظریے کے مطابق انسانی شخصیت میں ربط باقی نہیں رہتا۔ کسی شخص کی خواب کی حالت بیداری میں اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

سائنس کے نقطہ نظر سے کوئی شخص چاہے وہ خواب دیکھ رہا ہو یا بیدار ہو ایک ہی ہستی ہے۔ لہذا خوابوں کا تعلق اس ایک مکمل ہستی سے ہونا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں میں چند ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی پوری شخصیت کے ساتھ خوابوں میں اپنی خواہشات کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ بچپن میں لاڈ سے بگڑے ہوئے شخص کا تعلق اسی خاص قسم سے ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ میری خواہشات کس طرح پوری ہونگی؟ دنیا کی زندگی میں مجھے کیا ملے گا؟ ایسا شخص جیسا کہ حالت بیداری میں ہر وقت اپنی خواہشات پوری کرنے کی فکر میں رہتا ہے ویسا ہی اپنے خوابوں میں بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کی دھن میں رہتا ہے۔

اگر ہم فرائیڈ کے نظریہ کا غور سے مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ

وہ درحقیقت لاڈلے بچے کی نفسیاتی کیفیت ہی کو بیان کرتے ہیں جو (یعنی لاڈلا بچہ) ہمیشہ اسی خیال میں رہتا ہے کہ اس کے جذبات کو کبھی ٹھیس نہ لگے اور جو اپنے سوائے اور دوسرے ایسے افراد کے وجود کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے جو مثل اس بچے سوال کرتے ہوں کہ میں کیوں اپنے پڑوسی سے محبت رکھوں؟ کیا میرا پڑوسی بھی مجھے چاہتا اور مجھ سے محبت رکھتا ہے؟

تحلیل نفس لاڈلے بچے کے مقدمات سے ابتداء کرتی اور پھر ان مقدمات پر تفصیلی اور صحیح طور پر کام کرتی ہے لیکن کسی فرد کی وہ کوششیں جو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کرتا ہے اس کی اس جد و جہد کا جو حصول برتری کے لئے کرتا ہے صرف لاکھواں حصہ ہوتی ہیں (یعنی حصول برتری کے لئے فرد کہیں زیادہ کوشش کرتا ہے) اور پھر ہم تکمیل خواہشات کی خواہش کو کسی شخص کی شخصیت کا مرکزی محرک نہیں تصور کرتے کہ جس کی وجہ اس سے افعال سرزد ہوں (اس جملہ سے اڈلر کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی شخصیت محض تکمیل خواہشات کی غرض سے کام نہیں کرتی بلکہ اس کو حرکت میں لانے والے اس سے کام لینے والے دوسرے محرکات بھی ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ محرک حصول برتری کا خیال ہوتا ہے۔ مترجم)

خواب کی زندگی بیداری کی زندگی سے جدا نہیں۔

اگر ہمیں خوابوں کی صحیح وجہ معلوم بھی ہو جائے تو یہ معلوم کرنا باقی رہتا ہے کہ خواب دیکھنے والوں کو خواب بھول جانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں نے خوابوں کے معنی اور تعبیر معلوم کرنے کی جد و جہد شروع کی تو یہی مسئلہ میرے لئے پیچیدہ اور پریشان کن ثابت ہوا لیکن میں نے معلوم کر لیا کہ حالت خواب یا خواب کی زندگی بیداری کی زندگی سے جدا نہیں ہے بلکہ کسی شخص کا خواب وہی کیفیت رکھتا ہے جیسا کہ حالت بیداری کے حرکات و سکنات اور دوسرے مظاہرے ہوتے ہیں۔

اگر دن میں ہم اپنا نصب العین برتری حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہیں تو رات میں بھی ہمیں اسی جد و جہد میں مشغول رہنا چاہیئے۔ غرض کہ ہر شخص اس لئے خواب دیکھتا ہے کہ

اسے خواب میں ایک خاص کام انجام دینا ہے اور خواب میں بھی نصب العین برتری حاصل کرنا ہے۔ خواب طرزِ زندگی کی پیداوار ہوتا ہے۔ طرزِ زندگی کی تعمیر میں مدد دینا اور اس کو مضبوط کرتا ہے۔

اور ایک چیز ہے کہ جس سے خواب کی غرض وغایت واضح اور صاف طور پر سمجھنے میں ہمیں فوری مدد ملتی ہے وہ یہ کہ اکثر ہم خواب دیکھتے ہیں اور صبح ہونے تک انھیں بھول جاتے ہیں۔ ذہن میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت خواب کچھ بھی یاد نہیں رہا؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ خواب کا کچھ نہ کچھ حصہ ذہن میں باقی رہتا ہے اور وہ یہ ہوتا ہے کہ خواب میں جو جذبات ہم بھڑکا لیتے ہیں وہ باقی رہ جاتے ہیں۔

خواب کی غرض جذبات کو اُبھارنا ہوتا ہے

خواب کی تصاویر باقی نہیں رہتیں۔ خواب کے واقعات۔ معنی وغیرہ یاد نہیں رہتے لیکن جذبات باقی رہ جاتے ہیں اور خوابوں کی غرض درحقیقت یہی ہوتی ہے کہ جذبات کو ابھاریں اور انھیں بھڑکائیں۔ خواب جذبات کو متحرک کرنے کا ایک ذریعہ۔ ایک آلہ ہوتا ہے خواب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خواب دیکھنے والے میں جذبات پیدا کر کے انھیں چھوڑ جائے۔

دن کے اور خواب کے خیالات ایک ہوتے ہیں لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ

کوئی شخص جو جذبات اپنے میں پیدا کرتا ہے وہ اس کے طرزِ زندگی کے مطابق ہوتے ہیں۔ خواب میں جو خیالات آتے ہیں ان میں اور دن کے خیالات میں کوئی ایسا بیّن اور زیادہ فرق نہیں ہوتا کہ دونوں کو دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ خواب دیکھتے وقت انسان حقائق کی دنیا سے کسی قدر دور ہو جاتا ہے لیکن اس کا تعلق 'حقیقت' سے پوری طرح نہیں ٹوٹتا نیند کی حالت میں بھی ہم 'حقیقت' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم حالت بیداری میں کسی وجہ سے پریشان رہیں تو پھر پریشانی نیند میں بھی باقی رہتی ہے اور نیند خراب کر دیتی ہے۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو

کسی نہ کسی طرح خود کو ایسی حالت میں رکھتے ہیں کہ پلنگ سے گرنے نہیں پاتے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے تعلقات "حقیقت" سے قایم اور باقی ہیں۔ ایک ماں راستے کے غل وشور میں گہری نیند سوتی رہتی ہے لیکن اس کے پہلو میں جو بچہ ہوتا ہے اس کی ہلکی سی حرکت اس کو جگا دیتی ہے۔ بہر حال نیند میں بھی ہمارا تعلق بیرونی دنیا سے قائم رہتا ہے لیکن نیند میں حسی ادراکات سست پڑ جاتے ہیں۔ بالکل غائب نہیں ہو جاتے اور "حقیقت" (یعنی ماحول) سے ہمارا تعلق کم ہو جاتا ہے۔ جب ہم خواب دیکھتے ہیں تو تنہا رہتے ہیں۔ سماج (سوسائیٹی) کے مطالبات اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں رہتے۔ حالت خواب (یعنی خواب دیکھتے وقت) میں ہم اپنے ماحول پر سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ غور نہیں کر سکتے۔

ہم ٹھنڈی نیند اسی وقت سو سکتے ہیں جب کہ ہم کسی قسم کی فکر اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں اور ہمیں اپنے مسائل زندگی حل کر لینے کا یقین ہو۔ نیند کو خراب کرنے والے چیزوں میں خواب بھی ایک چیز ہے۔

اڈلر کی رائے ہے کہ خواب جب پڑتے ہیں جب ہم مسائل زندگی حل نہیں کر سکتے

بہر حال میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمیں اسی وقت خواب پڑتے ہیں جب کہ ہم کو اپنے مسائل زندگی کے حل کرنے کا یقین نہیں رہتا اور جب کہ "حقیقت" نیند میں بھی ہمیں ستاتی رہتی اور حالت بیداری کی مشکلات پیش کرتی رہتی ہے۔ پس مشکلات زندگی کا مقابلہ کرنا اور ان کا حل پیش کرنا خواب کا کام قرار پاتا ہے۔ اب ہم سمجھنا شروع کرتے ہیں کہ نیند میں ہمارے نفوس مسائل زندگی کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ نیند میں ہم مسائل یا مواقع کو ان کی مکمل حالت میں نہیں دیکھتے اس لئے وہ آسان نظر آتے ہیں اور جو حل خواب پیش کرتے ہیں ان کے اختیار کرنے اور نہ کرنے میں ہمارا بہت کم حصہ ہوتا ہے۔ خواب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اختیار کردہ طرز زندگی کو مدد پہنچائے اور ایسے جذبات ہم میں ابھار دے جو ہماری طرز زندگی کے مطابق ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طرز زندگی کو مدد کی ضرورت کیوں ہے؟

کونسی چیز اس پر حملہ کر سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز طرز زندگی پر حملہ آور ہو سکتی ہے تو وہ 'عقل سلیم' اور 'حقیقت' ہے تو اب خوابوں کا مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ طرز زندگی کو عقل سلیم اور حقیقت کے حملوں سے بچانا اور ان کے مقابلہ میں مدد دینا۔ اس سے ہم کو ایک دلچسپ بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کا کسی ایسے مسئلہ سے سابقہ پڑ جاتا ہے جسے عقل سلیم کی رہنمائی کے مطابق حل کرنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے اس طرز عمل کی توثیق ان جذبات سے کر لیتا ہے جو اس میں خواب کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔

ہم بیداری میں بھی اپنے جذبات کو ابھارتے ہیں

ظاہر میں یہ بات (یعنی خواب میں جذبات کا پیدا ہونا) بیداری کی حالت کے برعکس معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم ہشیاری میں بھی جذبات کو اسی طرح ابھار سکتے اور ہیجان میں لا سکتے ہیں جیسا کہ نیند کی حالت میں خواب دیکھتے وقت ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور عقل سلیم سے مدد لیتے ہوئے اس مشکل کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتا اور اپنے طرز زندگی پر قایم رہنا اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے تو وہ سب ایسی چیزیں کر گزرتا ہے کہ جس سے وہ اپنی طرز زندگی کو صحیح اور درست بتا سکے اور اس کو اپنے لئے موزوں ثابت کر سکے۔

جوا کیوں کھیلا جاتا ہے

مثلاً اگر کسی شخص کا نصب العین زندگی یہ ہو کہ بلا کسی زحمت اور محنت اور مشقت کے آسانی کے ساتھ اور کسی کو کچھ فائدہ پہونچانے کے بغیر روپیہ پیدا کرے تو وہ جوا کھیلنا شروع کر دیتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ جوئے میں متعدد افراد روپیہ کھو چکے اور نقصان اٹھا چکے ہیں چونکہ وہ آسان پسند ہے اس لئے وہ خود کو اس ذریعہ سے مالدار بنانا چاہتا ہے۔ یہ شخص کرتا کیا ہے؟ پہلے تو وہ اپنے دل میں دولت کے فوائد کے متعلق خیالات پیدا کر لیتا ہے کہ دولت حاصل کرنے میں یہ فوائد ہیں پھر وہ اپنے ذہن میں خیالی پلاؤ پکانا شروع کرتا ہے کہ سٹہ کھیلنے یا جوئے سے روپیہ خوب ملے گا اور اس روپیہ سے موٹر خریدے گا۔

عیش و آرام کی زندگی بسر کرے گا اور دوست احباب میں ایک دولت مند شخص مشہور ہو گا۔ اس قسم کی خیالی تصاویر اپنے دماغ میں کھینچ کر وہ اپنے جذبات کو ابھارتا ہے تاکہ یہ جذبات اس کو آگے بڑھائیں۔ بالآخر وہ عقل سلیم کی ہدایت کو پس پشت ڈال کر قمار بازی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ کیفیت دنیا کے اور روزمرہ حالات اور مشاغل میں بھی نظر آتی ہے مثلاً اگر ہم کسی کام میں مشغول ہوتے ہیں اور کوئی آتا اور ہم سے کہتا ہے کہ ناٹک میں کوئی اچھا کھیل ہو رہا ہے تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ کام چھوڑ کر ناٹک چلے جائیں۔ اگر کسی شخص کو کسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ اپنے خیال میں اپنے لئے مستقبل کی ایک تصویر کھینچتا ہے۔ اگر وہ لڑکی کے حسن و جمال کا گرویدہ ہو جاتا ہے تو یہ تصویر اسے پسندیدہ اور اچھی نظر آتی ہے۔ بعض وقت جب اس پر مایوسی طاری ہوتی ہے تو یہ مستقبل کی تصویر یا تصویریں اس کو بھیانک نظر آنے لگتی ہیں بہر حال دونوں صورتوں میں وہ اپنے جذبات کو متحرک کرتا ہے اور ہم اس کے ان جذبات کا مطالعہ کر کے کہہ دے سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔

خواب عقل سلیم کا دشمن ہے

اب سوال یہ ہے کہ اگر خواب دیکھنے کے بعد سوائے جذبات کے اور کچھ باقی نہیں رہتا تو پھر عقل سلیم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ کہاں چلی جاتی ہے؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) خواب عقل سلیم کا دشمن ہے۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ جو لوگ اپنے جذبات سے متاثر ہوتے اور ان سے دھوکہ کھانے کے عادی نہیں ہوتے اور جو ہر مسئلہ کو سائنٹفک طریقہ سے حل کرنا اچھا سمجھتے ہیں وہ لوگ خواب بہت کم دیکھتے ہیں یا مطلقاً دیکھتے ہی نہیں۔ خواب زیادہ ان ہی لوگوں کو پڑتے ہیں جو عقل سلیم سے دور ہو گئے ہوں اور معمولی اور مفید ذریعوں سے اپنے مسائل زندگی حل کرنا نہیں چاہتے۔

عقل سلیم 'تعاون' کا ایک رُخ ہے پس جو لوگ 'تعاون' کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ عقل سلیم بھی نہیں رکھتے ان افراد کی ہمیشہ یہی فکر رہتی ہے کہ ان کا طرز زندگی ہی ہمیشہ کامیاب اور فتح یاب رہے اور صرف وہی صحیح راستے پر چلنے والے اور صائب

رائے رکھنے والے مانے جائیں۔ یہ افراد 'حقیقت' کی چیلنج سے بھاگتے رہتے ہیں (یعنی حقایق زندگی کا مقابلہ نہیں کرتے)۔ اس تمام بحث کے بعد ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خواب کسی فرد کے زندگی کے مسائل اور اس کی طرز زندگی کے درمیان ایک پل کا کام دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے طرز زندگی سے کسی قسم کے نئے مطالبات نہیں کرتے (یعنی خواب طرز زندگی کو بدلنے یا درست کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ طرز زندگی جو بھی ہو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں)۔ انسان کا طرز زندگی اس کے خوابوں کا مالک و آقا ہوتا ہے اور خواب میں انسان اپنے ان ہی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے جن کی اس کو ضرورت ہے۔ ہم کسی شخص کے خواب میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے جو اس کے حالات اور خصوصیات سے بالکل جدا ہو۔ چاہے ہم خواب دیکھیں یا نہ دیکھیں ہمیں اپنے مسائل زندگی تو حل کرنا پڑتا ہے لیکن خواب ہمارے طرز زندگی کو مدد دیتے اور اس کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خواب میں انسان خود کو بیوقوف بنا لیتا ہے

اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو اس سے خواب کی ماہیت سمجھنے کے لئے ہم ایک نئی اور اہم منزل پر پہونچ جاتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ خواب میں ہم اپنے آپ کو بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ جب ہم خواب دیکھتے ہیں تو اپنے کو مخمور کر لیتے ہیں اور اپنے میں خود نومی پیدا کر لیتے ہیں۔ اور خواب دیکھنے کا مقصد کلی یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے میں وہی کیفیت پیدا کر لیں جس سے ہم کسی مسئلے یا موقف کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ خواب کی حالت میں انسان کی شخصیت وہی باقی رہتی ہے جو حالت بیداری اور روزمرہ کی زندگی میں ہوتی ہے لیکن خواب کی حالت میں وہ نفس کی ورک شاپ (کارخانہ) میں ہوتا ہے جہاں وہ جذبات تیار کر لیتا اور دوسرے دن ان سے کام لیتا ہے۔

ہم کیا معلوم کرتے ہیں؟ سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان تصاویر حادثات اور واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔ ان انتخابات کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

جب کوئی شخص اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اپنے ذہن میں گزشتہ تصاویر اور واقعات کا ایک کشکول تیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں انسان کا انتخاب (یعنی تصاویر اور واقعات ماضی کا انتخاب) تابع مقصد ہوتا ہے وہ حافظہ سے ان ہی یادداشتوں کو چن لیتا ہے جو اس کے نصب العین برتری کی تائید میں ہوں اور جن سے اسے اپنا نصب العین حاصل کرنے میں اسے مدد ملے۔ انسان کا نصب العین اس کے حافظہ پر حکمراں ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنے خواب کی بھی تعبیر کرتے ہیں۔ خواب دیکھتے وقت ہم صرف ان واقعات کا انتخاب کر لیتے ہیں جو ہماری انتخاب کردہ طرز زندگی کے مطابق ہوں اور جو ہمیں بتا سکیں کہ ہمارا طرز زندگی مسائل زندگی کو کس طرح حل کرنا چاہتا ہے۔ انسان کی طرز زندگی کا مشکلات کے مقابلہ میں جو طریقہ کار ہوتا ہے وہی طریقہ خواب میں واقعات کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ خواب میں انسان کا طرز زندگی آزاد رہتا اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بیداری میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل سلیم استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن طرز زندگی اس سے بغاوت کرتا ہے۔

خواب رموز اور اشاروں سے بنتے ہیں۔

خواب اور کن ذرائع سے اپنے لئے مواد پیدا کرتا ہے؟ قدیم لوگوں نے یہ بات معلوم کر لی تھی اور ہمارے زمانہ میں فرائیڈ نے خاص طور پر اسی پر زور دیا ہے کہ خواب استعاروں اور رموز و اشارات سے بنتے ہیں۔ ہم خواب دیکھتے وقت شاعر بن جاتے ہیں۔ اگر ہم استعاروں یا اشاروں اور رموز کو چھوڑ کر سیدھی سادھی گفتگو کریں تو عقل سلیم کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ استعاروں اور اشاروں سے جیسا چاہے غلط سلط کام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں مختلف معنی پنہاں ہو سکتے اور یہ ذومعنی ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک معنی بالکل غلط ہو سکتے ہیں۔ ان سے غیر منطقی نتائج بھی اخذ کر لئے جا سکتے ہیں۔ جذبات کو متحرک کرنے کے لئے بھی ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم کسی شخص کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اسے کہتے ہیں کہ "ناداں بچہ

نہ بن جاؤ"۔ کوئی روتا ہے تو کہتے ہیں "کیوں روتے ہو؟ کیا تم عورت ہو؟ جب ہم استعاروں اور اشاروں میں گفتگو کرتے ہیں تو ہماری گفتگو کچھ نہ کچھ بے ربط اور جذبات کو متحرک کرنے والی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوی ہیکل شخص ایک پست قد آدمی سے ناراض ہوتا ہے تو اس طرح ناراضی کا اظہار کرتا ہے "وہ ایک کیڑا ہے اس کو پاؤں کے نیچے کچل دینا چاہیئے"۔ اس استعارے کے ذریعے سے قوی ہیکل شخص اپنے غصّہ کو مدد دے رہا اور بڑھا رہا ہے۔

استعاروں کا استعمال ہمیں دھوکے میں ڈالتا ہے

استعارے تقریر کے نہایت عمدہ ذریعے ہیں لیکن ان کے استعمال سے ہم اکثر خود کو دھوکہ میں بھی ڈال سکتے ہیں مثلاً ہومر شاعر کا یونانی فوج کو مثل شیروں اور ببروں کے میدانوں میں اُتر آنا بیان کرنا اس کی بہت ہی اچھی مثال ہے۔ کیا ہم باور کر سکتے ہیں کہ ان بیچارے کثیف اور بدحال یونانی سپاہیوں کے متعلق جو اپنی جان بچانے میدان جنگ میں دوڑتے پھرتے تھے ہومر کا درحقیقت یہ خیال تھا کہ وہ ببروں کے مانند تھے؟ ہرگز نہیں۔ ہومر کا یہ خیال نہ تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم سپاہیوں کو ببروں کے مانند سمجھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سپاہی حقیقتاً ببر نہیں ہوتے لیکن اگر شاعر یہ کہتا کہ سپاہیوں کے دم پھول گئے تھے وہ پسینہ میں غرق ہو گئے اور جا بجا ٹھیرتے ہوئے ایک دوسرے کا دل بڑھاتے اور خطروں سے خود کو بچاتے جاتے تھے اور ان کی زرہیں پرانی اور بوسیدہ تھیں تو اس کا ہم پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ استعارے حسن کلام۔ پرواز فکر۔ خیال آرائی اور خیالی پلاؤ پکانے کے لئے مفید ہوتے ہیں لیکن یاد رہے کہ استعاروں۔ اشاروں اور کنایوں کا استعمال ان اشخاص کے لئے جن کا طرز زندگی غلط ہو بے حد خطرناک ہے۔

ایک طالب علم کو امتحان دینا ہے۔ مسلہ صاف اور سیدھا سادا ہے پس طالب علم کو چاہیئے کہ ہمت اور عقل سلیم کے ساتھ اس کو حل کرے لیکن اگر اس کا طرز زندگی اس طرح قائم ہو گیا ہے کہ وہ امتحان دینے سے بچنا چاہتا تو وہ خواب دیکھے گا کہ وہ جنگ میں شریک ہے اور لڑ رہا ہے۔ اس معمولی مسلہ کو ایک استعارہ کی شکل میں وہ دیکھتا اور

امتحان دینے میں جو اندیشہ اُسے پیدا ہو گیا تھا اس کی واجبیت اس خواب کے استعارے کے ذریعہ ثابت کرتا ہے۔ یا وہ خواب دیکھتا ہے کہ ایک گہرے غار کے کنارے کھڑا ہے اور خود کو اس میں گر پڑنے سے بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا۔ چونکہ اسے ایسے جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو اسے امتحان دینے سے بچانے میں مدد کریں تو وہ خواب میں امتحان کو غار سے تشبیہہ دے کر خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے ذرائع اور طریقوں سے خواب میں کام لیا جاتا ہے اور یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ درپیش شدہ مسئلہ خواب کی کاٹ چھانٹ کے بعد مختصر ہو جائے اور اصل مسئلہ کا ایک تھوڑا جزء باقی رہ جائے اور وہ باقی جزء استعارہ کی شکل میں اس طرح پیش ہوتا ہے کہ گویا وہ اصل اور پورا مسئلہ ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ ایک دوسرا طالب علم ہے جو باہمت ہے۔ آئندہ ترقی کرنا چاہتا ہے۔ محنت کر کے امتحان دینے کی خواہش بھی رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا طرز زندگی ایسا ہے کہ وہ تھوڑی مدد چاہتا اور کامیابی کے متعلق اطمینان دلایا جانے کا متوقع ہے۔ یہ طالب علم امتحان کی رات خواب دیکھتا ہے کہ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوا ہے۔ اس خواب سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے مسئلے کی ایک مختصر تصویر بنالی جس میں اصل مسئلہ کا ایک جزء نمایاں رہ گیا۔ اگرچہ مسئلہ (یعنی امتحان دینا) مشکل ہے لیکن اس نے متعدد جزئیات کو نظر انداز کر کے صرف کامیابی کی توقع کو قائم کر لیا اور اس طرح مدد کے لئے اپنے جذبات کو متحرک کیا۔ صبح میں وہ بستر سے خوش بحال۔ تر و تازہ اٹھا اور خود کو پہلے سے زیادہ باہمت پایا۔ اس نے اپنی مشکلات کم کر لینے میں کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ اس نے خواب میں خود کو مطمئن کر لیا لیکن درحقیقت خود کو دھوکہ دے رہا تھا اس لئے کہ خواب میں اس نے پورے مسئلہ کا عقل سلیم کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا بلکہ صرف اپنے پر بھروسہ پیدا کرنے کی کوشش میں مشغول رہا۔

انسان کا اپنے جذبات میں ہیجان پیدا کر لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ایک شخص جو کسی نالے پر سے کود کر اس پار ہو جانا چاہتا ہے۔ تو کودنے

سے قبل تین تک گن لینا ہے۔ کیا اس طرح گننا کوئی ضروری چیز ہے؟ کیا کودنے اور گننے میں کوئی اہم تعلق ہے؟ ہرگز نہیں مطلق کوئی تعلق نہیں ہے۔ کودنے والا تین تک اس لئے گنتا ہے کہ اپنے جذبات کو متحرک کرے اور اپنی قوتوں کو جمع کرلے ہمارے نفوس میں وہ تمام وسائل موجود ہیں جن سے ہم اپنی طرز زندگی کی تفصیلات کو پورا کرسکتے ہیں۔ طرز زندگی قائم کرسکتے اور اس کو قوت پہونچا سکتے ہیں۔ ان وسائل میں سے سب سے زیادہ اہم اور مفید مطلب وسیلہ ہماری اپنے جذبات کو متحرک کرنے کی قابلیت ہے۔ ہم دن رات اس قابلیت سے کام لیتے رہتے ہیں لیکن رات میں یہ خوب کام کرتی ہے۔

اڈلر کا واقعہ اور خواب

اب میں اپنا ایک واقعہ بیان کرتا اور اس بات کی صراحت کرتا ہوں کہ ہم خواب میں خود کو کس طرح بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں اعصابی امراض کے دواخانہ کا میں صدر تھا۔ علاج کے لئے میرے پاس سپاہی بھیجے جاتے تھے جن سپاہیوں کو میدان جنگ کے ناقابل پاتا تو میں انھیں کوئی معمولی اور ہلکے کام دینے کی سفارش کردیا کرتا تھا اس سے ان کی اعصابی کشمکش رفع ہوجاتی تھی اور اکثر سپاہی اچھے ہوجاتے تھے۔ ایک روز میرے پاس ایک سپاہی پیش کیا گیا جو اس قدر قوی اور تنومند تھا کہ ایسا سپاہی میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ سپاہی اس قدر اداس اور دل شکستہ تھا کہ جب میں اس کا طبی معائنہ کررہا تھا تو سوچتا کہ اس کے لئے کیا کام تجویز کروں۔ میرا دل تو ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ جو بھی سپاہی میرے پاس رجوع ہو اس کو گھر واپس کرادوں لیکن چونکہ میری سفارشیں ایک اعلیٰ افسر کے پاس پیش ہوتی تھیں اس لئے اس عام فیض رسانی سے مجھے احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ اس سپاہی کے متعلق تصفیہ کرنا میرے لئے تو آسان نہیں تھا لیکن جب تصفیہ کا وقت آیا تو میں نے اس سے کہا کہ اگرچہ تم خلل اعصاب کے مرض میں مبتلا ہو لیکن تمہارا جسم مضبوط اور صحیح و تندرست ہے اس لئے میں کوئی آسان کام نہیں دونگا اور تم کو میدان جنگ میں جانا پڑیگا۔ سپاہی یہ سن کر پژمردہ ہوگیا۔ قابل رحم صورت بنالی اور کہا کہ میں ایک مفلس طالب علم ہوں

بچوں کو پڑھا کر میں اپنے بوڑھے والدین کی پرورش کرتا تھا۔ اگر گھر واپس جا کر والدین کی نگہداشت نہ کروں تو وہ فاقوں مر جائیں گے۔ اگر میں ان کی مدد نہ کروں تو مریں گے یہ سن کر میں نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا کہ اس کے لئے یہ سفارش کروں کہ اس کو وطن بھیج دیا جائے اور وہاں اس سے کسی دفتر میں آسان کام لیا جائے لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی اندیشہ ہوا کہ اگر میں اس طرح کی سفارش کروں تو اس کا (سپاہی کا) افسر اعلیٰ بگڑ جائے گا اور اس کو میدان جنگ کو روانہ کر دیگا۔ پس میں نے آخر میں یہ تصفیہ کیا کہ اس کے لئے چوکیداری کی سفارش کر دوں۔ گھر آکر جب میں اس رات کو سو گیا تو ایک عجیب بھیانک خواب دیکھا کہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے اور یہ معلوم کرنے کہ کس کو قتل کیا تنگ و تاریک گلیوں میں بھاگتا پھر رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ میں چونکہ قاتل ہوں اس لئے اب میری خیر نہیں اب میری زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب میری دنیا ختم ہوگئی۔ ان خیالات کے ساتھ میں ایک جگہ خاموش کھڑا ہوگیا اور پسینہ پسینہ ہوگیا۔ جب میں صبح کو اٹھا تو پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہی تھا کہ (خواب میں) میں نے کس کو قتل کیا؟ مجھے فوراً خیال آیا کہ اگر میں اس سپاہی کو کسی دفتر میں کام نہ دوں تو ممکن ہے کہ وہ پھر میدان جنگ کو بھیج دیا جائے اور مارا جائے تو ایسی صورت میں اس کا میں قاتل ہوں گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ خواب میں میں نے اپنے جذبات کو کس طرح متحرک کیا اور خود کو دھوکا دیا میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا اور اگر یہ سپاہی مارا جائے تو بھی اس کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی۔ میں نے ایسا خواب اس لئے دیکھا کہ میرا طرز زندگی اس طرح قایم ہوگیا تھا کہ جو مجھے کسی قسم کے خطرہ کا سامنا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں ڈاکٹر ہوں میرا کام لوگوں کی جان بچانا ہے نہ کہ انھیں خطرہ میں ڈالنا۔ میں نے سپاہی کے معاملہ پہ بار بار غور کیا کہ اگر میں اس کے لئے آسان کام کی سفارش کروں تو افسر اعلیٰ اسے ضرور میدان جنگ کو بھیج دیگا اور اس سے سپاہی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے میں نے خیال کیا کہ اگر میں سپاہی کی مدد کرنا چاہتا ہوں تو مجھے چاہئے کہ میری طرز زندگی کو نظر انداز کر دوں عقل سلیم سے کام لوں لہذا میں نے سفارش کر دی کہ سپاہی صرف چوکیداری کی

خدمت انجام دے سکتا ہے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوگا کہ عقل سلیم کی رہنمائی اور ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہمیشہ بہتر اور مناسب ہوتا ہے۔ میرے افسر اعلیٰ نے میری سفارش پڑھی اور اس کو قلم زد کر دی میں نے سمجھا کہ اب وہ سپاہی کو میدان جنگ بھیج دیگا اور دل میں کہا کاش میں دفتری کام کی سفارش ہی کر دیتا لیکن افسر نے اس سپاہی سے چھ مہینوں تک دفتر کا کام لینے کی تجویز کر دی۔ بعد مجھے معلوم ہوا کہ افسر نے سپاہی کو آسانی سے چھوڑ دینے کے لئے اس سے رشوت لے لی تھی اور سپاہی نے اپنی تمام عمر میں کسی کو پڑھایا نہ تھا جو کچھ مجھ سے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ اس نے جو اپنا قصہ بیان کیا وہ صرف اس لئے تھا کہ میں اس کے لئے کسی آسان کام کی سفارش کر دوں اور رشوت خوار اعلیٰ افسر میری سفارش پر صرف دستخط کر دے۔ اس واقعہ کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ خواب دیکھنا چھوڑ دینا مناسب ہوگا۔

خواب کی باتوں پر عمل نہ کرنا چاہیئے

اس بات کی کہ خواب ہمیں بے وقوف بناتے اور مخمور کر دیتے ہیں، اس امر سے تصدیق ہوتی ہے کہ بہت کم خواب ہماری سمجھ میں آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے خوابوں کو سمجھ لیں تو پھر دھوکہ نہیں کھا سکتے اور پھر وہ ہمارے جذبات و احساسات میں ہیجان بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم عقل سلیم سے کام لیں اور خوابوں کی باتوں اور محرکات پر مطلق توجہ نہ کریں۔ اگر خواب سمجھ میں آجائیں تو وہ اپنا مقصد کھو دیں گے۔ خواب انسان کے حقیقی مسئلہ زندگی اور طرز زندگی کے درمیان ایک پل کا کام دیتے ہیں لیکن طرز زندگی کو اس پل کی ضرورت ہی نہ ہونی چاہیئے بلکہ ہمارا طرز زندگی ایسا ہو کہ جو حقائق پر نظر رکھے اور ان سے ربط پیدا کرے۔

خواب کے متعدد اقسام ہوتے ہیں اور ہر خواب سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ کسی شخص کے سامنے جب کوئی حل طلب مسئلہ پیش ہوتا ہے تو اس کے حل کرنے کے لئے اس کا طرز زندگی کس قسم کی مدد کا طالب ہوتا ہے لہذا کسی کی خواب کی تعبیر بیان کرنا گویا خود اس کی حالت اور کیفیت بیان کرنا ہے۔ فارمولوں (تعریفوں) کے ذریعے اشارات اور

استعاروں کو سمجھانا ناممکن ہے کیونکہ خواب انسان کے طرز زندگی کی پیداوار ہوتے ہیں جو مبنی ہوتے ہیں انسان کے ان حالات اور کیفیات پر جو کسی خاص موقع یا حالت میں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مثالی خوابوں کا بیان

اب میں اختصار کے ساتھ چند مثالی خوابوں کے معنی بیان کرتا ہوں لیکن ناظرین ان معنی کو ان قواعد کے مثل نہ سمجھیں جو روزمرہ کے تجربے پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ یہ تصور کریں کہ میں نے جو معنی بیان کئے ہیں وہ صرف اس لئے کہ لوگوں کو خوابوں کی ماہیت اور ان کے معنی معلوم کرنے میں مدد ملے۔

(۱) اکثر افراد خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے اور دوسرے اسی قسم کے خواب پڑنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر افراد اپنے خیالات اور جذبات میں ہیجان پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمت اور سکون قلب کو چھوڑ دیتے اور نیچے سے اوپر کی طرف جانے لگتے ہیں۔ یہ لوگ مشکلات کو عبور کرنا اور برتری حاصل کر لینا آسان بات سمجھتے ہیں لہذا اپنے خوابوں کے ذریعہ ہم پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک باہمت۔ حوصلہ مند ہیں۔ جاہ طلب شخص نیند میں بھی اپنی برتری اور جاہ طلبی کی جدوجہد سے باز نہیں آتا۔ یہ لوگ اپنے خوابوں میں گویا اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا میں اپنی کوشش جاری رکھوں؟ اور خود ہی اس کا جواب دے لیتے ہیں کہ ہاں جاری رکھ سکتا ہوں میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

(۲) بہت کم ایسے افراد ہوں گے جنھوں نے یہ خواب نہ دیکھا ہو گا کہ وہ بلندی سے گر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے نفس کو اپنے ذاتی حفاظت کی فکر اور شکست کا خوف مشکلات پر غالب آنے کے خیال سے کہیں زیادہ رہتا ہے۔

بچوں کو ڈرانا نہ چاہیے

انسان کے نفس کی یہ کمزوری واجبی ہے اس لئے کہ ہمارا مروجہ طریقہ تعلیم ہی ایسا ہے جو بچوں کو ہمیشہ ڈراتا اور ان کو اپنے بچاؤ کے لئے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ ہم بچوں کو ہمیشہ تاکید کرتے اور جتاتے رہتے ہیں کہ دیکھو کرسی پر نہ کھڑے ہو ورنہ گر پڑو گے۔ "قینچی نہ لو" "آگ سے دور رہو" وغیرہ

اس طرح بچوں کے دلوں میں فرضی خطرے اور اندیشے پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ اس میں شک ہنیں کہ حقیقی خطرے بھی ہوتے ہیں تاہم خواہ مخواہ کسی شخص کے دل میں خطرے اور اندیشے پیدا کر کے اس کو ڈرپوک اور کم ہمت کر دینا اس کو ان خطروں کا مقابلہ کرنے میں مدد ہنیں دے سکتا۔

(۳) جب لوگ بار بار خواب دیکھتے ہیں کہ وہ مفلوج ہو گئے ہیں یا یہ کہ وقت پر اسٹیشن ہنیں پہونچے اور ٹرین چھوٹ گئی تو عام طور پر اس قسم کے خواب دیکھنے والوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ "میں خوش ہوں گا اگر یہ مسئلہ یوں ہی ٹل جائے اور مجھے کوشش نہ کرنی پڑے۔ مجھے وقت گذاری کرنی چاہیئے اور اس قدر دیر سے اسٹیشن پہونچنا چاہیئے کہ ریل چھوٹ جائے"۔

(۴) بعض لوگ خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ امتحان دے رہے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ آخری عمر میں یہ امتحان دینا کیسا یا یہ کہ جن امتحانوں میں وہ کامیاب ہو چکے ہیں پھر خواب میں وہ ہی امتحانات دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس قسم کے خواب دیکھنے والوں میں بعض کو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنا ہنیں چاہتے اس لئے اس قسم کے خواب دیکھتے ہو اور بعض کو یہ معنی بتا سکتے ہیں کہ جیسا کہ تم نے ان امتحانوں میں پہلے کامیابی حاصل کی اب بھی کامیاب رہ سکتے ہو۔

ہر فرد کے خواب کے رموز اور اشارات دوسرے فرد کے رموز و اشارات سے جدا ہوتے ہیں۔ خواب کے متعلق جو چیز حقیقت میں قابل غور ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خواب سے کسی فرد کی طبیعت کس طرح متاثر ہوتی ہے اور اس کے طرز زندگی سے اسے (یعنی خواب کو) کیا ربط ہے۔

ایک عورت کا واقعہ اور خواب

ایک ۳۲ سال کی عورت جو فساد اعصاب میں مبتلا تھی علاج کے لئے میرے پاس رجوع ہوئی۔ وہ اپنے والدین کی دوسری اولاد تھی اور جیسا کہ بالعموم دوسرے نمبر کے بچے امنگ بھرے ہوتے ہیں۔ اس کی بھی وہی کیفیت تھی۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ ہر چیز میں

دوسروں پر سبقت لے جائے اور سب سے اول رہے اور اپنے مسائل کو ایسے بے داغ طریقوں سے حل کرے کہ کوئی اس پر حرف نہ رکھے۔ اس عورت کے اعصاب جواب دے چکے تھے اور اعصابی ہیجان اور پریشانی کی حالت میں وہ میرے پاس علاج کے لئے آئی تھی۔ ایک شخص سے جو عمر میں اس سے زیادہ اور شادی شدہ تھا اسے عشق ہو گیا تھا اور اس کا محبوب اپنے کاروبار میں ناکامیاب ہو گیا تھا۔ یہ عورت چاہتی تھی کہ اس شخص سے شادی کر لے لیکن اسے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ اس عورت نے خواب دیکھا کہ ہوا خوری کے لئے وہ کسی گاؤں کو گئی ہے اور وہ جاتے ہوئے اپنے رہنے کے کمرے ایک دوسرے شخص کو کرایہ پر دیدیئے وہ ان کمروں میں ٹھیر گیا۔ اور چند روز بعد شادی کر لی لیکن اپنی بیوی کی گذر بسر کے لئے کوئی ذریعہ معاش پیدا نہ کر سکا۔ چونکہ وہ جفاکش اور ایمان دار شخص نہ تھا اس لئے کمروں کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا اور یہ مجبور ہوئی کہ کمرے خالی کرالے۔ اس خواب پر سرسری نظر ڈالتے ہی ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا تعلق اس عورت کے مسئلہ حاضرہ سے ہے۔ وہ اس فکر اور تردد میں تھی کہ آیا اس کو ایک ایسے شخص سے جو شادی شدہ ہو اور جو کاروبار میں ناکامیاب رہا ہو شادی کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اس کا محبوب نادار تھا اس لئے اس کی کفالت کرنے کے قابل نہ تھا چنانچہ ایک وقت اس نے اسے کھانے کے لئے ہوٹل لے گیا لیکن کھانے کے دام نہ دے سکا۔ اس خواب کے دیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ عورت شادی کے خلاف اپنے جذبات ابھارنا چاہتی تھی۔ یہ ایک امنگ بھری لالچی عورت ہے اس لئے نادار شخص سے شادی کرنا نہیں چاہتی لہذا خواب میں استعارہ استعمال کرتی اور سوال کرتی ہے "جب کہ وہ میرے کمرے کرایہ پر لے کر کرایہ ادا نہ کر سکا تو ایسا کرایہ دار میرے کس کام کا ہے؟ اور خود ہی اپنے آپ کو جواب دے لیتی ہے کہ ہم اسے کمرے خالی کر دینا ہوگا۔" یہ شادی شدہ شخص (یعنی جس پر یہ عاشق تھی) درحقیقت اس عورت کا کرایہ دار نہیں ہے اور خواب کے شخص سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ ایک شوہر جو اپنی بیوی بچوں کی کفالت نہیں کر سکتا اس کرایہ دار کے مثل نہیں ہو سکتا جو کرایہ ادا نہیں کر سکتا

یہ عورت اپنے مشکل مسئلہ کو آسان کرنے اور اپنے طرز زندگی پر قائم رہنے کے لئے یہ جذبہ پیدا کر لیتی ہے کہ "مجھے اس شخص سے شادی نہ کرنی چاہئے" اور اس طرح عقل سلیم کے ساتھ پورے مسئلہ کو حل کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس کے ایک جز کو لے لیتی ہے پورے مسئلہ محبت و شادی کی اہمیت کو کم کر دیتی اور اس استعارے کے ذریعہ اس چیز کو ظاہر کرتی ہے کہ "ایک شخص میرے کمرے کرایہ پر لیتا ہے اگر وہ کرایہ ادا نہیں کر سکتا تو اس کو کمروں سے نکال دینا چاہئے۔"

انفرادی نفسیات کے علاج کا اصول

چونکہ انفرادی نفسیات کے طریقہ علاج کا اہم اصول یہ ہے کہ انسان کی ہمت بڑھائی جائے۔ اس کو جرات دلائی جائے کہ وہ اپنے مسائل زندگی کا مقابلہ کر سکے لہذا آسانی کے ساتھ یہ بات ہماری سمجھ میں آجاتی ہے کہ اثنار علاج میں خوابوں کی نوعیت بدل جائے گی اور مریضوں کو ایسے خواب پڑنے لگیں گے جن سے خود اعتمادی کے آثار نمایاں ہوں گے ایک بیمار عورت نے جو مالیخولیا میں مبتلا تھی صحت پانے کے قبل یہ آخری خواب دیکھا کہ وہ ایک بنچ پر تنہا بیٹھی ہوئی ہے۔ دفعتاً برف باری کا زبردست طوفان آیا اور وہ دوڑکر گھر میں آگئی اور اپنے شوہر کے پاس پناہ لی۔ اس وقت شوہر اخباروں میں ان اشتہاروں کو دیکھ رہا تھا جن میں مختلف کاموں کے لئے امیدواروں کی ضرورت بتائی جاتی ہے یہ بھی اس کام میں شوہر کو مدد دینے لگی۔

اس خواب کی تعبیر اس عورت نے خود دے لی۔ اس خواب سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے عورت اور اس کے شوہر کے باہمی تعلقات کشیدہ تھے اور بعد میں ملاپ ہو گیا۔ پہلے یہ اپنے شوہر سے بیحد نفرت کرتی تھی اور مجھ سے کئی دفعہ شکایت کی تھی کہ اس کا شوہر امنگ نہیں رکھتا اور کوئی ایسا ذریعہ معاش اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتا جس سے ان کی زندگی آرام و آسایش سے گزرے۔ بہر حال اس خواب کے معنی یہ ہیں کہ گویا وہ کہہ رہی ہے کہ "میرا شوہر کیسا بھی ہو اس کے ساتھ رہنا خود کو خطروں میں ڈالنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔" مریضہ کے حالات کا علم رکھتے ہوئے ہم اس سے

اتفاق کر سکتے اور کہہ سکتے ہیں کہ تم نے اچھا کیا جو شوہر سے سمجھوتہ کر لیا لیکن ساتھ ہی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے یہ طریقہ تو وہی ہے جو اکثر بھائی بند آپس میں ناچاقی رکھنے والے میاں بیوی کو بتاتے اور کہتے ہیں کہ جب تم میاں بیوی ہو گئے تو اب چاہے کچھ ہو ایک دوسرے کو نباہ لینا چاہیئے۔ اس بیمار کا سمجھوتہ اسی قسم کا ہے کہ خطروں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے شوہر سے صلح کر لی لیکن خوشی کے ساتھ اور دل سے اس کے ساتھ تعاون کرنے آمادہ نہیں۔

لڑکے کا واقعہ

ایک دس سال کا لڑکا میرے مطب کو لایا گیا۔ اس کے استاد نے شکایت کی کہ اس لڑکے کا سلوک دوسرے بچوں کے ساتھ بہت برا اور کمینہ ہوتا ہے۔ یہ مدرسے کی چیزیں چرا لیتا اور دوسرے طلبہ کی میزوں میں رکھ دیتا ہے تاکہ وہ مجرم قرار پائیں۔ (استاد کا یہ بیان سننے کے بعد میں نے یہ رائے قرار دی کہ) اس قسم کی حرکت اسی بچے سے صادر ہو سکتی ہے جو دوسرے بچوں کو اپنی سطح (حالت) پر لانا چاہتا ہے۔ یہ بچوں کو ذلیل کر کے بتانا چاہتا ہے کہ وہ برے اور کمینے ہیں اور وہ خود ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے خیال کیا اگر لڑکے کا مقصد یہی ہو تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ گھر میں اس کو اسی قسم کی تربیت ملی ہو گی اور گھر میں کوئی نہ کوئی ایسا ہو گا جس کو یہ مجرم قرار دینا چاہتا ہو گا۔ (دریافت سے) ہمیں معلوم ہوا کہ جب اس کی عمر ۱۰ سال کی تھی تو ایک دفعہ اس نے ایک حاملہ عورت کی طرف پتھر مارے اور اس کی سزا بھگتی۔ اس واقعہ کے وقت اگر اس کی عمر دس سال کی تھی تو اس عمر میں وہ واقف تھا کہ حمل کیا چیز ہے۔ ہمارا گمان ہے کہ یہ لڑکا حمل کو پسند نہیں کرتا تھا اور ہم معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آیا اس لڑکے کو کوئی چھوٹا بھائی یا بہن تو نہیں ہے کہ جس کا پیدا ہونا اس کو ناگوار ہوا۔ مدرس کی رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لڑکا "محلہ کی دبا" کہا جاتا۔ محلہ کے بچوں کو ستاتا اور ان کو برے ناموں سے پکارتا اور ان کے متعلق ناشائستہ باتیں کہتا اور ان کی اشاعت کرتا ہے۔ کمسن لڑکیوں کا پیچھا کرتا اور انھیں مار پیٹ کرتا ہے۔ اس بیان سے ہمیں یقین ہو گیا کہ اس کی چھوٹی بہن ضرور ہے

جس سے یہ رقابت رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس کے والدین کو دو بچے ہیں یہ لڑکا اور اس کی چھوٹی بہن جو اس سے چار سال چھوٹی ہے۔ اس کی ماں کا بیان ہے کہ یہ اپنی بہن سے محبت رکھتا اور اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتا ہے۔ ماں کا یہ بیان ہمیں صحیح نہیں معلوم ہوا اس لئے کہ اس قسم کے لڑکے کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی چھوٹی بہن سے محبت رکھے۔ آیندہ چل کر ہمیں معلوم ہوگیا کہ ہمارا شک وشبہ درست تھا۔ اس کی ماں نے یہ بھی بیان کی کہ اس کے (ماں کے) تعلقات شوہر کے ساتھ بہت ہی اچھے تھے۔ ان بیانات کے بعد بظاہر ہم یہی رائے قایم کریں گے کہ اس لڑکے کی بُری حرکات کے والدین ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اس کی فطرت ہی بری اور خراب ہے جو اس نے باپ دادا سے پائی ہے یا قسمت سے وہ ایسا ہوگیا!

نالائق اولاد

ہم اکثر سنتے ہیں کہ باوجود والدین کی گھریلو زندگی خوش گوار ہونے اور والدین کا سلوک اولاد سے اچھا ہونے کے اولاد نالایق نکلی چنانچہ ماہرین نفسیات۔ وکلاء، حکام عدالت نے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ ممکن ہے کہ والدین کی یہ مثالی زندگی ہی اس زیر بحث لڑکے کے لئے مصیبت کا باعث ہوئی ہو۔ جب وہ دیکھتا ہوگا کہ اس کی ماں نے خود کو باپ کے لئے وقف کر دیا ہے تو یہ بات اس کو سخت ناگوار گزرتی ہوگی۔ اس کی خواہش تو یہ ہوگی کہ ماں کی پوری توجہ اس کی طرف لگی رہے اس لئے ماں کا کسی اور کو چاہنا۔ محبت کرنا اس کو بُرا لگتا ہوگا۔ جب صورت حال یہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ والدین کی مثالی خوشگوار گھریلو زندگی اولاد کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ والدین کی ناخوشگوار گھریلو زندگی تو اولاد کے لئے اس سے زیادہ بدتر ہوتی ہے تو پھر اب سوال یہ ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ علاج بس یہی ہو سکتا ہے۔ بچے کو شروع سے ہی باہم تعاون کی عادت ڈالیں اور دوسروں سے مل جل کر کام کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا کر دیں۔ والدین اپنی گھریلو زندگی میں بچے کے لئے بھی جگہ نکالیں۔ بچہ صرف باپ سے ہی یا ماں سے ہی مانوس نہ ہونے پائے۔ یہ زیر بحث

لڑکا لاڈ سے بگڑا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ ماں ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ رہے اور جب کبھی محسوس کرتا ہے کہ ماں کی کافی توجہ اسے حاصل نہیں تو شرارتیں اور بری حرکتیں کرتا ہے اور دوسروں کے لئے باعث زحمت ہو جاتا ہے۔ یہاں اور ایک بات قابل ذکر ہے جس سے ہمارے خیال کی فوری تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ماں کبھی خود اس لڑکے کو سزا نہیں دیتی بلکہ ہمیشہ اس کے باپ کا انتظار کرتی ہے کہ وہ آئے اور اس کو سزا دے۔ ممکن ہے کہ ماں ایسا اس لئے کرتی ہو کہ وہ خود کو کمزور سمجھتی اور خیال کرتی ہو کہ مرد ہی حکم دے سکتا اور سزا دینے کی طاقت رکھتا ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ ماں بچے کو اپنے سے مانوس اور وابستہ رکھنا چاہتی ہو اور اس خیال سے کہ اگر وہ خود سزا دے تو انست باقی نہ رہے گی سزا نہ دیتی ہو۔ جو کچھ بھی ہو ماں اپنے اس طرز عمل سے بچے کو اس قسم کی تربیت دے رہی ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مانوس نہ ہوگا اور اس سے تعاون نہ کرے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باپ بیٹے میں کشیدگی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ ہمیں بتایا گیا کہ اگرچہ باپ اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت رکھتا ہے۔ تاہم اس لڑکے کی وجہ تمام دن کام کرنے کے بعد گھر آنا پسند نہیں کرتا۔ باپ اس بچے کو سختی سے سزا دیتا اور اکثر مارتا پیٹتا ہے۔ ہم سے کہا گیا کہ یہ لڑکا باپ کو پسند کرتا ہے لیکن یہ بات ممکن نہیں کہ باپ اتنی سختی کرے اور پھر لڑکا اس کو پسند کرے۔ بات یہ تھی کہ لڑکا بڑا چالاک تھا اور بڑی ہشیاری اور مکاری سے باپ سے اپنے حقیقی جذبات چھپاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے ساتھ جیسا چاہیئے کھیلتا نہیں اور اکثر اس کو طمانچے مارتا اور لاتیں رسید کرتا ہے۔ اس کو کھانے کے کمرہ میں سلایا جاتا تھا اور اس کی بہن پلنگ پر والدین کے ساتھ ان کے کمرہ میں سوتی تھی۔ اب اگر ہم خود کو اس لڑکے کی جگہ رکھیں یا اگر اس سے کچھ ہمدردی رکھیں تو یہ بہن کا پلنگ پر والدین کے ساتھ سونا ہمیں کسی قدر پریشان کریگا۔ اگر ہم لڑکے کے دل و دماغ سے غور کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ لڑکا ماں کی توجہ اور اس کی قربت چاہتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ رات کو

بہن ماں کے اس قدر قریب رہتی ہے لہذا مجھے اس کو (یعنی ماں کو) اپنے قریب رکھنے کے لئے لڑنا اور مقابلہ کرنا چاہئے۔ لڑکے کی صحت بہت اچھی ہے۔ اس کی پیدائش معمولی طور پر ہوئی اور اس کو شروع میں ماں نے دودھ پلایا جب اس کو شیشی سے دودھ دیا جانے لگا تو وہ دودھ نکال دینے لگا اور اس کا سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ اب اگرچہ وہ خوب کھاتا ہے۔ موٹا تازہ ہے لیکن اس پر بھی اس کو معدہ کی خرابی کی شکایت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا معدہ کمزور ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں اس نے حاملہ عورت پر پتھر پھینکے تھے۔ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں بہت نفاست پسند تھا۔ جب کبھی گھر کا کھانا اُسے پسند نہ آتا تو ماں اس کو پیسے دے دیتی تھی اور وہ باہر سے جو چاہتا خرید کر کھا لیا کرتا تھا اور اس کے باوجود ہمسایوں سے شکایت کرتا کہ والدین اسے پیٹ بھر کھانا نہیں دیتے۔ یہ ایک چال تھی جو وہ ہمیشہ چلتا تھا اور اس طرح دوسروں کو بدنام کر کے اپنی 'برتری' کا احساس قائم رکھنا چاہتا تھا۔ ان واقعات کا علم ہونے کے بعد ہمیں اس لڑکے کا وہ خواب بھی سمجھ میں آ گیا جو اس نے مطب میں آنے کے بعد بیان کیا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ امریکا کا ایک چرواہا ہے۔ اس کو جبراً میکزیکو کو بھیج دیا گیا اور بڑی مشکل سے لوگوں سے لڑتا بھڑتا امریکا واپس آیا۔ ایک دفعہ میکزیکو کے ایک باشندہ نے اس کو روکنا چاہا اور اس نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ اس خواب سے لڑکے کا جو جذبہ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے "میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں مجھے لڑنا اور کشمکش کرنا چاہئے۔" لڑکا جانتا تھا کہ امریکا میں چرواہے سورما سمجھے جاتے ہیں۔ لہذا اس نے خیال کر لیا کہ کمسن لڑکیوں کا پیچھا کرنا اور لوگوں کے پیٹ پر لاتیں مارنا بڑی بہادری کا کام ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پیٹ یا معدہ کو اس کی زندگی میں بڑا دخل ہے اور یہ اس کو ہر وقت اپنی فتح و کامیابی کا ذریعہ بناتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ بچپن میں اس لڑکے کو ضعف معدہ کی شکایت رہی۔ اس کا باپ اعصابی ضعف معدہ میں مبتلا تھا۔ القصہ اس کے گھر میں ضعف معدہ کی شکایت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی لہذا اس لڑکے کا مطمح نظر ہی یہ ہو گیا کہ لوگوں کے کمزور عضو

یعنی معدہ پر حملہ کرے۔ اس کے خواب اور اس کے افعال دونوں سے اس کا ایک ہی طرز زندگی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ لڑکا خواب کی زندگی بسر کر رہا ہے اگر ہم اسے بیدار نہ کریں تو تمام عمر اس کی یہی حالت رہے گی۔ وہ نہ صرف اپنے باپ۔ بہن۔ دوسرے چھوٹے بچوں اور لڑکیوں سے ہی لڑتا رہے گا بلکہ اپنے معالج سے جو اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہو جھگڑا کرے گا۔ اس کے خواب کی تحریک اس کا دل بڑھاتی رہے گی کہ "ہاں اے سورما اسی طرح چلتا رہ اور دوسروں کو نیچا دیکھاتا جا" اس لڑکے کا علاج سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کو صاف طور پر سمجھا دیا جائے کہ اس نے خود کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر لیا ہے اور اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ اس لڑکے کا علاج شروع کیا جاتا ہے اور اس کو اس کے خواب کے معنی بتا دیئے جاتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں ہے جہاں سب اس کے مخالف ہیں اور جہاں کا ہر باشندہ اس کو سزا دیتا اور اس کو جبراً میکزیکو میں رکھنا چاہتا ہے۔ یہ سب لوگ اس کے دشمن ہیں۔ دوسری دفعہ جب وہ مطب کو آتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اب تمہارا کیا حال ہے؟ ہم سے پہلی ملاقات کے بعد تم پر کیا گزری؟ لڑکا جواب دیتا ہے "میں ایک خراب اور برا لڑکا رہا۔" ہم پوچھتے ہیں تم نے کیا کیا؟ تو کہتا ہے "میں نے ایک کمسن لڑکی کا پیچھا کیا۔" اس جواب سے ظاہر ہے کہ یہ ایک سیدھا سادا اعتراف غلطی نہیں ہے بلکہ اس میں شیخی اور گستاخی بھری ہوئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مطب میں ہے جہاں اس کی اصلاح کی کوشش کی جارہی ہے اس کا بے باکی سے اقرار کرنا کہ اس نے شرارت کی اور برا لڑکا رہا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی اصلاح نہیں چاہتا اور گویا کہ کہتا ہے "میری اصلاح کی امید مت رکھو ورنہ میں تمہارے بھی پیٹ میں لات مار دونگا۔" اب بتائیے کہ ہم اس لڑکے کو کیا کریں؟ یہ اب تک خواب ہی دیکھ رہا اور خود کو سورما تصور کر رہا ہے۔ ہمیں اب یہ کرنا چاہیئے کہ اس کے اس لطف اور مزے کو جو وہ اپنی موجودہ حالت سے حاصل کر رہا ہے کم کر دیں۔ پس ہم نے اس سے سوال کیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا خیالی سورما کسی چھوٹی لڑکی کا پیچھا کریگا؟ کیا یہ بہادری یا

سورماپن کی بری نقالی نہیں ہے؟ اگر تم سورما بننا چاہتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ تم کسی اپنے سے بڑی اور طاقت ور لڑکی کا پیچھا کرو یا یہ کہ کسی لڑکی کا بھی پیچھا نہ کرو اور نہ تاڑو۔ علاج کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہم اس لڑکے کی آنکھیں کھول دیں اور اس کو اس کی طرز زندگی سے نفرت دلا دیں جیسا کہ ضرب المثل ہے "اس کے شوربے تھوک دیں"۔ اس کے بعد وہ اپنا شوربا پینا ہی پسند نہ کریگا۔ دوسرا طریقہ یا علاج کا رُخ یہ تھا کہ ہم اس کو ہمت دلائیں اور سمجھائیں کہ وہ دوسروں سے تعاون کرے اور زندگی کے مفید راستے اختیار کرے اور اس طرح نام کمائے۔ کوئی شخص زندگی کا بُرا رخ (یا راستہ) اس وقت تک اختیار نہیں کرتا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ اگر وہ صحیح رخ اختیار کرے تو اس میں سے کامیابی نہ ہوگی۔

ایک لڑکی کی مثال

ایک لڑکی جس کی عمر ۲۴ سال کی تھی اور جو تنہا رہا کرتی اور سکریٹری کا کام کرتی تھی میرے پاس آئی اور اس نے شکایت کی کہ اس کا افسر بالا اس کو ہمیشہ ستاتا اور دق کرتا ہے اور کہا کہ وہ کبھی کسی سے دوستی نہیں کر سکتی اور نہ دوست احباب رکھتی ہے۔ تجربہ کی بنا پر تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دوست احباب نہیں رکھتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر مسلط ہونا اور حکومت کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ اپنی ذات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کا نصب العین زندگی صرف یہی ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی برتری دوسروں پر جتاتا رہے۔ کیا عجب کہ اس لڑکی کا افسر بھی اسی ذہنیت کا شخص ہو اور یہ دونوں ایک دوسرے پر حکومت کرنا چاہتے ہوں۔ جب دو اس قسم کے فرد ایک جگہ جمع ہوں تو پھر مشکلات کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

دریافت سے معلوم ہوا کہ سات بچوں میں یہ لڑکی سب سے چھوٹی اور والدین کی بیحد لاڈلی ہے۔ بچپن سے اس کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ اس کو لڑکا تصور کیا جائے اس لئے گھر میں اس کو "ٹام" پکارتے تھے۔ یہ سن کر ہماری بدگمانی بڑھ گئی اور ہم نے دل میں کہا کہ اس کا "نصب العین برتری" یہی ہے کہ اپنی 'برتری' دوسروں پر ظاہر کرے۔

وہ سمجھتی ہے کہ لڑکا ہونا گویا کہ آقا اور افسر ہونا ہے اور خود بلا کسی کے محکوم ہونے کے دوسروں پر قابو پانا اور حکومت کرنا ہے۔ لڑکی خوبصورت ہے اور سمجھتی ہے کہ لوگ اسے اس کے حسن کی وجہ پسند کرتے ہیں۔ اسے ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں اس کے جسم کو کوئی صدمہ نہ پہونچے ایسا کہ اس کا حسن بگڑ جائے ان دنوں حسین لڑکیوں کے لئے دوسروں کو متاثر کرنا اور ان پر تسلط حاصل کر لینا آسان ہے اور یقیناً یہ لڑکی اس بات سے واقف ہے لیکن چونکہ وہ لڑکا بننا اور مردانہ حیثیت سے دوسروں پر حکومت کرنا چاہتی ہے اس لئے وہ اپنے حسن پر نازاں وشاداں نہیں معلوم ہوتی۔

اس لڑکی کی بچپن کی یادداشت یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے ڈر گئی تھی اور اس نے بیان کیا کہ اب بھی اس کو چوروں اور دیوانوں سے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ اس پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ یہ بات تعجب خیز معلوم ہوگی کہ ایک لڑکی جو ہمیشہ مرد ہونا پسند کرتی رہی ہو چوروں اور دیوانوں سے اس قدر ڈرتی ہو لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ درحقیقت وہ کم زور ہے اور اس کمزوری کا احساس ہی اس کے برتری کا نصب العین قائم کر لینے کا باعث ہوا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ایسے حالات بیں زندگی بسر کرے کہ دوسروں پر غالب آنے اور حکومت کرنے کا اس کو ہمیشہ موقع رہے اس کے سوائے اور حالات کو وہ نظر انداز کر دیتی ہے۔ چوروں اور دیوانوں پر قابو پانا چونکہ اس کے لئے مشکل ہے اس لئے ان کا وجود اس کو گوارا نہیں اور انھیں بالکلیہ مٹا دینا چاہتی ہے وہ آسان طریقے سے مرد بننا چاہتی ہے اور جب کبھی ناکامیاب ہوتی ہے تو حالات کی اہمیت کم کر کے انھیں اپنی مرضی کے موافق بنانے کی کوشش کرتی ہے اس لڑکی کا اپنی حقیقی جنس سے نفرت رکھتے ہوئے مرد بننے کا تصور ثابت کرتا ہے کہ وہ جذباتی کشمکش بیں مبتلا ہے اور اپنے دل میں کہتی ہے کہ "میں مرد ہوں اور عورت کی کمزوریوں اور دشواریوں کا مقابلہ کر رہی ہوں"

اب آیئے ہم دیکھیں کہ آیا اس لڑکی کے خوابوں بیں بھی اس قسم کے جذبات کا پتہ چلتا ہے یا نہیں۔ لڑکی نے بیان کیا کہ وہ اکثر خواب دیکھتی ہے کہ وہ تنہا چھوڑ دی گئی ہے۔

چونکہ اس کو بے موقع لاڈ دیا گیا تھا اس کے ان خوابوں کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ گویا وہ کہتی ہے "میری نگرانی کی جائے۔ مجھے اس طرح تنہا چھوڑ دینا مناسب نہیں ممکن ہے کہ کوئی مجھ پر حملہ کرے اور مجھ پر قابو پائے۔"

ایک دوسری چیز جو وہ ہمیشہ خواب میں دیکھتی ہے یہ ہے کہ وہ اپنے روپیوں کی پاکٹ کھودی ہے۔ اس خواب کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود کو آگاہ کرتی اور کہتی ہے کہ "خبردار ہو جا خطرہ ہے کہ تو کوئی چیز کھو نہ دے"۔ یہ لڑکی یوں تو کوئی چیز کھونا نہیں چاہتی لیکن خصوصاً دوسروں پر قابو پانے اور حکومت کرنے کی طاقت کو کبھی کھونا نہیں چاہتی لیکن زندگی میں صرف ایک چیز کھونا پسند کرتی ہے یعنی روپیوں کی پاکٹ۔

پہلے ایک مثال دی گئی اب یہ مزید مثال بھی ظاہر کرتی ہے کہ خواب افراد کے جذبات کو ہیجان میں لاکر ان کی قایم شدہ طرز زندگی کی مدد کرتے اور قوت پہنچاتے ہیں۔ درحقیقت اس لڑکی کی روپیوں کی پاکٹ کبھی کھوئی نہیں گئی لیکن اس نے خواب میں دیکھا کہ کھوگئی اور یہ خیال دل میں رہ گیا۔

اب اس لڑکی کا ایک لمبا خواب بیان کیا جاتا ہے جس سے اس کی طرز زندگی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک پیراکی کے حوض کو گئی اور وہاں بہت لوگ تھے۔ کسی نے دیکھا کہ وہ (یعنی لڑکی) لوگوں کے سروں پر کھڑی ہے اور اس نے محسوس کیا کہ کوئی چلا اُٹھا اور وہ گر پڑنے کے قریب ہوگئی۔ اگر میں بت گر ہوتا تو میں اس لڑکی کی مورتی تیار کرتا کہ یہ لوگوں کے سروں پر کھڑی ہوئی ہے اور لوگوں کے سر اس کی مورتی کے لئے کرسی کا کام دے رہے ہیں۔ یہی اس کا طرز زندگی ہے اور یہی وہ جذبات ہیں جو وہ اپنے میں بھڑکانا پسند کرتی ہے لیکن ساتھ ہی خیال کرتی ہے کہ وہ خطرے میں ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے اس خطرے کو محسوس کریں۔ دوسرے لوگ اس کو دیکھتے رہیں اور خبردار رہیں کہ وہ لوگوں کے سروں پر سے نیچے نہ گر پڑے۔ پانی میں تیرنا بھی اس کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ غرض اس کا قصہ یہ ہے کہ اس نے اپنا نصب العین زندگی یہ قرار دے رکھا ہے کہ

"باوجود لڑکی ہونے کے میں مرد ہونا چاہتی ہوں"۔ جیسا کہ عام طور پر سب سے چھوٹے بچے امنگ بھرے ہوتے ہیں یہ بھی امنگ بھری ہے لہذا اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنے کے عوض دوسروں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن ساتھ ہی ناکامی کا خیال اسے ہمیشہ پریشان کرتا ہے۔ اب اگر ہم اس لڑکی کی کچھ مدد کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم اس کو آمادہ کریں کہ وہ اپنی جنس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے اور دوسری جنس والوں (یعنی مردوں) کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دے۔ دوسروں کو اپنے برابر سمجھ کر ان سے مل جل کر رہے اور ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ایک اور لڑکی کی مثال

ایک لڑکی نے جس کا ایک ۱۳ سال کا بھائی ایک حادثہ سے فوت ہو گیا تھا اپنی ابتدائی یادداشت اس طرح بیان کی:-

"میرا بھائی جب بالکل بچہ تھا اور چلنا سیکھ رہا تھا ایک دفعہ کرسی کے سہارے کھڑا ہونے کے لئے کرسی کو تھاما اور کرسی اس پر گر پڑی۔"

یہاں بھی حادثہ کا ذکر ہے اور اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس لڑکی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ یہ تصور کرنے لگی ہے کہ دنیا خطروں سے بھری ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے ایک خواب بھی بیان کیا اور کہا کہ یہ خواب وہ اکثر دیکھتی ہے۔

خواب

"میں دیکھتی ہوں کہ گلی کوچوں میں پھر رہی ہوں جہاں زمین میں گڑھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں پانی بھرا ہوتا ہے۔ میں ان گڑھوں کو دیکھ نہیں سکتی اور ان میں گر پڑتی ہوں اور جیسے ہی پانی جسم کو لگتا ہے کود پڑتی اور بیدار ہو جاتی ہوں۔ دیر تک میرا دل دھڑکتا رہتا ہے۔"

اس خواب کو ہم اس قدر عجیب نہیں سمجھتے جتنا کہ لڑکی خود سمجھتی ہے۔ جب تک کہ وہ اس خواب سے ڈرتی رہے گی اس کو پراسرار سمجھتی رہے گی اور اس کے معنی نہ سمجھ سکے گی۔ اس خواب کے معنی یہ ہیں کہ گویا وہ اسے کہہ رہا ہے "ہشیار رہ۔ دنیا

میں متعدد ایسے خطرے ہیں جن سے تو واقف بھی نہیں" یہ خواب ہم کو اس سے زیادہ بتاتا ہے۔ وہ لڑکی کو یہ بھی کہتا ہے کہ اگر تم پستی کی حالت میں رہو گی تو گرنے نہ پاؤ گی اگر 'برتری' کا ارادہ کرو گی تو گرنے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ یہ لڑکی ہمیشہ گرنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ اس کا نصب العین یا مقصد زندگی 'برتری' حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ ابھی پچھلی مثال میں بتایا گیا یہ لڑکی گویا کہتی ہے "میں سب سے برتر و اعلیٰ ہوں۔ لیکن مجھے ہشیار رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ میں کم تر اور پست ہو جاؤں"

ایک اور مثال

ہم ایک اور مثال بیان کرتے ہیں۔ اس میں بھی ابتدائی یادداشت سے "طرز زندگی" ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکی نے ہم سے بیان کیا:۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں میں نے ایک گھر تعمیر ہوتا دیکھا اور اس سے مجھے بڑی دلچسپی ہو گئی۔" اس یادداشت سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لڑکی تعاون پسند ہے۔ ایک بہت ہی کمسن لڑکی تعمیر مکان میں کوئی عملی حصہ تو نہیں لے سکتی لیکن دوسروں کو مل کر کام کرتا ہوا دیکھ کر خوش ہو سکتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔ "میں بالکل کمسن تھی اور ایک بلند دریچہ کے پاس کھڑی تھی۔ دریچے کے شیشے مجھے آج بھی ایسے ہی خوب یاد ہیں کہ گویا کل ہی انھیں دیکھا ہے۔" اس نے دریچے کا بلند ہونا یاد رکھا اس سے ظاہر ہوا کہ اس کو اس عمر میں پست و بلند کا اندازہ تھا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتی ہے۔ "دریچہ بڑا بلند تھا اور اس کے مقابل میں بہت چھوٹی اور پست تھی۔" مجھے لڑکی سے آئندہ یہ سن کر تعجب نہ ہو گا کہ اس کو اپنے پست قد ہونے کا احساس ہے۔ اور اس لئے اسے مختلف پیمایش رکھنے والے اشیائ کے مقابلے کرنے کا شوق ہے۔ بیان میں لڑکی کا "خوب یاد ہے" کہنا اس کی شیخی ہے۔

اب ہم اس لڑکی کا ایک خواب بیان کرتے ہیں:۔

خواب

"میرے ساتھ اور کئی لوگ موٹر کار میں سوار تھے۔" جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا

لڑکی تعاون پسند ہے اس لئے دوسروں کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے۔ (سلسلہ خواب) ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک جنگل کے پاس ٹھیرے اور ہر شخص موٹر سے اتر کر دوڑتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا۔ اکثر افراد مجھ سے بڑے اور اونچے قد کے تھے۔" خیال رہے کہ یہاں لڑکی دوسروں کے قدوں سے اپنے قد کا مقابلہ کر رہی ہے۔ (سلسلہ خواب) "لیکن میں بھی وقت پر پہونچ گئی اور ایلویٹر (بلندی پر پہونچانے والی کل) پر دوسروں کے ساتھ سوار ہو گئی اور وہ ہمیں ایک معدن میں دس فیٹ نیچے اتارا اور ہم نے خیال کیا کہ اگر ہم ایلویٹر سے اتر کر معدن میں جائیں تو ممکن ہے وہاں کی زہریلی ہوا سے ہمیں نقصان ہو۔" اب لڑکی خطرہ محسوس کر رہی ہے اکثر افراد کسی نہ کسی چیز سے ڈرتے ہیں۔ انسان کچھ زیادہ بہادر واقع نہیں ہوا۔ (سلسلہ خواب) "ہم سب خیریت سے معدن میں داخل ہوئے" لڑکی اب اظہار رجائیت کر رہی ہے یعنی اس کا اب دل بندھا ہے اور وہ خوش امید ہے۔ جو شخص تعاون پسند ہوتا ہے وہ ہمیشہ بہادر اور رجائی ہوتا ہے۔ (سلسلہ خواب) "ہم معدن میں ایک منٹ ٹھیرے اور پھر باہر آکر دوڑتے ہوئے موٹر کار کے پاس پہونچ گئے۔" لڑکی کا یہ خواب سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکی تعاون پسند ہے لیکن ساتھ ہی احساس رکھتی ہے کہ اسے موٹا تازہ اور بلند قد ہونا چاہئے۔ اس کے دل میں جو کشمکش ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی اور لوگوں کو پسند کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اپنی کمتری کا احساس بھی رکھتی ہے۔

◆

چھٹی فصل

گھر اور خاندان کے اثرات

ماں اور بچے کا تعلق

بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں سے مانوس ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ کئی مہینوں تک بچے کی پرورش میں ماں کو بڑا دخل اور اس کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بچہ ماں کا پوری طرح محتاج ہوتا ہے یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ بچے میں تعاون کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ماں ہی بچہ کو کسی اور فرد کے ساتھ ملاتی اور اپنے سوائے کسی اور سے بھی دلچسپی پیدا کرنے کا اُسے عادی کرتی ہے۔ ماں گویا کہ بچے کی اور سماجی زندگی کے درمیان ایک پل کا کام دیتی ہے۔ وہ بچہ جو اپنی ماں سے یا ماں کے نہ ہونے کی صورت میں کسی اور فرد سے مانوس نہیں ہو سکتا وہ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ تلف ہو جاتا ہے۔

ماں کا تعلق بچے کے ساتھ اس قدر گہرا ہوتا ہے اور بچے پر اس کا اس قدر دور رس اثر پڑتا ہے کہ بچہ بڑا ہونے کے بعد اس کے خاندانی اثرات اور خصوصیات معلوم کرنا ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ بچہ جو موروثی میلانات اور رجحانات لے کر پیدا ہوتا ہے وہ ماں کی تعلیم اور تربیت سے مسخ ہو جاتے یا بالکل بدل جاتے ہیں۔ ماں کی قابلیت یا ناقابلیت کا اثر بچے کی آئندہ امکانی قوتوں اور صلاحیتوں پر پڑتا ہے۔ یہاں ماں کی قابلیت سے ہمارا مطلب ماں کے بچے کے ساتھ تعاون کرنے اور بچے کو اپنے ساتھ تعاون کرنے کی عادت ڈالنے کی قابلیت سے ہے۔ یہ قابلیت مقررہ قواعد و ضوابط کے ذریعہ پیدا نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ ہر روز نئے حالات اور نئے

مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہزاروں معاملات پیش آتے ہیں جن کا ماں کو اپنی سمجھ بوجھ سے بچے کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصفیہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ماں اپنے بچے سے دلچسپی رکھے اور بچے کی محبت حاصل کر کے اس کی بھلائی اور بہتری کے لئے اپنا وقت صرف کرے تو ایسی ماں دانشمند سمجھی جائے گی۔

ماں کو بچوں کی پرورش اور تربیت کے طریقوں سے واقف ہونا چاہیئے

ماں کے تمام افعال اور سرگرمیوں سے اس کا بچے کے ساتھ سلوک کیا ہے معلوم ہو جاتا ہے۔ ماں کا بچہ کو اٹھانا۔ گود میں لینا اس سے باتیں کرنا۔ نہلانا۔ کھلانا۔ پلانا یہ سب ایسے مواقع ہیں کہ جن میں ماں بچے کو اپنے سے مانوس کر سکتی ہے۔ اگر ان کاموں کی تربیت ماں نے نہ حاصل کی ہو تو وہ انھیں بری طرح اور بدتمیزی سے انجام دے گی اور بچہ بطور احتجاج ضد کریگا۔ اگر ماں بچے کو نہلانے کے طریقہ سے واقف نہ ہو تو بچے پر نہانا تلخ گزرے گا اور بچہ ماں سے مانوس ہونے اور اس سے ہل جانے کے عوض اس سے بھاگنے لگے گا۔ ماں کو چاہیئے کہ بچے کو سلانے کے طریقوں اور موزوں لوریوں سے بخوبی واقف ہو۔ اسی طرح اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کب بچے کو تنہا چھوڑ دینا چاہیئے اور کب اس کے پاس رہنا اور اس کی نگرانی کرنی چاہیئے۔ ماں کو چاہیئے کہ بچے کے پورے ماحول کا خیال رکھے مثلاً تازہ ہوا۔ کمرے کا ٹمپریچر۔ غذا۔ لباس۔ سونے کے اوقات۔ پیشاب پاخانے کے اوقات۔ صفائی وغیرہ۔ ان اوقات اور حالات میں ماں بچے کو موقع دیتی ہے کہ وہ اسے پسند کرے یا ناپسند کرے۔ اس کا تعاون حاصل کرے یا اسے رد کرے۔

مادریت کی تعلیم

مادریت میں مہارت حاصل کرنے کے لئے باطنی قوت کی ضرورت نہیں۔ دلچسپی اور تربیت پانے سے یہ مہارت حاصل ہوتی ہے۔ مادریت کے لئے لڑکی کی بچپن سے تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی ابتدائی منزل وہ ہے جبکہ لڑکی اپنے سے چھوٹے بچوں سے دلچسپی ظاہر کرنے لگتی ہے اور بچوں کی پرورش۔ اپنے آئندہ کے فرائض سے اپنا شوق ظاہر کرتی ہے۔

لڑکے اور لڑکیوں کو ملا کر تعلیم نہ دینا چاہیئے

لڑکوں اور لڑکیوں کو ملا کر تعلیم دینا نہایت نامناسب ہے اس لئے کہ زندگی میں ان کے فرائض بالکل جدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مائیں بچوں کی دیکھ بھال میں ماہر ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم لڑکیوں کو مادریت کے لئے اس طرح سے تربیت کریں کہ وہ آئندہ مائیں ہونا پسند کریں اور اس کو ایک تخلیقی فعل تصور کریں اور جب مائیں بنیں تو اپنی اس حالت سے مایوس اور رنجیدہ نہ ہوں۔ بدقسمتی سے ہماری تہذیب میں بسا اوقات عورت کی مادریت کو بہت کم وقعت اور اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر ہم لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے رہیں۔ لڑکوں کے مشاغل کو لڑکیوں کے مشاغل سے اعلیٰ سمجھتے رہیں تو ظاہر ہے کہ لڑکیاں اپنے فرائض کو ناپسند کریں گی۔ کیونکہ کوئی بھی کمتر موقف میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایسی لڑکیاں جو اپنے مشاغل و فرائض سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ جب ان کی شادی ہو جاتی ہے اور یہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو کسی نہ کسی طریقہ سے اُس صورت حال کی مخالفت کرنے لگتی ہیں۔ وہ صاحب اولاد ہونے کے لئے نہ تو تیار رہتی ہیں اور نہ اس کو پسند کرتی ہیں۔ انھیں بچوں کی مطلق آرزو نہیں ہوتی اور یہ بچے جننے کو ایک تخلیقی فعل تصور نہیں کرتیں۔

مادریت کا مسئلہ ہمارے سماج کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کے حل کرنے کے لئے ہم معمولی کوشش بھی نہیں کرتے انسانی سماج کا پورا انحصار اس چیز پر ہے کہ عورت مادریت کو کیا سمجھتی ہے۔

ہر ملک میں عورتوں کے مشاغل اور فرائض کو کم درجے کا سمجھا جاتا ہے اور انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بھی لڑکے گھر کے کام کاج کو ملازم کا فرض سمجھتے ہیں اور ان کاموں میں مدد دینا۔ ہاتھ بٹانا اپنے لئے بے عزتی کا باعث تصور کرتے ہیں۔ گھر کی نگہداشت اور امور خانہ داری کی تکمیل عورتوں کا خاص حصہ نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کو عورتوں کے لئے ایک کڑی محنت خیال کیا جاتا ہے۔

خانہ داری

اگر عورت پر یہ بات واضح ہو جائے کہ خانہ داری ایک فن ہے جس میں

وہ دلچسپی لے سکتی اور اس کے ذریعہ سے دوسروں کی زندگی کا بوجھ ہلکا کرسکتی، اس کو مالا مال کرسکتی ہے تو عورت خانہ داری کو اپنی زندگی کا ایک ایسا اہم شغل قرار دے لے گی جیسا کہ دنیا کے اور دوسرے اہم شغل ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم خانہ داری کو مردوں کے لئے باعث ذلت تصور کریں تو کیا عجب ہے کہ عورتیں بھی اس سے اظہار نفرت کریں اس کی انجام دہی سے انکار کریں اور ہم سے سوال کریں کہ کیا عورتیں ہر بات میں مردوں کے برابر نہیں؟ کیا انھیں بھی اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو بڑھانے کا موقع ویسا ہی نہ دیا جانا چاہیئے جیسا کہ مردوں کو حاصل ہے؟ یہ سچ ہے کہ انسان کی صلاحیتیں سماجی تاثرات کے ذریعہ نشو ونما پاتی اور ترقی کرتی ہیں لیکن سماجی تاثرات جب ہی ان صلاحیتوں کو ترقی کے صحیح راستے پر لگاتے ہیں جب کہ کوئی خارجی رکاوٹیں ان کی نشو ونما کے راستے میں حائل و مانع نہ ہوں۔

شادی ہو جانے کے بعد اگر عورت کے فرائض کو کم اہم سمجھا جائے تو گھریلو زندگی بدمزہ اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ کوئی عورت اگر بچوں کو پالنے اور ان کی پرورش کرنے کو حقیر و ذلیل کام تصور کرے گی تو بچوں کی نگہداشت کے لئے جن امور کی تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً بچوں کی خبر گیری۔ مزاج دانی۔ ہمدردی وغیرہ ان میں کبھی بھی تربیت نہ پائے گی اور مہارت حاصل نہ کرے گی۔ وہ عورت جو اپنے جنس کو ناپسند کرتی ہے تو زندگی میں اس کا نصب العین ایسا قایم ہو جاتا ہے کہ اس کے تعلقات اپنے بچوں کے ساتھ کبھی بھی اچھے نہیں رہتے۔ ایسی عورت کا نصب العین زندگی بچوں کے نصب العین کے مطابق نہیں ہوتا چونکہ وہ ہمیشہ اپنی برتری کے اظہار کی فکر میں کھوئی ہوئی رہتی ہے اس لئے بچوں کا وجود اس کے لئے وبال جان ہو جاتا ہے۔

زندگی میں ناکامی کا باعث مائیں ہوتی ہیں

اگر ہم ان افراد کی زندگی پر غور کریں جو دنیا میں ناکامیاب رہے ہوں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان سب کی ناکامیابی کا باعث ان کی مائیں ہوئی ہیں کہ انھوں نے اپنے فرائض مادری خاطر خواہ انجام نہیں دیئے۔ اس لئے ان ناکامیاب افراد کو بچپن میں اچھے طور اور طریقہ سے اپنی

زندگیاں شروع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اگر مائیں اپنے مادری فرائض کو ناپسند کریں۔ ان میں دلچسپی نہ لیں اور ان کی انجام دہی میں ناکامیاب رہیں تو پھر نوع انسان معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔

اولاد کی زندگی میں ناکامیابی کے لئے ہم ماں کو مجرم قرار نہیں دے سکتے۔ جرم کا سوال نہیں ہے ممکن ہے کہ ماں نے خود "تعاون" کی تربیت نہ پائی ہو یا یہ کہ اس کی گھریلو زندگی ناخوشگوار اور تکلیف دہ رہی ہو اور وہ اپنی حالات کی وجہ پریشان اور فکر زدہ رہتی ہو۔ شادی کے بعد کئی ایسے اسباب پیدا ہو جا سکتے ہیں جو گھر کی زندگی کے عمدگی اور اطمینان کے ساتھ بسر ہونے میں مانع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ماں ہمیشہ بیمار رہتی ہو تو باوجود بچوں کی خدمت کا احساس رکھنے کے ان کی جیسی چاہیے خدمت نہیں کر سکتی۔ اگر ماں روزانہ محنت مزدوری کے لئے جاتی ہو تو شاید تھکی ماندی گھر واپس آتی ہو۔ اگر گھر کی معاشی و مالی حالت خراب ہو تو ماں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ بچوں کو کافی غذا دے اور موسم کے لحاظ سے مناسب لباس فراہم کر سکے اس کے علاوہ بچوں کے زندگی کے تجربے ان کے کردار اور اعمال کا باعث نہیں ہوتے بلکہ وہ نتائج جو بچے تجربوں سے اخذ کرتے ہیں ان کا کردار قائم کرتے ہیں۔ جب ہم کسی مسئلی بچے کے حالات دریافت کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اور اس کی ماں کے تعلقات چند مشکلات کی وجہ اچھے نہیں رہے۔ بعض معمولی بچوں کی صورت میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے لیکن (فرق اتنا ہے) کہ یہ بچے مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کرتے انھیں بڑھنے اور اپنے اور اپنی ماؤں کے تعلقات کو متاثر کرنے نہیں دیتے۔

انفرادی نفسیات کا ایک اصول

یہاں ہم پھر انفرادی نفسیات کا ایک اصول بیان کرتے ہیں۔ کردار اور اخلاق کے بننے کے کوئی وجوہ نہیں ہوتے لیکن بچہ اپنے تجربات کو اپنے نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکتا اور ان تجربوں کو وجوہ قرار دے لے سکتا ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر کسی بچے کو کافی غذا نہ ملی ہو تو وہ آگے چل کر مجرم ہو گا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے تجربات زندگی سے

کیا نتائج بر آمد کئے۔

مادریت کی قوت

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے جنس سے ناخوش رہے گی تو اسے زندگی میں مشکلات اور کشمکش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مادریت میں جو قوت ہے اس سے ہم واقف ہیں تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ بچوں کی نگرانی اور حفاظت کا میلان ماں میں اس کے دوسرے میلانوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جانوروں میں مثلاً چوہوں اور بندروں میں مادریت کی خواہش بہ نسبت جنسی خواہش کے زیادہ ہوتی ہے ایسا کہ اگر ان دونوں میں انھیں انتخاب کا موقع ملتا ہے تو وہ مادریت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مادریت کی طرف میلان جنسی خواہش کی وجہ نہیں ہوتا بلکہ تعاون کی خواہش کی وجہ ہوتا ہے۔ (یعنی جن کا نصب العین تعاون ہو وہ مادریت پسند کرتے ہیں) اکثر و بیشتر ماں اپنے بچے کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتی ہے۔ بچوں کے ذریعہ ماں کا تعلق پوری زندگی سے قایم ہوتا ہے اور وہ خود کو حیات اور ممات کا مالک تصور کرتی ہے۔ ہر ماں کا یہی تصور ہوتا ہے کہ بچے جن کر اس نے ایک تخلیقی کام انجام دیا ہے بلکہ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اس نے بچے پیدا کئے جیسا کہ خدا پیدا کرتا ہے یعنی نیستی سے ایک جاندار انسان کو ہستی میں لائی۔

مادریت کی خواہش حقیقت میں انسان کی برتری حاصل کرنے کی کوشش کا ایک رخ ہے یعنی انسان خدا کے مثل ہونا چاہتا ہے۔ ہمارے لئے یہ ایک بہترین مثال ہے جس سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نصب العین سے کام لے کر پورے سماجی جذبات کے ساتھ کس طرح نوع انسان سے دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے اور ان کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ ماں اس احساس کو کہ اس کا بچہ اس کا ایک جزء ہے بہت بڑھا دے سکتی اور اس کو اپنا نصب العین برتری کا حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لے سکتی ہے۔ ماں یہ بھی کوشش کرتی ہے کہ بچے کو اپنا محتاج بنا لے اور اس کی زندگی

ایک عورت کا واقعہ ہم ایک کسان عورت کا جس کی عمر ۷۰ سال تھی حال بیان کرتے ہیں۔ اس عورت کا ایک لڑکا جس کی عمر ۵۰ سال تھی اس عمر تک ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں وقت واحد میں مرض نمونیا میں مبتلا ہوئے۔ ماں اچھی ہوگئی لیکن بیٹا ہسپتال میں مرگیا۔ جب ماں کو بیٹے کے مرنے کی خبر سنائی گئی تو اس نے کہا "میرا ہمیشہ یہی خیال رہا کہ میں لڑکے کی جیسے چاہئے دیکھ بھال نہ کرسکوں گی۔" اس بڑھیا کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنے لڑکے کی عمر بھر کے لئے ذمہ دار ہے۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ لڑکے کو سماجی زندگی میں حصہ لینے دے۔ وہ ماں جو اپنے اور بچے کے باہمی تعلقات وسیع نہیں ہونے دیتی اور بچے کو سوائے اس کے اور اس کے ماحول کے دوسرے افراد سے تعاون کرنے اور مل جل کر کام کرنے نہیں دیتی بڑی غلطی کرتی ہے۔

ماں اور بچے کے تعلقات ماں کے تعلقات بچوں سے معمولی نہیں بلکہ اہم ہوتے ہیں لیکن ان تعلقات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دینی چاہئے اس میں ماں بچوں دونوں کا فائدہ ہے جب کسی ایک مسئلے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو اس کا دوسرے مسائل پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ماں کا تعلق نہ صرف اولاد سے ہوتا ہے بلکہ وہ بچوں۔ شوہر اور اپنے اطراف کی پوری سماجی زندگی سے تعلق رکھتی ہے لہذا یہ تینوں تعلقات اس کی مساوی توجہ کے محتاج ہیں۔ ان تینوں تعلقات کا سکون قلب اور عقل سلیم کے ساتھ اسے مقابلہ کرنا چاہئے۔ اگر ماں دوسرے دو تعلقات (یعنی شوہر اور سماجی زندگی) کو نظر انداز کرکے صرف بچوں سے ہی تعلق قائم رکھے گی اور ان ہی پر اپنی توجہ صرف کرتی رہے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بچوں کو لاڈ میں خراب کردی گئی اور بچوں کی آزادانہ نشوونما اور دوسروں سے تعاون کی صلاحیت کے راستے میں مشکلات پیدا کردیگی۔

بچے کو اپنے سے مانوس کرلینے کے بعد ماں کا فرض ہوتا ہے کہ بچے کے باپ
بھی بچے میں دلچسپی پیدا کرائے اور ایسا جب ہی وہ کرسکے گی جب کہ اس کو اپنے شوہر سے
ت والفت ہو۔

ماں کا فرض ہے کہ بچے میں اس کے ماحول۔ سماجی زندگی۔ گھر کے بچوں اپنے دوست

احباب۔ عزیز و اقارب اور نوع انسان سے دلچسپی پیدا کرے۔

ماں کے فرائض

پس ماں کے دو اہم فرض قرار پاتے ہیں ایک یہ کہ وہ بچے کو اپنے سے مانوس کرے اور اس پر ثابت کر دے وہ اس کے لئے ایک قابل بھروسہ ہستی ہے جس پر وہ پورا اعتماد کر سکتا ہے دوسرا یہ کہ بچے کی اس اپنے سے انست اور اس اعتماد کو وسیع کر دے تاکہ بچہ اس کے (یعنی ماں کے) سوائے انسانی پورے سماج پر اعتماد کر سکے اور اس سے دوستانہ تعلقات قایم کر لے۔

اگر ماں بچے کو صرف اپنے ہی سے مانوس کر لے گی تو بچہ بڑا ہو کر دوسروں سے کوئی دلچسپی نہ رکھے گا اور میل جول نہ کر سکے گا بلکہ اگر اس کو دوسروں میں دلچسپی لینے اور ان سے ربط قائم کرنے کہا جائے گا تو اس کی سخت مخالفت کرے گا۔ وہ ہمیشہ اپنی ماں کی مدد کا محتاج رہے گا اور ان افراد کو جو اس کے اور اس کی ماں کے درمیان حائل ہوں اپنا جانی دشمن سمجھے گا۔ اگر ماں اس کے باپ یا گھر کے دوسرے بچوں سے دلچسپی ظاہر کرے گی تو یہ رنجیدہ اور مایوس ہو گا اور بتدریج یہ نظریہ قایم کر لے گا کہ "ماں صرف میری ہے۔ میرے لئے ہے دوسروں کو اس سے کوئی تعلق نہیں"۔

فرائیڈ کا نظریہ

اس موقف کے متعلق موجودہ بعض ماہرین نفسیات غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے مثلاً فرائیڈ کے "اوڈی پس وہم" کا نظریہ یہ ہے کہ لڑکا اپنی ماں کا عاشق ہو جاتا اور اس سے شادی کر لینا چاہتا ہے اور باپ سے نفرت اور عداوت رکھتا اور اسے مار ڈالنا چاہتا ہے۔

بچوں کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے اگر بخوبی سمجھ لیا جاتا تو یہ غلط نظریہ قایم نہ کیا جاتا۔ "اوڈی پس وہم" اسی بچے میں پایا جاتا ہے جس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی ماں اسی کے لئے مخصوص رہے اور وہ دوسرے کسی سے کوئی تعلق نہ رکھے لیکن یہ خواہش جنسی خواہش نہیں ہے۔ اس خواہش سے بچے کی غرض اور غایت یہ ہوتی ہے کہ ماں کو مغلوب کر لے اپنا مطیع بنا لے۔ اس پر پورا قابو پا لے اور اس کو اپنی خادمہ بنا لے۔ اوڈی پس وہم ان ہی بچوں میں پیدا ہوتا ہے جنھیں ان کی ماؤں نے لاڈ و پیار سے

بگاڑ دیا ہو اور جو نوع انسان کے متعلق بھائی چارے کے جذبات نہ رکھتے ہوں۔ بعض شاذ صورتوں میں دیکھا گیا کہ وہ بچے جو ہمیشہ اپنی ماؤں سے وابستہ اور مانوس رہتے ہیں اپنے مسئلہ محبت اور شادی کے حل کرنے کی کوششوں کا مرکز ماں کو بناتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں سوائے ماؤں سے تعاون کے اور کسی تعاون کا کبھی تصور ہی پیدا نہیں ہوا۔ ان کے خیال میں سوائے ماں کے اور کسی عورت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مطیع ثابت ہوگی۔ المختصر اوڈی پس وہم ایک غلط تربیت کی مصنوعی پیداوار ثابت ہوتا ہے۔

ہمارے لئے قطعاً اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ فرض کرلیں کہ اس وہم کو محرمات کے ساتھ مباشرت کی موروثی جبلت سے تعلق ہے یا ہم یہ تصور کرلیں کہ اس فتور (یعنی اوڈی پس وہم) کے کسی میں پائے جانے کی اصل وجہ جنسی کشش یا شہوانیت ہے۔

بچے کے ماں سے بیحد مانوس ہوجانے کے برے اثرات

وہ بچہ جس کو ماں نے اپنے سے بیحد ہلا لیا اور مانوس کرلیا ہو جب ایسے موقف میں آجاتا ہے جہاں اس کا ماں سے تعلق باقی نہیں رہتا تو پھر اس پر مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں مثلاً جب وہ مدرسہ جاتا ہے یا بچوں کے ساتھ میدان میں کھیلتا ہے تو اس کا نصب العین یہی رہتا ہے کہ کسی طرح ماں سے جاملے۔ ایسا بچہ جب کبھی ماں سے جدا کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اس کی ہمیشہ خواہش یہ ہوتی ہے کہ جہاں جائے ماں کو ساتھ کھینچ لیجائے تاکہ ماں کے دل میں ہمیشہ اسی کا خیال رہے اور وہ ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ رہے۔ اس کے لئے بچہ مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے بعض وقت اپنی کمزوری اور ماں سے غیر معمولی محبت کا اظہار کرکے اس کی ہمدردی کا طالب ہوکر خود کو ماں کا لاڈلا بنا لیتا ہے بعض دفعہ رو کر یا کوئی بات خلاف مرضی ہو تو بیمار پڑ کر ظاہر کرتا ہے کہ وہ ماں کی نگرانی اور توجہ کا کس قدر محتاج ہے اور اس کے برعکس بعض دفعہ غیض و غضب کا اظہار کرکے یا ماں سے دھنگہ مشتی کرکے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ مسئلی بچوں میں ہم ہزارہا قسم کے بگڑے ہوئے بچے پاتے ہیں جو اسی کھینچ تان میں لگے رہتے ہیں کہ صرف اپنی ماؤں کی

توجہ حاصل کریں اور اپنے ماحول کے مطالبات کی مخالفت کریں اور انھیں رد کردیں۔

بچہ بہت جلد اس چیز میں مہارت حاصل کرلیتا ہے کہ کیسے کیسے جتن کرکے وہ ماں کی توجہ حاصل کرسکتا ہے۔

لاڈلے بچے تنہائی اور اندھیرے سے کیوں ڈرتے ہیں۔

لاڈلے بچے اکثر تنہائی سے بہت ڈرتے ہیں۔ ان کا یہ خوف درحقیقت اندھیرے سے نہیں ہوتا بلکہ اندھیرے کے خوف اور ڈر کو اپنی ماؤں کو اپنے نزدیک رکھنے کا ذریعہ بناتے ہیں مثلاً ایک اسی قسم کا لاڈ بچہ اندھیرے میں چیخنے چلانے کا عادی تھا۔ ایک رات اس کی ماں اس کے چیخنے چلانے پر اس کے پاس آئی اور پوچھی کہ آخر تم کیوں ڈرتے ہو؟ اس نے جواب دیا "اس لئے ڈرتا ہوں کہ یہاں بے حد اندھیرا ہے۔" ماں نے جو بچے کی اس حرکت کی غرض اور غایت سمجھ گئی تھی کہا "کیا میرے یہاں آجانے سے اندھیرے میں کچھ کمی ہوئی؟ بہرحال اندھیرا کوئی اہمیت نہیں رکھتا بچے کے اندھیرے سے ڈرنے کے یہ معنی تھے کہ وہ ماں کی جدائی اور دوری کو پسند نہیں کرتا تھا جب اس ذہنیت کا بچہ ماں سے جدا کردیا جاتا ہے تو اس کے تمام جذبات۔ اس کی قوت اس کی دماغی قوتیں اپنے لئے ایسے موقف پیدا کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں کہ پھر اس کی ماں اس کے نزدیک ہوجائے اور وہ ماں سے مل جائے مثلاً بچہ چیخیں مار کر۔ شور مچا کر بستر پر تنہا سونے سے انکار کرکے خود کو دوسروں کے لئے وبال جان بنا کر کوشش کرتا ہے کہ اس کی ماں اس کے پاس آجائے۔

بچے ڈرپوک کیوں ہوتے ہیں

بچے کا ماں کی توجہ اور اس کی قربت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ جو معلمین اور ماہرین نفسیات کے لئے ہمیشہ باعث توجہ و دلچسپی رہا 'خوف' یعنی 'ڈر' ہے۔

انفرادی نفسیات میں ہم خوف کے اسباب معلوم کرنے کی فکر نہیں کرتے بلکہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اظہار خوف کی کیا غرض ہے۔

لاڈ میں بگڑے ہوئے سب بچے ڈرپوک ہوتے ہیں اس لئے ان کی عادت ہوجاتی

ہے کہ اظہار خوف کر کے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ یہ جذبہ (یعنی ڈر ظاہر کرنا) ان کی طرز زندگی کا ایک اہم جزء ہو جاتا ہے اور اظہار خوف کو یہ اپنی ماؤں سے قربت قائم رکھنے کا ایک زبردست ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ الحاصل خوب سمجھ لیا جائے کہ ڈرپوک وہی بچہ ہوتا ہے جس نے بے موقع لاڈ و پیار میں پرورش پائی ہو اور جو آیندہ بھی اسی لاڈ و پیار میں پلنا چاہتا ہے۔

کابوس کی وجہ

بعض اوقات ان لاڈلے بچوں کو کابوس ہوتا ہے اور یہ نیند میں روتے ہیں جو کابوس کی ایک مشہور علامت ہے لیکن جب تک کہ نیند کو بیداری کا ضد (یعنی برعکس حالت) تصور کیا جاتا رہا اس علامت کا سمجھنا ناممکن تھا۔ نیند کو بیداری کی ضد سمجھنا ایک بڑی غلطی تھی۔ بیداری اور نیند ایک دوسرے کے ضد نہیں ہیں بلکہ اقسام ہیں۔ بچے کی حالت سوتے اور خواب دیکھتے وقت وہی رہتی ہے جو دن میں رہتی ہے اس کا یہ نصب العین کہ کسی موقع یا موقف کو اپنے مرضی کے مطابق بنا لے ہمیشہ اس کے پورے جسم اور نفس کو متاثر کرتا رہتا ہے اور تھوڑی سی تربیت اور تجربہ کے بعد وہ ان ذرائع کو معلوم کر لیتا ہے جن سے وہ اپنا نصب العین حاصل کر سکتا اور منزل مقصود کو پہونچ سکتا ہے۔ نیند میں بھی وہی چیزیں وہ دیکھتا اور وہی یادداشتیں اس کے ذہن میں آتی ہیں جو اس کے اغراض و مقاصد کے لئے مفید و ممد ہوں۔ ایک لاڈلا بچہ چند تجربوں کے بعد سمجھ جاتا ہے کہ ماں سے اسے پھر ملا دینے کے لئے ڈراؤنے اور بھیانک خیالات بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ لاڈلے بچے بڑے ہو کر بھی ڈراؤنے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ بچپن میں چونکہ اس قسم کے خواب دیکھنے کو انھوں نے ماں کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا تھا اس لئے یہ ایک عادت سی ہو جاتی ہے۔

لاڈلے بچوں کا ڈر اور پریشانی سے کام لینا ایسا واضح طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ اگر کوئی لاڈلا بچہ اپنی ماں کو راتوں میں تکلیف نہ دے تو اس سے ہمیں تعجب ہو گا۔

اس قسم کے بچے ماؤں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے جو چالبازیاں کرتے ہیں ان کی

فہرست لمبی ہے مثلاً بعض بچے شکایت کرتے ہیں کہ بستر تکلیف دہ ہے یا پانی مانگتے ہیں۔ بعض اس وقت تک نہیں سوتے جب تک کہ ان کے والدین ان کے نزدیک نہ بیٹھ جائیں۔ بعض چوروں یا وحشی جانوروں سے ڈر ظاہر کرتے ہیں۔ بعض خواب دیکھتے اور بستر سے گر جاتے ہیں اور بعض بستر میں پیشاب کر لیتے ہیں۔

ایک لاڈلی بچی کا حال

ایک لاڈ سے بگڑی ہوئی لڑکی جس کا میں نے علاج کیا راتوں کو کچھ تکلیف نہیں دیتی تھی۔ اس کی ماں نے بیان کیا کہ وہ راتوں میں خوب سوتی ہے نہ کوئی خواب دیکھتی ہے نہ ہوشیار ہوتی اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتی ہے۔ البتہ دن میں بہت دق کرتی ہے۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی اور میں نے لڑکی کے سامنے وہ سب تدبیریں پیش کیں جو وہ ماں کی توجہ حاصل کرنے اور اس کو اپنے پاس بلانے کے لئے اختیار کر سکتی ہے لیکن لڑکی نے کسی کا بھی اقرار نہیں کیا۔ بالآخر میرے ذہن میں یہ بات آگئی کہ ماں سے پوچھوں کہ رات میں لڑکی کہاں سوتی ہے چنانچہ میں نے پوچھا اور ماں نے جواب دیا "میرے بستر پر میرے ساتھ"۔ (اڈلر اتنا لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں اس لئے کہ بات صاف ہے۔ لڑکی چونکہ ماں کے ساتھ سوتی تھی اس لئے راتوں کو تکلیف دینے کی اس کو ضرورت نہ تھی۔ دن میں ماں وقتاً فوقتاً کام کاج کے لئے جدا ہو جاتی تھی اس لئے دق کرتی تھی۔ مترجم)

بیماری اور بچے

بیماری لاڈلے بچوں کے لئے ایک پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے جب یہ بیمار پڑتے ہیں تو انھیں اور زیادہ لاڈ دیا جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیماری کے بعد بچہ مسئلی بچہ ہو جاتا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیماری نے اسے ایسا کر دیا لیکن حقیقتاً ہوتا یہ ہے کہ جب بچہ اچھا ہو جاتا ہے تو یاد رکھتا ہے کہ جب وہ بیمار تھا تو اس کے بڑے لاڈ اٹھائے گئے تھے۔ اب ماں اس طرح لاڈ نہیں کرتی تو وہ مسئلی بچہ بن کر ماں سے انتقام لیتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بچہ کسی دوسرے بیمار بچہ کو دیکھ لیتا اور محسوس کرتا ہے کہ اس پر غیر معمولی توجہ کی جا رہی ہے اور وہ گھر والوں کا مرکز توجہ بن گیا ہے تو یہ خود بیمار پڑ جانے کی آرزو کرتا ہے

اور اس آرزو کو پوری کرنے کی خاطر بیمار بچے کو پیار کرتا ہے تاکہ اس کی بیماری اس کو بھی لگ جائے۔

ایک لڑکی چار سال تک خستہ خانہ (ہسپتال) میں رہی اور وہاں ڈاکٹروں اور نرسوں نے لاڈ میں اس کو بگاڑ دیا۔ جب وہ گھر آئی تو والدین نے بھی لاڈ کا سلسلہ جاری رکھا لیکن چند روز میں بتدریج اس میں کمی ہوگئی جب کبھی والدین اس کی بات نہ سنتے اور کوئی چیز دینے سے انکار کرتے تو لڑکی منہ میں انگلی لے کر کہتی "میں خستہ خانہ میں رہ چکی ہوں"۔ ایسا کہنے سے لڑکی کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ یاد دلانا چاہتی ہے کہ وہ بیمار رہ چکی ہے اور اس کی کوشش یہ تھی کہ جیسا کہ بیماری کے زمانہ میں وہ ایک اچھے اور حسب دل خواہ موقف میں تھی اب بھی اپنے لئے وہی موقف پیدا کرلے۔

بالغوں اور جوانوں میں بھی یہ چیز ہم پاتے ہیں کہ اکثر افراد اپنے بیماریوں کا ذکر اور اپنے اپریشنوں (یعنی جراحی عمل) کے حالات مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بچہ جو اپنے والدین کے لئے سُلی بچہ بن گیا تھا جب بیمار ہو کر صحت یاب ہوتا ہے تو والدین کو دق کرنا چھوڑ دیتا اور ایک اچھا بچہ ہو جاتا ہے۔

ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ ناقص اعضا بچے کے لئے ایک مزید بوجھ ثابت ہوتے ہیں لیکن ہم نے یہ بھی بتا دیا کہ صرف ناقص اعضا بچے کی اخلاقی خرابی کا باعث نہیں ہو سکتے پس ہمیں شک ہے کہ آیا صرف اعضاء کی درستی بچے کی اصلاح کے لئے کافی ہو سکتی ہے اور اس کی اخلاقی حالت میں تبدیل کر سکتی ہے۔

ایک لڑکے کا واقعہ

ایک لڑکا جو فیاملی میں دوسرا تھا اپنے والدین کو اپنے جھوٹ بولنے چوری۔ وحشی پن۔ سرکشی اور آوارگی سے بیحد دق کر رکھا تھا۔ اس کے استاد نے بھی اس سے تنگ آکر رائے دی کہ اسے تادیب خانہ میں شریک کر دیا جائے اس نوبت پر لڑکا بیمار پڑ گیا۔ اس کو پسلی کی دق ہوگئی اور چھ مہینے تک پلاسٹر آف پیارس میں جکڑا ہوا پڑا رہا۔ جب وہ صحت یاب ہوا تو فیاملی کا بہترین لڑکا ہو گیا۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ اس کی بیماری اس کی اصلاح کا سبب ہوئی بلکہ ہم کہتے ہیں کہ جس چیز نے

اسے سیدھے راستے پر لگا دیا وہ یہ تھی کہ لڑکے نے اپنی سابقہ غلطیوں پر غور کیا۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے والدین اس کے بھائی کو اس پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب یہ بیمار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ مرکز توجہ بن گیا اور والدین نے ہر طرح سے اس کی خبر گیری اور تیمار داری کی۔ چونکہ یہ ذہین لڑکا تھا اس لئے اپنے دل سے اس خیال کو دور کر دیا کہ اس سے غفلت کی جاتی تھی۔

ماں سے بچوں کو جدا کرنا

یہ تصور مضحکہ خیز ہوگا کہ ماؤں کی غلطیوں سے بچوں کو بچانے کے لئے انھیں ماؤں سے بالکل جدا کر کے نرسوں کے سپرد کر دیا جائے یا اداروں میں داخل کر دیا جائے۔ جب کبھی بھی ہم ماں کا عوض پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو گویا ایک ایسی ہستی کی تلاش کرتے ہیں جو ماں کے فرائض انجام دے سکے اور جو بچے سے ویسی ہی دلچسپی رکھے جیسی کی ماں رکھتی ہے۔ ایسی ہستی ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے اس سے تو کہیں زیادہ آسان یہ ہے کہ بچے کی ماں کو ہی تربیت دے دی جائے۔

وہ بچے جو یتیم خانوں میں پرورش پاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اس لئے کہ یتیم خانوں میں کوئی اتنی زحمت نہیں اٹھاتا کہ اس خلیج کو جو بچے اور اس کے ہم جنسوں میں حائل ہے پاٹ دے۔ بعض اداروں میں ان بچوں پر جن کی نشو و نما تشفی بخش طور پر نہیں ہو رہی تھی ایک آزمائش کی گئی وہ یہ کہ ایک یتیم بچے کو نرس کے سپرد کر دیا گیا اور ہدایت دی گئی کہ بچے کی اچھی نگرانی اور پرورش کرے یا اس کو کسی فیملی میں رکھ دے جہاں گھر والی اپنے بچوں کے ساتھ اس کی بھی پرورش کرے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ جب نرس یا رضاعی ماں کا انتخاب احتیاط کے ساتھ کیا گیا تو آزمائش کا نتیجہ اچھا اور کامیاب رہا۔ اس قسم کے بچوں کی پرورش کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کے لئے والدین کا بدل فراہم کر دیا جائے اور گھر کی زندگی (یعنی فیملی لائیف) ان کے لئے مہیا کر دی جائے۔

اگر بچوں کو ان کے والدین سے جدا کر دینا مقصود ہو تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بچوں کو ایسے افراد کے حوالے کریں جو والدین کے فرائض عمدگی کے ساتھ

انجام دے سکیں۔

ماں کی محبت اور اس کی اپنی اولاد سے دلچسپی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جو لوگ زندگی میں ناکامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یتیم۔ ناجائز اولاد آوارہ بچے اور وہ بچے ہوتے ہیں جن کے والدین لڑ کر جدا ہو گئے ہوں۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ دایہ یا رضاعی ماں کے فرائض انجام دینا مشکل چیز ہے اور بچے اکثر ان سے لڑتے جھگڑتے ہیں لیکن اس مسئلہ کا حل ممکن ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ یہ مسئلہ کامیابی سے حل ہو گیا۔ افسوس کہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ دایہ یا رضاعی ماں موقع اور محل کو سمجھ کر عمل نہیں کرتی (اس لئے ناکامیابی ہوتی ہے)۔

بچے اور سوتیلی ماں

بعض وقت جب ماں مر جاتی ہے تو بچے باپ سے مانوس ہو جاتے ہیں اور وہ انھیں لاڈ کرنے لگتا ہے اور پھر دوسری شادی کر لیتا ہے تو بچے یہ محسوس کر کے کہ باپ کی توجہ ان کی طرف اب اتنی نہیں رہی جتنی کہ شادی سے پہلے تھی سوتیلی ماں کے مخالف ہو جاتے ہیں اور اس سے لڑنا شروع کرتے ہیں۔ ماں لڑائی کا جواب لڑائی سے دیتی ہے اور اب بچوں کو سوتیلی ماں سے حقیقی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ باہمی جنگ و جدل میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ بچوں سے لڑنے جھگڑنے میں بزرگوں کو ہمیشہ شکست ہوتی ہے۔ لڑائی کے ذریعہ نہ ہم بچوں کو شکست دے سکتے اور نہ ان کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ ان لڑائیوں میں ہمیشہ کم زور کی فتح ہوتی ہے۔ ان لڑائی جھگڑوں میں بچے سے بعض ایسی توقعات کی جاتی ہیں جو پوری کرنے سے وہ انکار کرتا ہے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اس دنیا میں لوگ بے حساب کشمکش اور بے کار کوششیں کرنے سے محفوظ رہیں گے اگر وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کسی فرد کی محبت اور اس کا تعاون جبر و قوت کے استعمال سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

باپ کا مقام گھر میں

باپ کا مقام گھر میں اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ماں کا ہے۔ بچہ پہلے پہل باپ سے بہ نسبت ماں کے کم مانوس ہوتا ہے لیکن بعد میں بچہ پر باپ کا

کافی اثر پڑتا ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ اگر ماں بچے کی دلچسپی باپ سے پیدا کرنے میں ناکامیاب رہے تو اس سے کیا خطرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بچے کے سماجی جذبات کی خاطر خواہ نشو و نما میں مانع ہو جاتی ہے۔

اگر شادی کے بعد والدین کی زندگی ناخوشگوار رہے تو یہ بھی بچے کے لئے مضر ہوتی ہے ایسی صورت میں ماں بچے کے باپ کو گھر یعنی فیاملی میں شامل کرنا نہیں چاہتی بلکہ بچے کو خود اپنے سے مانوس کر لیتی ہے۔

بعض اوقات ماں باپ دونوں بچے کو اپنی بھلائی اور سہولت کے لئے بطور مہرہ استعمال کرتے ہیں۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ بچے کو اپنے سے مانوس کر لے تاکہ بچہ بہ نسبت دوسرے کے اس کو زیادہ محبت کرے اور چاہے۔

ماں باپ کے بُرے تعلقات کا بچوں پر اثر

بچے جب والدین کو ہمیشہ لڑتے جھگڑتے ہوئے پاتے ہیں تو بڑی چالاکی سے انھیں آپس میں اور لڑانے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ میں اس بات کا کہ کون بچے پر زیادہ قابو حاصل کرتا ہے یا بچے کو بگاڑتا ہے مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس فضا میں بچے کا 'تعاون' کی تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بچہ تعاون کا پہلا سبق والدین سے سیکھتا ہے۔ اگر والدین خود آپس میں تعاون نہ کریں تو پھر بچے کو تعاون پسند بنانے کی توقع نہ رکھیں۔ اس کے علاوہ بچے اپنے والدین کی شادیوں کا حال سن کر شادی اور دو جنسوں (یعنی مرد اور عورت) کے ملاپ کا پہلا خیال قائم کرتے ہیں لہذا وہ بچے جن کے والدین کی شادی کی زندگی بدمزہ اور ناخوشگوار رہی ہو اگر ان کے خیال کی بروقت اصلاح نہ ہو تو پھر یہ شادی بیاہ کے متعلق مایوسانہ خیالات قائم کر لیتے ہیں۔ ایسے بچے سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد بھی یہی خیال کرینگے کہ شادی کرنا ناکامیابی پر ختم ہوگا۔ یہ بچے یا تو دوسری جنس کے افراد سے دور رہنے کی ہمیشہ کوشش کرینگے یا اس خیال میں غرق رہیں گے کہ اگر دوسری جنس کے افراد سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کریں تو انھیں اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ المختصر اگر والدین کی زندگی میں

تعاون نہ ہو اور ان کی سماجی زندگی خراب ہو تو یہ چیز بچے کی سماجی زندگی کی نشو ونما اور تعاون کی تعلیم و تربیت میں ایک رکاوٹ بن جاتی ہے۔

شادی کے معنی اور مطلب یہ ہے کہ باہمی فلاح و بہبود۔ بچوں کی بہتری اور سماج کی بھلائی کے لئے دو افراد تعاون اور اتحاد کے ساتھ عمل کریں اور زندگی بسر کریں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی موجود نہ ہو تو پھر زندگی کا مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ شادی مرد اور عورت کی باہمی رفاقت ہے اس لئے اس میں کسی ایک رکن کے اعلیٰ ہونے کا سوال پیدا نہ ہونا چاہیئے۔ یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ غور و فکر کا محتاج ہے جتنا کہ ہم عام طور پر سوچنے کے عادی ہیں۔

گھر کی زندگی میں کسی رکن کے اختیار اور اقتدار کی ضرورت نہیں

گھر کی زندگی میں اختیار و اقتدار کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر کسی فیملی میں میاں اور بیوی میں سے کوئی ایک رکن اگر زیادہ اہم سمجھا جائے یا دوسرے سے بہتر تصور کیا جائے تو یہ بدقسمتی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر باپ تند مزاج ہوتا ہے اور دوسرے ارکان پر حکومت کرنا چاہتا ہے تو لڑکوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور مردوں کے متعلق لڑکے برا خیال قایم کر لیتے ہیں (یعنی لڑکے تصور کر لیتے ہیں کہ مرد کو تند مزاج ہی ہونا چاہیے اور گھر والوں پر حکومت کرنی چاہیئے)۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں یہ بڑی ہو کر خیال کرنے لگتی ہیں کہ سب مرد ظالم ہوتے ہیں۔ شادی ان کے ذہنوں میں ماتحتی اور غلامی کے ہم معنی قرار پاتی ہے۔ بعض اوقات یہ لڑکیاں مردوں سے بچنے کے لئے خلاف فطرت افعال کی عادی ہو جاتی ہیں۔

کسی فیملی میں اگر بیوی شوہر پر مسلط ہو جاتی اور گھر والوں کو ہمیشہ لعنت ملامت کر کے دق کرتی رہتی ہے تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اس صورت میں لڑکیاں ماں کی تقلید کرتیں اور خود بدمزاج اور نکتہ چیں ہو جاتیں ہیں۔ لڑکے اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ ماں کے اعتراضات اور بے موقع نکتہ چینی سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور اس کے تسلط سے خود کو بچانے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں کے ساتھ بہنیں بھی شریک ہو جاتی ہیں اور یہ سب مل کر لڑکے کو دباتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا خاموش طبیعت اور تنہائی پسند ہو جاتا ہے اور پھر سماجی زندگی میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا۔ وہ اس خیال سے کہ سب عورتیں اسی طرح دق کرنے والی اور نکتہ چیں ہونگی عورتوں سے بھاگنے لگتا اور ان کی صحبت کو ناپسند کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی بے موقع نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص نکتہ چینی سے خود کو بچانا ہی اپنا مشغلہ زندگی بنا لے اور اسی کی فکر میں لگ جائے تو پھر اس کے تعلقات سماج سے قائم نہیں رہ سکتے۔ ایسا شخص ہر واقعہ اور ہر موقع پر اپنی ادراکی اسکیم کے مطابق نظر ڈالتا اور اس کو جانچتا اور اپنے نفس سے سوال کرتا ہے کہ میں فاتح ہوں یا مفتوح؟ ایسے افراد جو ہمیشہ اپنی فتح و شکست کا تصور پیش نظر رکھتے ہوئے لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے لئے ساتھی اور رفیق پیدا نہیں کر سکتے۔

باپ کے فرائض

باپ کے فرائض چند الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ باپ کو چاہیے کہ اپنی بی بی۔ بچوں اور سماج کے لئے خود کو ایک اچھا آدمی ثابت کرے۔ اسے چاہئے کہ زندگی کے تین مسئلوں یعنی پیشہ۔ دوستی اور عشق و محبت کا عمدگی کے ساتھ مقابلہ کرے اور اپنی اولاد کی نگرانی اور پرورش کے معاملوں میں مساوی طور پر اپنی بی بی سے تعاون کرے۔ وہ ہرگز یہ بات نہ بھولے کہ بچوں کی پیدائش میں عورت کا جو حصہ ہے اس پر کوئی بازی نہیں لے جا سکتا۔ باپ کا یہ کام نہیں ہے کہ ماں کو گھر کے معاملات سے بے دخل کر دے بلکہ چاہیے کہ اس کی شرکت سے گھر چلائے۔ گھر کے مالی معاملوں میں خاص طور پر اس امر کا لحاظ رکھے کہ اگر باپ کماتا اور گھر والوں کی مالی امداد کرتا ہے تو یہ سب کا معاملہ ہے۔ بیوی بچوں پر ہرگز یہ بات ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ کماتا ہے اور بیوی بچے کھاتے ہیں وہ دیتا ہے اور یہ لیتے ہیں۔ ایک کامیاب ازدواجی زندگی میں یہ چیز کہ شوہر

کماتا ہے محض بے نتیجہ ہوتی ہے یہ تقسیم کار ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے (یعنی تقسیم کار کی وجہ باپ کے ذمے روپیہ کمانا آگیا ہے) بہت سے باپ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی روپیہ کمانے کی قابلیت کو بیوی بچوں پر حکومت کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ گھر میں کوئی حاکم نہ ہونا چاہیے اور ہر اس موقع سے جس میں عدم مساوات کے جذبات ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو دور رہا جائے (یعنی فیاملی میں باپ ہو یا ماں زیادہ تسلط حاصل نہ کرے اور ایسے موقع پیدا نہ ہونے پائیں جس میں کسی ایک کا بہ نسبت دوسرے کے زیادہ اہم ہونے کا گمان ہو)۔ ہر باپ کو اس بات سے بخوبی آگاہ ہو جانا چاہیے کہ ہمارے کلچر میں مرد کو ایسی ضرورت سے زیادہ اہمیت اور ایسی ممتاز جگہ دے دی گئی ہے کہ ممکن ہے بیوی نے شادی کے وقت یہ خطرہ محسوس کیا ہو کہ شادی کے بعد اس کا شوہر اس پر حکومت کرے گا اور وہ گھر میں پست درجہ میں رہے گی۔ باپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ محض عورت ہونے کی وجہ اور اس لئے کہ وہ کماتی اور گھر والوں کی مالی امداد نہیں کرتی اس سے (یعنی باپ سے) کسی طرح کم تر ہے۔ بیوی چاہے گھر والوں کی مالی مدد کرتی ہو یا نہ کرتی ہو اگر فیاملی کے ارکان میں حقیقی تعاون ہو تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہو گا کہ کون کماتا ہے اور کمایا ہوا روپیہ کس کی ملک ہونی چاہیے۔

باپ کا اولاد پر اثر باپ کا اولاد پر اس قدر زبردست اثر پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر اس کو یا تو اپنے لئے تمام عمر ایک نمونہ قرار دے لیتے ہیں یا اس کو اپنا جانی دشمن قرار دے لیتے ہیں۔

سزا سزا اور خصوصاً جسمانی سزا بچوں کے لئے ہمیشہ مضر ہوتی ہے۔ ہر وہ طریقہ تعلیم جو مشفقانہ نہ ہو غلط طریقہ ہے۔ یہ ایک بدقسمتی ہے کہ فیاملی میں بچوں کو سزا دینے کا کام اکثر باپ کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اس سے سب سے پہلے ماں کے اس عقیدے کا اظہار ہوتا ہے کہ عورتیں بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتیں۔ اور یہ کہ وہ کم زور مخلوق ہے جسے قوی مخلوق (یعنی مرد) کی مدد کی ضرورت ہے۔ جب ماں بچوں سے کہتی ہے "ٹھیرو باپ کو تو آنے دو" تو گویا وہ بچوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھاتی ہے

کہ مرد ہی صاحبان اقتدار اور حقیقی قوت اور طاقت کے مالک ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے باپ کے تعلقات بچوں سے خراب ہو جاتے ہیں۔ بچے باپ کو مشفق و مہربان سمجھنے کے عوض اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض عورتیں اس خوف سے کہ وہ بچوں کی محبت کھودینگی خود ان کو سزا دینا پسند نہ کرتی ہوں لیکن اس کا معقول حل یہ نہیں ہے کہ سزا دینے کا کام ہمیشہ باپ ہی کے سپرد کریں۔ ماں اگر بچوں کو وقتاً فوقتاً باپ کے ہاتھ سے سزا دلوائے بھی تو بچے ماں کو ملامت کریں گے کہ اس نے اپنی مدد کے لئے ایک جلاد فراہم کر رکھا ہے۔ اب بھی بعض مائیں بچوں کو شرارت سے باز رکھنے اور مطیع رکھنے کے لئے کہتی ہیں "دیکھو باپ سے کہوں گی"۔ بھلا بتلائیے کہ اس قسم کی باتیں سننے کے بعد بچے زندگی میں مرد کے کیا فرائض اور اس کا کیا مقام قرار دیں گے ؟

اگر باپ زندگی کے تینوں مسائل عمدگی کے ساتھ حل کرتا اور انجام دیتا رہے گا تو وہ خیالی کا ایک مکمل جزو۔ ایک اچھا شوہر اور ایک اچھا باپ ثابت ہوگا۔ باپ کو چاہئے کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں زحمت نہ محسوس کرے۔ اور انھیں دوست بنا سکے۔ اگر اس نے دوستوں کا دائرہ وسیع کیا تو گویا اس نے اپنے گھر والوں کے لئے سماجی زندگی پیدا کر دی۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو خود بھی تنہا اور لکیر کا فقیر نہ رہے گا۔ باہر والوں (یعنی دوست احباب) کے اثرات گھر والوں پر پڑینگے اور اس طرح سے اس کے بچوں کے لئے سماجی جذبات حاصل کرنے اور تعاون کی تعلیم پانے کا راستہ کھل جائے گا۔

میاں بی بی کے دوست

میاں اور بیوی کے دوستوں کا علیحدہ ہونا خطرناک ہوتا ہے (یعنی میاں کے دوست جدا افراد ہونا اور بیوی کے دوست جدا افراد ہونا)۔ میاں اور بیوی کو چاہئے کہ ایک ہی سوسائٹی میں رہیں اور علیحدہ دوستیاں قائم کرنے سے پرہیز کریں۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں اور کبھی علیحدہ کہیں آیا جایا نہ کریں۔ ایسا کر سکتے ہیں لیکن آپس میں ایسا

سمجھوتہ رہے کہ جب چاہیں ان کے ملنے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں کوئی مشکل حائل نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی مشکل مثلاً اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب شوہر اپنی بیوی کو اپنے دوستوں سے ملانا نہیں چاہتا ایسی صورت میں شوہر کی سماجی زندگی کا مرکز فیاملی سے باہر ہو جاتا ہے۔ بچوں کو اس بات کا علم ہونا کہ فیاملی سماج کا ایک جزو ہے اور فیاملی کے باہر بھی ایسے لوگ رہتے بستے ہیں جو ان کی نوع سے تعلق رکھتے اور قابل بھروسہ انسان ہوتے ہیں۔ بچوں کی نشو و نما کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات دوسرے رشتہ داروں سے

اگر باپ کے تعلقات اس کے والدین۔ بہنوں اور بھائیوں سے اچھے ہوں تو اس سے اس کی تعاون کی صلاحیت ظاہر ہوگی۔ مُبتیک“ شادی کے بعد اس کو علٰحدہ رہنا چاہیئے اور خود مختار زندگی بسر کرنی چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ناپسند کرنے لگے یا ان سے ناتہ رشتہ توڑ لے۔

بعض اوقات مرد اور عورت ایسی حالت میں شادی کر لیتے ہیں جب کہ دونوں اپنے والدین کی کفالت میں ہوتے ہیں ایسی صورت میں یہ اپنے گھر کو نظر انداز کر کے اپنے والدین کے گھروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً گفتگو میں جب ”گھر“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد والدین کا گھر ہوتا ہے۔ اگر شادی کے بعد بھی ان پر یہ خیال مسلط رہے کہ اب بھی والدین فیاملی کا مرکز ہیں تو یہ کبھی بھی آزادانہ زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور نہ اپنی حقیقی فیاملی زندگی قائم کر سکیں گے۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شوہر کے والدین رشک اور حسد کرتے اور اپنے لڑکے کی زندگی کے پورے حالات سے ہمیشہ واقف رہنا چاہتے ہیں اور اس طرح اس کی ازدواجی زندگی میں مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ بیوی محسوس کرتی ہے کہ (ساس اور سسرا) اس کو پسند نہیں کرتے اور ان کی ہر بات میں بے موقع مداخلت

سے زندگی بدمزہ ہوجاتی ہے اور یہ صورت اکثر اس وقت پیش آتی ہے جب کہ مرد نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کرلی ہو۔ والدین کا شادی کے لئے رضامند نہ ہونا چاہے صحیح ہو یا غلط لیکن شادی ہوجانے کے بعد ان کے لئے صرف ایک راستہ کھلا رہتا ہے وہ یہ کہ وہ ممکنہ کوشش کریں کہ ان کے لڑکے کی ازدواجی زندگی کامیاب ہو۔ شادی سے قبل والدین اگر لڑکے کے انتخاب کو ناپسند کریں اور اس کو نامناسب سمجھیں تو مخالفت کر سکتے ہیں۔ لیکن شادی ہوجانے کے بعد ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اگر شادی کے بعد فیملی کے اختلافات دور نہ ہوں تو شوہر کو چاہئے کہ اس بات کو ناگزیر سمجھ لے اور اس کی وجہ فکر اور پریشانی میں خود کو مبتلا نہ کرلے۔ والدین کی مخالفت کو ان کی غلطی سمجھے اور انھیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کرے کہ اس کا (بیوی کا) انتخاب صحیح اور درست تھا۔ میاں اور بیوی کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ اپنے والدین کی خواہشوں کو ہر وقت پوری کرتے رہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر ان کا تعاون اور خوشنودی حاصل ہوجائے تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔ بیوی یہ خیال کرلے کہ شوہر کے والدین جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ سب اس کے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ ان کے فائدہ کے لئے ہے۔

کسب معاش

باپ کا ایک فرض جس کو پورا کرنے کی ہر شخص اس سے توقع رکھتا ہے وہ کسب معاش ہے۔ اس کو چاہئے کہ کسی شغل کے لئے تعلیم و تربیت حاصل کرے اور اپنی اور فیملی کی پرورش کر سکے۔ کسب معاش میں وہ اپنی بیوی اور جب بڑے ہوجائیں تو بچوں سے مدد لے سکتا ہے لیکن ہمارا موجودہ کلچر ایسا ہے کہ اس میں اقتصادی ذمہ داری تمام تر باپ پر ہی عائد کی جاتی ہے۔ لہذا اس کا حل بس یہی ہے کہ وہ محنت کرے اور ہمت سے کام لے۔ اپنے پیشے کو خوب سمجھ لے اور معلوم کرلے کہ اس میں کیا فوائد اور نقصان ہیں۔ اس پیشے میں اور جو لوگ ہوں ان سے تعاون کرے اور ان میں مقبول ہو۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنی مثال سے اپنے بچوں کے لئے راستہ تیار کردیگا اور وہ بھی اسی طرح مشاغل اختیار کریں گے۔ باپ کے لئے اس چیز کا علم ضروری ہے کہ

وہ کسب معاش کا مسئلہ کامیابی کے ساتھ کس طرح حل کر سکتا ہے اور جہاں تک ہوسکے ایسا پیشہ یا مشغلہ اختیار کرلے جو نوع انسان کے لئے مفید اور ان کی فلاح و بہبود میں اضافے کا باعث ہو۔ اگر وہ کسی پیشے یا شغل کو اپنے لئے مفید نہ سمجھے تو اس کی پرواہ نہیں اگر وہ دوسروں کے لئے نفع بخش ہو تو کافی ہے۔ ہمارے لئے ضروری نہیں کہ ہم اس کی باتیں سنیں اگر وہ خودپسند ہو تو یہ چیز قابل افسوس ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی اگر وہ اپنے پیشے یا شغل سے جو اس نے اختیار کر رکھا ہے ہمیں فائدہ پہونچا رہا ہے تو اس کی خودپسندی اور خودستائی نقصان دہ نہیں ہوگی۔

شادی

اب ہم عشق و محبت کے متعلق بحث کرتے ہیں یعنی شادی کرنا اور خوشگوار اور مفید گھریلو زندگی بسر کرنا۔ شوہر سے جو ایک خاص مطالبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی شریک زندگی سے دلچسپی رکھے اور یہ چیز کہ وہ بیوی سے دلچسپی رکھتا ہے یا نہیں آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کو دوسرے سے دلچسپی ہو تو وہ ان تمام امور میں جو دوسرے کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں خود بھی اظہار دلچسپی کرتا اور دوسرے کی بہتری اور خوشی کو اپنی بہتری اور خوشی تصور کرتا ہے۔ صرف محبت اس بات کا ثبوت نہیں کہ دلچسپی ہے۔ محبت کی کئی اقسام ہوتے ہیں اور ان سے ہمیں کافی شہادت نہیں ملتی کہ حقیقی دلچسپی یہی ہے۔ شوہر کو چاہئے کہ وہ بیوی کا ساتھی اور شریک زندگی ہو۔ اس کی زندگی کو آسان اور مالا مال بنائے۔ اس کو خوش کرنا اور خوش رکھنا اس کے (شوہر کے) لئے باعث مسرت ہو۔

میاں بیوی میں حقیقی اور سچا تعاون اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ یہ دونوں مجموعی بھلائی اور بہتری کو انفرادی بھلائی اور بہتری پر مقدم سمجھیں۔ میاں بیوی کو چاہئے کہ ایک دوسرے سے اس سے کہیں زیادہ دلچسپی رکھیں جتنی کہ وہ اپنے آپ سے رکھتے ہیں۔

شوہر کو نہ چاہئے کہ بچوں کے سامنے بیوی سے ضرورت سے زیادہ اظہار محبت کرے۔ یہ سچ ہے کہ میاں بیوی کی محبت کا مقابلہ اولاد کی محبت سے نہیں کیا جاسکتا

یہ دونوں بالکل جدا ہوتی ہیں۔ ایک محبت دوسری کو کم نہیں کر سکتی تاہم بعض دفعہ بچے جب اپنے والدین کی باہمی غیر معمولی محبت کو دیکھتے ہیں تو خیال کرنے لگتے ہیں کہ والدین کے دل میں ان کی محبت کم ہو گئی ہے۔ ان میں رشک و حسد پیدا ہو جاتا ہے اور والدین کو آپس میں لڑانے کی فکر کرنے لگتے ہیں۔

جنسی مسائل کو غیر اہم نہ سمجھنا چاہیئے۔

میاں بیوی آپس کے جنسی تعلقات کو غیر اہم اور معمولی چیز تصور نہ کریں اور اسی طرح جنسی مسائل کے متعلق باپ لڑکوں سے اور ماں لڑکیوں سے اس وقت تک خود کچھ نہ پوچھے اور نہ گفتگو کرے جب تک کہ لڑکے اور لڑکیاں خود سوال نہ کریں۔ جب وہ سوال کریں تو ضرورت کے مطابق اور ان کی عمر اور سمجھ کے لحاظ سے جواب دیں۔

میرا خیال ہے کہ ان دونوں والدین کا میلان یہ ہے کہ جنسی مسائل کے متعلق بچوں کو ضرورت سے زیادہ ایسی باتیں کہیں جو ان کی سمجھ میں نہ آسکتی ہوں۔ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ قبل از وقت بچوں کے جنسی جذبات ابھر جانے کا اندیشہ ہے۔ والدین ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں جنسی امور کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور وہ انھیں حقیر چیز سمجھتے ہیں۔ یہ خیال اور یہ عمل اسی طرح غلط ہے جیسا کہ قدیم زمانے کے لوگوں کا طریقہ بچوں سے جنسی باتوں کو چھپانے کا غلط تھا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم خوب سمجھ لیں کہ بچہ کیا معلوم کرنا چاہتا ہے پھر اسی چیز کے متعلق حسب ضرورت اس سے گفتگو کریں۔ ہم اپنے معیار کے مطابق بچے کو مجبور نہ کریں کہ تفصیلی معلومات حاصل کرے۔ ہم بچے کو یہ محسوس کرا دیں کہ ہم اس کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ہمیں اس سے دلچسپی ہے اور اس کے مسائل حل کرنے میں ہم اس سے تعاون کرنے آمادہ ہیں۔ اگر اتنا کر لیں تو پھر کبھی ہم سے غلطی نہ ہو گی۔

بعض والدین کا یہ اندیشہ کہ بچے جنسی امور کے متعلق دوسرے بچوں سے مضر معلومات حاصل نہ کر لیں بیجا ہے۔ وہ بچہ جس نے تعاون اور آزاد خیالی کی اچھی تربیت پائی ہو اپنے دوستوں کی باتوں سے کبھی متاثر نہ ہو گا۔

یاد رہے کہ جنسی مسائل پر گفتگو کرنے میں بچے بڑوں سے بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ ان بچوں کو جن کی تعلیم اور تربیت اچھی ہوئی ہو گلی کوچوں کے لچے لفنگوں کی بازاری باتوں سے نقصان نہیں پہونچ سکتا۔

سماج اور سماجی زندگی

ہماری موجودہ سوسائٹی میں افراد کو سماجی زندگی کا تجربہ حاصل کرنے کے کئی مواقع حاصل ہیں۔ مثلاً سماج کا نظام کیا ہے۔ اس کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں۔ ان کے ملکوں کا اخلاقی تعلق دنیا سے کیا ہے یہ سب باتیں آسانی سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اب تک بھی مردوں کا دائرۂ عمل عورتوں کے دائرۂ عمل سے کہیں زیادہ وسیع ہے لہذا باپ کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کا ان مسائل اور معاملات میں ناصح اور رہنما ہو جائے۔ لیکن باپ کو نہ چاہیے کہ اپنے وسیع تجربے کے متعلق شیخی کرے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔ وہ خود کو گھر والوں کا معلم نہ سمجھے بلکہ اپنی بیوی اور بچوں کو اسی طرح رائے مشورہ دے یا نصیحت کرے جیسا کہ ایک دوست دوسرے دوست کو مشورہ دیتا یا نصیحت کرتا ہے جہاں تک ممکن ہو بیوی اور بچوں کی مخالفت سے بچے اور جب وہ اس کی رائے سے اتفاق کریں تو اس پر اظہار مسرت کرے۔ اگر بیوی مخالفت کرے تو اپنی بات منوانے پر نہ اڑے بلکہ یہ خیال کرے کہ بیوی کو تعاون کی کافی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی دوسرے ایسے طریقے اختیار کرے کہ بیوی کی مخالفت میں کمی ہو جائے۔ لڑائی جھگڑے سے کام نہ چلے گا۔

روپے پیسے کے معاملات

روپے پیسے کے معاملات کو اہمیت نہ دی جائے۔ اور ان کے متعلق جھگڑا نہ کیا جائے۔ وہ عورتیں جو کمانے کے قابل نہیں ہوتیں اپنی اس ناقابلیت کا اس سے کہیں زیادہ احساس رکھتی ہیں جتنا کہ ان کے شوہر تصور کر سکتے ہیں لہذا اگر ان پر اسراف کا الزام لگایا جائے تو بہت رنجیدہ اور ملول ہوتی ہیں۔ گھر کے اخراجات کا میاں بیوی اپنی آمدنی کے لحاظ سے باہمی تعاون کے ساتھ تصفیہ کریں۔ بیوی اور بچے باپ کو مجبور نہ کریں کہ

وہ آمدنی سے زیادہ ان پر خرچ کرے۔ ابتدا ہی سے گھر کے خرچ کے متعلق میاں بیوی میں معقول اور مناسب سمجھوتہ ہو جائے تا آئندہ کوئی ناخوش گوار بات پیدا نہ ہو اور بیوی کو بدسلوکی کا گمان نہ ہو۔

اولاد کا مستقبل صرف دولت سے اچھا نہیں ہو سکتا

باپ کو یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کا مستقبل صرف روپیے کے ذریعہ اچھا کر سکتا ہے۔ میں نے ایک امریکن کا لکھا ہوا دلچسپ رسالہ پڑھا ہے جس میں اس نے قصہ بیان کیا ہے کہ ایک مالدار شخص نے جو بہت ہی نادار اور مفلس خاندان کا رکن تھا کس طرح اپنی اولاد کو کئی نسلوں تک ناداری اور افلاس سے بچانے کا انتظام کیا تھا۔ اس نے ایک وکیل سے مشورہ کیا کہ وہ کیوں کر ایسا انتظام کر سکتا ہے۔ وکیل نے پوچھا کہ وہ کتنی نسلوں کے لئے انتظام کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ دس نسلوں تک کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر وکیل نے جواب دیا کہ آپ انتظام تو کر سکتے ہیں لیکن آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ دسویں نسل کا ہر ایک رکن تقریباً پانچ سو عزیز و اقارب اور اولاد رکھے گا اور پھر ان سب کے خاندان والے بھی آپ کی دولت کے دعوے دار ہونگے۔ تو کیا ان سب کو آپ اپنی اولاد تصور کریں گے؟ اس قصے سے ہمیں ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہم جو کچھ اپنی اولاد کے لئے کرنا چاہتے ہیں وہ حقیقت میں پورے قبیلہ اور قوم کے لئے ہوتا ہے۔ ہم نوع انسان سے اپنے تعلقات کبھی بھی توڑ نہیں سکتے۔

خیا ملی میں حکومت نہیں بلکہ تعاون ہونا چاہیئے۔ ماں باپ مل جل کر کام کریں۔ بچوں کی تعلیم اور پرورش کے بارے میں ان میں اختلاف نہ ہو۔

سب اولاد کو برابر سمجھنا چاہیئے

یہ بہت ضروری ہے کہ والدین کبھی یہ ظاہر نہ کریں کہ وہ اپنے کسی ایک بچے سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی جانب داری خطروں سے بھری ہوتی ہے۔ اس سے

بچپن ہی سے دوسرے بچے تصور کرنے لگتے ہیں کہ ایک کو ان پر ترجیح دی جا رہی ہے اور انھیں پیچھے کر دیا جا رہا ہے۔ بعض وقت ان بچوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہوتا لیکن اگر سب بچے ہر حیثیت سے کم و بیش برابر ہوں تو کسی ایک بچے کی جانب داری کر کے بچوں میں برا احساس اور خیال پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے۔

اگر لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جائے تو لڑکیوں میں احساس کمتری پیدا ہو جانا لازم ہے۔ عام طور پر بچے حساس ہوتے ہیں پس ایک بہت ہی اچھا بچہ بھی اس بدگمانی کی وجہ کہ دوسروں پر اس کو ترجیح دی جاتی ہے زندگی کا غلط راستہ اختیار کر لے سکتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بچہ بہ نسبت دوسروں کے تیزی کے ساتھ نشو و نما پا جاتا ہے اور ایسی باتیں کرتا جو والدین کی پسند خاطر ہوتی ہیں اور وہ اس کو بہ نسبت دوسرے بچوں کے زیادہ چاہنے لگتے ہیں۔ والدین تجربہ کار ہوں اور اتنی سمجھ رکھیں کہ ان سے اس قسم کی پاسداری ظاہر نہ ہونی پائے ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو بچہ قوی اور چالاک ہے وہ دوسروں کو پیچھے کر دے گا اور انھیں ہیٹا کر دے گا۔ ان کے دلوں میں اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائینگے اور ان کی تعاون کی صلاحیت ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔ والدین کے لئے صرف یہ خیال کر لینا کافی نہیں کہ وہ جانب داری نہیں کرتے بلکہ انھیں ہمیشہ یہ دیکھتے رہنا چاہیئے کہ کسی بچے کے دل میں ایسا گمان بھی پیدا نہ ہو (کہ وہ کسی بچے کی جانب داری کرتے ہیں)۔

بچوں کا باہمی تعاون

اب ہم فیاملی کے ایک اہم جزء کا ذکر کرتے ہیں یعنی بچوں کا باہمی تعاون جب تک بچے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ سب برابر ہیں ان میں آگے چل کر سماجی دلچسپی پیدا نہ ہوگی۔ اسی طرح جب تک لڑکے اور لڑکیاں خود کو ایک دوسرے کے برابر تصور نہ کریں دو جنسوں میں خوش گوار تعلقات قائم ہونے میں دشواریاں ہوں گی۔

اکثر افراد سوال کرتے ہیں کہ ایک ہی فیاملی کے بچوں میں اس قدر فرق کیوں

ہوتا ہے؟ بعض سائینس داں اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ قانون توارث کے تحت ایسا ہوتا ہے۔ ہم اس جواب کو محض توہم سمجھتے ہیں۔

(تھوڑی دیر کے لئے) ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم بچوں کی نشوونما کا پودوں کی نشوونما سے مقابلہ کریں۔ اگر چند پودے ایک ہی جگہ پرورش پا رہے ہوں تو ان میں ہر ایک کا ایک جدا موقف ہوگا۔ اگر ایک پودا اس وجہ سے کہ اس کو بہ نسبت دوسرے پودوں کے زیادہ دھوپ مل رہی ہے اور زمین بھی اچھی ہے تیزی کے ساتھ بڑھے تو اس کا اثر دوسرے پودوں کی نشوونما پر پڑتا ہے۔ یہ پودا بڑھ کر دوسرے پودوں کو دبا دیتا اور ان کی غذا خود ہضم کر جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پودے کملا کر رہ جاتے اور بڑھنے نہیں پاتے۔ اسی طرح فیاملی کا کوئی ایک رکن ضرورت سے زیادہ نمایاں اور ممتاز جگہ فیاملی میں حاصل کر لے تو یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے بتا دیا ہے کہ باپ کو یا ماں کو نہ چاہیے کہ فیاملی میں اپنے لئے ممتاز مقام پیدا کرلے۔

کامیاب باپ کی اولاد کا حال۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر باپ غیر معمولی طور پر عقلمند ہو اور اپنی زندگی میں بہت کامیاب رہا ہو تو اس کے بچے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ کبھی بھی اس کی برابری نہ کر سکیں گے اور اس کے موافق نہ ہو سکیں گے۔ وہ ہیٹے ہو جاتے ہیں اور زندگی سے ان کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور اور معروف مرد اور عورتوں کے بچے معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں اور یہ چیز ان کے والدین اور سوسائٹی کے لئے مایوس کن ہوتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے بچوں کو اپنے والدین سے بڑھ جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

اگر کوئی باپ اپنے مشغلے یعنی دھندے میں بہت ہی کامیاب رہا ہو تو وہ فیاملی میں اس بات کو خاص اہمیت دے کر کہتا نہ رہے یہ بات ان کے بچوں کی نشوونما کے لئے مضر ہوگی۔ یہی بات بچوں پر بھی چسپاں ہو سکتی ہے۔

ممتاز بچے اگر ایک بچہ بہ نسبت دوسروں کے تیزی کے ساتھ نشوونما پاتا ہے تو گھر والے

اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتے اور اس کو چاہنے لگتے ہیں۔ یہ چیز اس کو تو بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن دوسرے بچے اس کو پسند نہیں کرتے۔

انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ بغیر نفرت اور تکلیف محسوس کرنے کے دوسروں کے مقابل میں پست درجہ میں رکھ دیا جانا برداشت کرلے۔ گھر کا ممتاز لڑکا سب کو نقصان پہونچا سکتا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ دوسرے بچے نفسیاتی فاقہ کشی کی حالت میں نشو ونما پائیں گے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہیں گے برتری حاصل کریں کیونکہ برتری کی خواہش کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ان کی برتری کی کوششیں مختلف رخ اختیار کریں گی جو حقایق پسندی اور سماج کے لئے مفید نہ ہوں گی۔

انفرادی نفسیات نے اس مسئلہ کے متعلق کہ بچوں کو پیدائش کے وقت کیا فوائد اور سہولتیں حاصل رہتی ہیں اور کیا رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہوتی ہیں کی تحقیق کا وسیع میدان کھول دیا ہے۔ بہرحال ہم یہ فرض کرلیتے ہیں کہ والدین تعاون کے ساتھ اپنے بچوں کی تربیت میں کوشاں ہیں۔

بچوں کے حالات جدا ہوتے ہیں۔

فیاملی میں ہر بچے کا ایک جدا مقام ہوتا ہے اور ہر ایک بچہ ایک جدا حالت کے تحت نشو ونما پاتا ہے۔ اگر ایک فیاملی میں دو بچے ہوں تو دونوں کی حالت ایک نہیں ہوتی۔ ہر ایک کی 'طرز زندگی' سے اس کی ان کوششوں کا پتہ چل جاتا ہے جن کے ذریعے سے وہ اپنی خاص حالات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

پہلن بچہ

سب سے بڑا (یعنی پہلن) بچہ ایک عرصہ تک محسوس کرتا ہے کہ وہ گھر میں والدین کا اکلوتا بچہ ہے لیکن جیسے ہی دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اب اس کی وہ حالت باقی نہیں رہتی اور اس کو اپنی زندگی نئے حالات کے مطابق ترتیب دینی پڑتی ہے۔

والدین اور دوسرے گھر والے پہلن بچے کو اکثر لاڈ پیار کرکے بگاڑ دیتے ہیں وہ گھر والوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ اور پھر (دوسرے بچے کی پیدائش کی وجہ) بلا تیاری کے آناً فاناً وہ گھر میں اپنا پہلا مقام کھو دیتا ہے۔ جب دوسرا بچہ پیدا ہوجاتا ہے

ہے تو اب یہ کوئی نادر چیز نہیں سمجھا جاتا۔ اب اسے (یعنی پہلن کو) والدین کی توجہ اور محبت سے ایک رقیب کی حصہ داری کے ساتھ فائدہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ انقلاب پہلن بچے پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ مشکل بچوں۔ اعصابی امراض کے بیماروں مجرموں۔ شرابیوں اور بھٹکے ہوئے لوگوں کے حالات کی چھان بین کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خرابی کا باعث یہی بچپن کی مشکلات ہوئی ہیں۔ ان پہلن بچوں پر جب دوسرا بچہ پیدا ہوا تو اس کا ان پر گہرا اثر ہوا اور گھر میں اپنا پہلا مقام کھو دینے کے خیال سے انھوں نے ایک خاص طرز زندگی اختیار کرلیا۔

دوسرے بچے (یعنی پہلن کے بعد کے) وہ بھی اسی طرح اپنا مقام کھوسکتے ہیں لیکن یہ بچے اس چیز کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کرتے اس لئے کہ انھیں پہلن بچے سے مل جل کر رہنے کا تجربہ ہو جاتا ہے۔ انھیں تنہا کسی کی توجہ کا مرکز بننے کا موقع حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے بچے کی پیدائش سے پہلن بچے کی زندگی میں مکمل انقلاب ہو جاتا ہے۔ دوسرا بچہ پیدا ہونے کے بعد پہلن سے غفلت برتی جائے تو امید نہیں کہ وہ اس چیز کو آسانی سے برداشت کرے گا۔ اگر وہ اس غفلت کی شکایت کرے تو ہم اس کو خطاوار نہیں قرار دے سکتے۔

اگر والدین اسے یقین دلادیں کہ وہ اسے مثل سابق کے محبت کرینگے اور دوسرے بچے کی آمد کے لئے اسے پہلے سے تیار کردیں اور نومولود کی نگرانی اور پرورش میں حصہ لینے کے لئے اس کو تربیت دیں تو پھر البتہ یہ مرحلہ مضر اثرات پیدا کرنے کے بغیر گذر جائے گا۔ عام طور پر پہلن بچے کو اس طرح تیار نہیں کیا جاتا۔ نومولود کی وجہ والدین کی توجہ۔ محبت اور قدردانی اس سے کم ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ ماں کو جھنجھوڑنے لگتا اور ماں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔

بعض وقت ہم دیکھتے ہیں کہ دو بچے ہیں اور ہر ایک ماں کو اپنی طرف متوجہ

کرنے کے لئے اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور ماں دونوں کے درمیان جھنجھنہ بنی ہوئی ہے ان میں سے جو بڑا ہوتا ہے وہ زیادہ طاقت استعمال کرتا اور زیادہ چال بازیاں اختیار کرتا ہے۔ ان حالات میں بڑا بچہ کیا کرتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ وہی کرتا ہے جو ان حالات میں ہم سن رسیدہ افراد کرتے ہیں۔ وہ ماں کو پریشان کرتا اس سے لڑتا جھگڑتا اور ایسی عادتیں اختیار کرتا ہے جسے ماں نظر انداز نہیں کر سکتی اور بالآخر اس کی حرکات سے تنگ آجاتی ہے۔ بچہ ہر ممکن اور وحشیانہ طریقے سے ماں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ماں صبر نہیں کر سکتی جھڑکیاں دینے لگتی ہے اور بچہ اب سچ سچ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ماں کی محبت کا کھو دینا کیا چیز ہے۔ وہ ماں کی توجہ اور محبت محبت حاصل کرنے کے لئے اس سے جنگ کر رہا تھا لیکن اس نے کامیاب ہونے کے بدلے محبت کو بالکل کھو دیا۔ ابتداً اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ پیچھے کر دیا جا رہا ہے اس لئے اس نے لڑائی شروع کی تھی لیکن اب دیکھتا ہے کہ لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل ہی پیچھے ڈال دیا گیا۔ اب وہ اپنے اس فعل یعنی احتجاج اور لڑائی کو حق بجانب قرار دیتا اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ "میں اس بات کو جانتا تھا" دوسرے لوگ غلطی پر تھے میں راستی پر تھا"۔ اب اس بچے کی حالت مثل اس شخص کے ہو جاتی ہے جو پھندے میں پھنس گیا ہو کہ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنا ہی پھندے کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کے خیال کی تائید ہوتی جاتی ہے۔ اب جب کہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ راستی اور حق پر ہے تو پھر وہ کیوں کر لڑنا اور احتجاج کرنا ترک کر سکتا ہے؟ اس قسم کی لڑائیوں کے متعلق ہمیں چاہئے کہ انفرادی طور پر ہر لڑائی پر غور کریں۔ اگر ماں بچے کا مقابلہ کرتی اور لڑنا شروع کرتی ہے تو بچہ غصے میں آجاتا۔ وحشی ہو جاتا اور عدول حکمی کرتا ہے۔ جب بچہ ماں کے خلاف ہو جاتا ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ باپ اس کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے اور بچہ باپ سے دلچسپی لینے لگتا اور اس کی توجہ اور محبت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

پہلے اور دوسرے نمبر کے بچے ماں پر باپ کو ترجیح دیتے ہیں۔

عام طور پر بڑے بچے

(یعنی جو پہلے پیدا ہوتے ہیں) باپ کو ماں پر ترجیح دیتے اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔ جب ہم دیکھیں کہ کوئی بچہ باپ کو ماں پر ترجیح دیتا ہے تو یقین کرلیں کہ تغیر کی یہ دوسری منزل ہے یعنی یہ کہ بچہ پہلے ماں سے مانوس تھا لیکن اب اس نے ماں کی محبت دل سے نکال دی اور اسے باپ پر منتقل کردی تاکہ اس طرح ماں کی سرزنش کرے۔ اگر کوئی بچہ باپ کو ترجیح دے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کو ماں سے کوئی صدمہ پہونچ چکا ہے۔ ماں نے اس کی توہین کی اور اس کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا۔ بچہ نے اس چیز کو پسند نہیں کیا اور اب اس کا پورا طرز زندگی، اسی جذبہ اور احساس کے تحت ترتیب پاتا ہے۔

ماں باپ اور اولاد کا اختلاف بعض دفعہ عمر تمام رہتا ہے

والدین اور بچے کے درمیان اختلاف اور لڑائی ایک طویل مدت تک جاری رہتی ہے بعض اوقات اس کا سلسلہ عمر تمام جاری رہتا ہے۔ بچہ چونکہ خود کو لڑنے جھگڑنے کا عادی کرلیتا ہے اس لئے وہ ہر بات میں ہر معاملہ میں والدین کی مخالفت کرتا اور ان سے مقابلہ کرتا ہے اور چونکہ اس سے کوئی اور بھی دلچسپی نہیں رکھتا تو یہ ہر طرف سے مایوس ہوکر خیال کرلیتا ہے کہ اس کا کوئی چاہنے والا نہیں رہا وہ کسی کی محبت حاصل نہیں کرسکتا۔ اس خیال اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدمزاجی اور گھونا پن اختیار کرلیتا ہے۔ اب اس میں دوسروں سے ملنے جلنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور بتدریج تنہائی پسند ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے بچے کی حرکات اور باتوں کا تعلق گذرے ہوئے زمانہ سے ہوتا ہے (یعنی وہ ہمیشہ اس زمانہ کا ذکر کرتا رہتا ہے جبکہ اس کے والدین اس کو چاہتے تھے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے)۔ یہی وجہ ہے کہ جو بچے پہلے پیدا ہوتے ہیں وہ عام طور سے کسی نہ کسی طریقے سے زمانہ ماضی سے دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بچے ہمیشہ گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے اور ان کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ گذرے ہوئے زمانہ کی تعریف کرتے اور سراہتے رہتے ہیں اور آیندہ کے متعلق مایوس کن خیالات رکھتے ہیں۔

جو بچہ گھر میں حکومت کرنے کا عادی ہو وہ آیندہ کیسا ہوتا ہے

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچہ جو گھر کی چاردیواری میں حکومت کرتا تھا لیکن بعد اس نے اپنا اقتدار کھو دیا تو وہ بہ نسبت دوسروں کے اقتدار اور اختیار کی اہمیت کو زیادہ سمجھ سکتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو ایسے کاموں میں حصہ لیتا ہے جس میں اقتدار و اختیار کے مظاہرہ کا موقع ملتا ہو اور قواعد اور قوانین کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا ہمیشہ یہی خیال رہتا ہے کہ ہر چیز ضابطہ کے موجب ہو اور ضابطہ بدلا نہ جائے۔ اقتدار ان ہی لوگوں کو حاصل رہے جو اس کے اہل ہوں۔ بچپن میں جن بچوں کی نشو و نما اس قسم کے خیالات اور اثرات کے تحت ہوتی ہے ان کا رجحان قدامت پسندی کی جانب ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر اپنے لئے کوئی اچھا مقام پیدا کر لیتا ہے تو ہمیشہ اس بدگمانی میں مبتلا رہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے اس کے مقام سے ہٹا دیں۔

پہلن بچے کی تربیت

پہلن بچے کا مقام گھر میں کیا ہو ایک خاص مسئلہ ہے لیکن اس کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بچے کے لئے مفید ہو۔ اگر پہلن بچے کو پہلے سے ہی ایسی تربیت دے دی جائے کہ وہ نومولود بچے سے تعاون کر سکے تو پھر اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ چنانچہ اس قسم کے بچوں میں سے اکثر بچے بڑے ہو کر دوسروں کی نگرانی کرنے اور مدد کرنے کی عادت اور خصلت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے بچے والدین کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے بچوں کے لئے ماں باپ کی جگہ لیتے ان کی دیکھ بھال کرتے ان کو سکھاتے اور خود کو ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ بچے تنظیم کی خاص صلاحیت اور ذہانت ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تو کامیاب اور اچھے بچوں کی حالت ہوئی لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض بڑے بچے اپنے سے چھوٹے بچوں کی نگرانی اس مقصد سے کرتے ہیں کہ ان کو اپنا محتاج بنائے رکھیں اور ان پر حکومت کریں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ممالک یورپ اور امریکا میں مسلی بچوں کی

زیادہ تر تعداد پہلن بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب سے چھوٹے بچوں کا نمبر آتا ہے۔ یہ دلچسپ چیز ہے کہ فیاملی میں اول اور آخر مقام رکھنے والے بچے ہی مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے تعلیم کے طریقے پہلن بچوں کی مشکلات کا کوئی حل اب تک نہ معلوم کرسکے۔

دوسرا بچہ

دوسرے بچے (یعنی پہلن کے بعد کا بچہ) کی حالت بالکل جدا ہوتی ہے ایسی کہ اس کا دوسرے بچوں کے حالات سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ پیدائش کے بعد اسے ماں باپ کی توجہ اور نگرانی میں پہلن بچے کا حصہ دار ہونا پڑتا ہے اس لئے بہ نسبت پہلن کے وہ 'تعاون' سے کسی قدر قریب ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف انسانوں کا خاصا مجمع دیکھتا ہے۔ اگر پہلن اس سے لڑتا جھگڑتا نہ ہو اور اس کو پیچھے کر دینے کی کوشش نہ کرتا ہو تو اس کا مقام اچھا ہو جاتا ہے۔ اپنے پورے بچپن میں وہ اپنے لئے ایک رفتار نما رکھتا ہے۔ اس سے عمر میں زیادہ اور قد و قامت میں بڑا ایک بچہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کو ترغیب ہوتی رہتی ہے کہ کوشش کر کے زندگی کی دوڑ میں اس کو (یعنی بڑے کو) ملالے۔ ایک مثالی دوسرے بچے (یعنی پہلن کے بعد کے بچے کو) پہچان لینا بہت آسان ہے۔ اس کا طریقہ عمل ایسا ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک دوڑ کے مقابلہ میں مشغول ہے یا یہ کہ کوئی دوسرا اس سے ایک دو قدم آگے ہے اور اسے جلدی سے ملا لینا ہے۔ وہ ہمیشہ پوری طاقت و توانائی سے اپنی کوششوں میں مصروف رہتا اور خود کو ایسی تربیت دیتا رہتا ہے کہ بڑے بھائی سے بڑھ جائے اور اس پر غالب آجائے۔ انجیل میں ہمیں اس قسم کے متعدد نفسیاتی اشارے ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک مثالی دوسرے بچے کی حالت حضرت یعقوب کے قصے میں ہمیں مل جاتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلا نمبر حاصل کریں اور یوشع کی جگہ حاصل کریں۔ یوشع کو ہرا دیں اور ان سے آگے بڑھ جائیں۔

دوسرا بچہ اس احساس سے کہ وہ پیچھے رہ گیا ہے برافروختہ اور برہم

ہوتا اور دوسروں سے بڑھ جانے کے لئے کشمکش کرتا ہے اور بسا اوقات اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ عام طور پر دوسرا بچہ بہ نسبت پہلن کے زیادہ ذہین ہوتا اور کامیاب رہتا ہے۔ ہم یہ کہہ نہیں سکتے کہ اس چیز کو قانون توارث سے کوئی تعلق ہے۔ دوسرا بچہ جو تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ کوشش اور محنت کرتا ہے۔ اگر وہ گھر اور خاندان کے باہر بھی پرورش پاتا ہے تو اپنے لئے ایک رفتار نما پیدا کر لیتا ہے۔ وہ کسی ایسے بچے کو جو اس سے بہتر حالات اور مواقع رکھتا ہو اپنے لئے رفتار نما مقرر کر لیتا ہے اور اس سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرے بچوں کی خصوصیات ان کے خوابوں میں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔

ہم بچوں میں ان خصوصیات کا مظاہرہ صرف حالت بیداری ہی میں نہیں دیکھتے بلکہ یہ خصوصیات بچوں کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہیں کہ یہ اثرات ان کے خوابوں میں بھی نمایاں ہو جاتے ہیں مثلاً پہلن بچے اکثر خواب دیکھتے ہیں کہ وہ (کسی بلند مقام سے) گر رہے ہیں یا یہ کہ وہ سب سے پہلے ہیں لیکن انھیں یقین نہیں کہ وہ اپنی اس برتری کو قائم رکھ سکیں گے۔ دوسرے بچے خواب دیکھتے ہیں کہ وہ دوڑ کا مقابلہ کر رہے ہیں (یعنی شرط دوڑ رہے ہیں) یا یہ کہ ریلوے ٹرین کے پیچھے دوڑ رہے ہیں یا بائیسکل کی شرط میں حصہ لے رہے ہیں۔ خوابوں میں یہ جلد بازی یہ دوڑ بھاگ ہم کو یہ قیاس کر لینے کے لئے کافی ہے کہ بچہ دوسرا ہے (یعنی پہلن کے بعد کا ہے)۔

ان امور کے متعلق قواعد مقرر نہیں کیے جا سکتے

ہمیں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ ان امور کے متعلق کوئی مقررہ قواعد نہیں ہیں۔ یہ لازمی نہیں کہ ہر پہلن بچہ اسی طرح عمل کرے جیسا کہ بالعموم پہلن کرتے ہیں۔ بچوں کے چال چلن پر بہ نسبت ترتیب و سلسلہ پیدائش کے گھر کے دوسرے حالات کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ایک بڑی فیملی میں (جہاں بچوں کی تعداد زیادہ ہو) بعض وقت بعد پیدا ہونے والے بچے کو

وہی مقام حاصل ہو جاتا ہے جو پہلن کو حاصل ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً ایک فیاملی میں دو بچے یکے بعد دیگرے جلد پیدا ہو جائیں اور اس کے ایک مدت کے بعد تیسرا بچہ ہو اور پھر دو بچے پیدا ہوں تو تیسرے نمبر کا بچہ وہ سب علامات ظاہر کرے گا جو پہلن کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے نمبر کا حال ہے کہ چار یا پانچ بچے پیدا ہو جانے کے بعد بھی ایک مثالی، دوسرے نمبر کا بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر کسی فیاملی میں متعدد بچے ہوں اور ان میں کسی دو بچوں کو فیاملی سے علیحدہ کر دیا جائے اور ان دونوں کی پرورش ایک جگہ کی جائے تو ان میں سے ایک سے پہلن کے اور دوسرے سے دوسرے نمبر کے بچے کی خصوصیات ظاہر ہوں گی۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ پہلن بچہ زندگی کی دوڑ میں ہار جاتا ہے تو وہ مسئلی بچہ بن جاتا ہے۔ بعض وقت پہلن اپنا مقام محفوظ رکھتا اور دوسرے نمبر کے بچے کو پیچھے کر دیتا ہے تو اس صورت میں دوسرا بچہ باعث تکلیف ہو جاتا ہے۔

لڑکے اور لڑکی میں مقابلہ

اگر پہلن بچہ لڑکا ہو اور اس کے بعد کی لڑکی ہو تو یہ موقف پہلن لڑکے کے لئے بہت نازک اور مشکل ہو جاتا ہے۔ لڑکے کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں لڑکی اس کو شکست نہ دے دے جو موجودہ زمانہ کے حالات کے تحت نہایت ہی شرم کی بات ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے درمیان جو کشاکش ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو دو لڑکوں کے مابین ہوتی ہے۔ اس کشاکش میں ۱۶ برس کی عمر تک فطرت لڑکی کی مدد کرتی ہے اس لئے وہ بہ نسبت لڑکے کے بہت تیزی کے ساتھ جسمانی اور نفسیاتی نشوونما پاتی ہے پہلن لڑکا کشاکش سے بالآخر دست بردار ہو جاتا اور بتدریج سست اور دل شکستہ ہو جاتا ہے اور اب وہ مکر و فریب سے کام لینے لگتا اور لڑکی پر غالب آجانے کے لئے اور دوسرے ذریعے اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جھوٹی شیخیاں کرنا یا جھوٹ بولنا شروع کرتا ہے۔ جب لڑکا اس قسم کی ناپسندیدہ حرکات کرنے لگتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ لڑکی کی جیت

یقین ہوگئی۔ لڑکا مختلف غلط طریقے اختیار کرنے لگتا ہے اور لڑکی آسانی کے ساتھ اپنے مسائل حل کر لیتی اور حیرت انگیز رفتار سے ترقی کرنے لگتی ہے۔ اس قسم کے مشکلات پیدا نہ ہونے دینے کی روک تھام کی جا سکتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ پہلے سے خطرہ معلوم کر لیا جائے اور قبل اس کے کہ یہ (خطرہ) نقصان پہنچائے اس کی روک تھام کر دی جائے۔ اس قسم کے برے نتائج اس فیاملی میں برآمد نہیں ہوتے جو مساوات رکھنے والے اور آپس میں تعاون کرنے والے ارکان پر مشتمل ہو اور جہاں رقابت کا نام و نشان نہ ہو اور بچے کو یہ تصور کرنے کا موقع ہی نہ ملے کہ وہ کوئی دشمن یا مخالف رکھتا ہے اور لڑنے جھگڑنے میں وقت صرف کرے۔

منجلے اور سنجلے اور چھوٹے بچوں کی کیفیت

پہلن کے بعد منجلے اور منجلوں کے بعد سنجلے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک بچہ دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دے سکتا ہے لیکن سب سے چھوٹے کو کوئی بھی اس کے مقام سے ہٹا نہیں سکتا۔ اس کے بعد بچے پیدا نہیں ہوتے وہ پہلے والوں (یعنی بڑے۔ منجلے۔ سنجلے وغیرہ) کو اپنا رفتار نما قرار دے لیتا ہے۔ وہ گھر کا چشم و چراغ سمجھا جاتا اور لاڈ اور پیار میں سب سے زیادہ بگاڑ دیا جاتا ہے اور اسے ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو بگڑے ہوئے بچے کی مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ اسے اپنے سے بڑے بھائیوں اور بہنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ بیحد کوشش کرتا ہے اور ان کے پیچھے تیزی سے دوڑتا اور ان کو مغلوب کر کے زندگی کی دوڑ میں جیت لیتا ہے۔

حضرت یوسف کا قصہ

تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے چھوٹے بچے کا مقام ہر زمانے میں ایک ہی رہا۔ قدیم زمانے کی کہانیوں میں بھی لکھا ہے کہ سب سے چھوٹے اپنے سے بڑے بھائی بہنوں پر سبقت لے گئے۔ انجیل بھی سب سے چھوٹے کو فاتح بتاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف سب سے چھوٹے تھے۔ بنجامن حضرت یوسف کے سترہ سال بعد پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے حضرت یوسف کی ابتدائی

نشو و نما پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ حضرت یوسف کا طرز زندگی بالکل وہی تھا جو فیا ملی کے سب سے چھوٹے بچے کا ہو سکتا ہے۔ ان کے خوابوں سے تک ان کا احساس برتری ظاہر ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ وہ سب میں مثل ستارے کے چمکتے رہیں اور دوسرے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہیں۔ ان کے بھائیوں نے ان کے خوابوں کا مقصد خوب سمجھا اس لئے کہ رات دن ان کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے مطمح نظر سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ جو جذبات حضرت یوسف نے اپنے خوابوں کے ذریعے ظاہر کئے وہ ان میں (یعنی بھائیوں میں) بھی موجود تھے لہذا وہ ان سے خائف ہو گئے اور یوسف کو ختم کر دینے کی ٹھان لی لیکن (خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ) حضرت یوسف جو سب سے آخر تھے سب سے پہلے ہو گئے اور بالآخر انھوں ہی نے سب فیا ملی کی کفالت کی۔

عام طور سے سب سے چھوٹی اولاد اپنی فیا ملی کی کفالت کرتی ہے اور یہ چیز اتفاقاً نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں اور سب سے چھوٹے بچوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حقیقت میں سب سے چھوٹے بچے کا موقف اس کا مؤید ہوتا ہے۔ اس کے والدین اس کے بڑے بھائی اس کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اس کا دل بڑھاتے رہتے ہیں اور اس پر پیچھے سے کوئی حملہ کرنے یا پریشان کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم نے دیکھا کہ مسئلی بچوں کی دوسرے نمبر کی تعداد ان ہی سب سے چھوٹے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی بظاہر یہ وجہ ہے کہ سب گھر والے انھیں لاڈ میں بگاڑ دیتے ہیں۔ لاڈ سے بگڑا ہوا بچہ زندگی میں کبھی آزاد اور اپنے پر اعتماد رکھنے والا نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی کسی کام میں اپنی ہمت سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ فیا ملی کے سب سے چھوٹے بچے عام طور پر امنگ بھرے ہوتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا کہ سست اور کاہل بچے سب سے زیادہ امنگ بھرے ہوتے ہیں۔ جب کوئی امنگ بھرا بچہ ناکامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اس میں کاہلی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے تو

بڑے بڑے منصوبے باندھتا ہے لیکن جب ان کے پورے ہونے کی امید باقی نہیں رہتی تو ہیٹا اور کاہل ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ سب سے چھوٹا بچہ کوئی ایک منصوبہ نہیں رکھتا بلکہ اس خیال سے کہ ہر بات میں دوسرے بھائی بہنوں سے بڑھ جائے بے شمار منصوبے باندھ لیتا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ سب سے چھوٹا بچہ کس طرح احساس کم تری میں مبتلا رہتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ماحول میں ہر ایک اس سے عمر میں طاقت میں اس سے بڑا ہوا ہے تو اُسے اپنی کم تری محسوس ہوتی ہے۔

اکلوتا بچہ

اکلوتا بچہ بھی اپنی مشکلات رکھتا ہے۔ اس کا بھی ایک رقیب ہوتا ہے لیکن یہ اس کا بھائی یا بہن نہیں۔ اس کے مقابلے کے جذبات اس کے باپ کے خلاف کام کرتے ہیں (یعنی وہ باپ سے مقابلہ شروع کرتا ہے) اکلوتا بچہ ماں کا لاڈلا ہوتا ہے۔ اور ماں اس خیال سے کہ ہاتھ سے نکل نہ جائے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنائی رکھتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ "ماں کا خبط" پیدا کر لیتا ہے اور ہمیشہ ماں کے دامن سے لپٹا رہتا ہے اور باپ کو گھر والوں کی فہرست سے خارج کر دیتا ہے۔ اس برائی کو روکا جا سکتا ہے لیکن اس کی ایک ہی تدبیر ہے کہ ماں اور باپ دونوں مل کر کوشش کریں کہ وہ بچے کو ان دونوں سے دلچسپی رکھنے کا عادی کریں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ باپ بچے کی طرف اس قدر دھیان نہیں دیتا جتنا کہ ماں دیتی ہے۔

گھر کے بڑے بچوں (یعنی بڑے اور منجھلے) کی حالت بالعموم اکلوتے بچوں کے موافق ہوتی ہے یہ چاہتے ہیں کہ باپ کو اپنا کر لیں اور اپنے سے زیادہ عمر کے افراد کو پسند کرتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا کہ اکلوتا بچہ اس اندیشے سے کہ کہیں اور بھائی بہنیں پیدا نہ ہو جائیں پریشان رہتا ہے۔ جب لوگ اسے کہتے ہیں کہ تمہیں ایک چھوٹا بھائی یا بہن ہونا چاہئے تو وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ خود ہی سب کا مرکز توجہ بنا رہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اگر اس سے یہ حق چھین لیا جائے تو اس سے نا انصافی ہو گی۔ سن بڑھنے کے بعد جب وہ گھر والوں کا مرکز توجہ باقی نہیں

رہتا تو اس کو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ دوسری چیز جو اس کی نشوونما کے لئے خطرناک ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ ڈرپوک ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر والدین کسی جسمانی خرابی کی وجہ ضبط تولید کریں اور مزید بچے نہ ہونے دیں تو ہم (انھیں قابل معافی سمجھ کر) اکلوتے بچے کی مشکلات رفع کرنے تیار ہو سکتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکلوتے بچے اکثر ان گھروں میں ہوتے ہیں جہاں اور بھی بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔ والدین چونکہ ڈرپوک اور قنوطی ہوتے ہیں اس لئے سمجھتے ہیں کہ اگر اور بچے پیدا ہوں تو ان کی معاشی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اس خیال کی وجہ سے گھر کی پوری فضا فکر اور تشویش سے مکدّر رہتی ہے اور اس کا برا اثر بچے پر پڑتا ہے۔

بچے کتنے وقفہ سے ہوں

اگر بڑے وقفوں سے بچے پیدا ہوں تو ہر ایک بچے میں اکلوتے بچے کی خصوصیات نمایاں ہوتے ہیں اور یہ حالت اچھی نہیں ہوتی۔ لوگ مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کسی فیملی میں بچے کتنے وقفہ سے پیدا ہونا چاہئے۔ کیا ایک کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوتا رہے یا یہ کہ ان کی پیدائش میں لمبا وقفہ ہو؟ میرے تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ بہترین چیز یہ ہے کہ تین سال کا وقفہ ہو۔ ایک بچہ جب تین سال کا ہو جاتا ہے تو اس میں نومولود بچے سے تعاون کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بات سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ فیملی میں ایک سے زائد بچے ہو سکتے ہیں۔ اگر بچہ ڈیڑھ یا دو سال کا ہو تو ہم یہ بات اس کو سمجھا نہیں سکتے اگر سمجھائیں بھی تو وہ ہمارے دلائل سمجھ نہیں سکتا اور ہم اسے نومولود کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں کر سکتے۔

کئی بہنوں میں ایک ہی بھائی ہو تو کیا ہوتا ہے

اگر کسی فیملی میں کئی لڑکیوں میں ایک لڑکا ہو تو بڑی مصیبت میں رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسے عورتوں کے ماحول میں اپنا وقت گذارنا پڑتا ہے۔ باپ روزانہ دن میں کئی گھنٹے گھر کے باہر رہتا ہے لڑکا اپنی ماں۔ بہنوں اور خادمات (ماماؤں) کو دیکھتا ہے اور محسوس کرتے ہوئے کہ یہ ان سے بالکل جدا ہے تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خصوصاً ایسا جب ہوتا ہے

جبکہ گھر کی عورتیں سب مل کر اس کا پیچھا اٹھاتی ہیں۔ عورتیں یا تو خیال کرتی ہیں کہ اس کو تعلیم دینا ان کا فرض ہے یا وہ لڑکے پر ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ اسے الگ تھلگ سب سے اکھڑا ہوا رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ غرض مخالفت اور رقابت جاری رہتی ہے۔ اگر وہ بہنوں کے درمیان منجھلا ہو تو یہ اس کے لئے بدترین مقام ہوتا ہے۔ اس پر اوپر اور نیچے ہر دو جانب سے حملے ہوتے ہیں۔ اگر وہ اولاد اکبر ہو تو اسے اپنے بعد کی بہن سے مقابلہ کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اگر وہ سب سے چھوٹا ہو تو بہنیں اسے کھلونا بنا لیتی ہیں۔ القصہ کئی لڑکیوں میں ایک لڑکا ہونا ایسا ہے کہ کوئی لڑکا اسے پسند نہیں کرتا۔ اس مسئلہ کا صرف ایک حل ہو سکتا ہے کہ لڑکے کو سماجی زندگی ملے اور اسے دوسروں سے ملنے جلنے۔ دوستی ملاقات کا موقع ملے۔ اگر ایسا موقع نہ ملے تو ہمیشہ لڑکیوں کی صحبت میں رہنے سے لڑکیوں کی حرکات اختیار کرے گا۔ اس کا مذاق اور اس کی زندگی کا نظریہ زنانی ہوگا۔

بالکل زنانہ اور مخلوط ماحول کا فرق۔

ایک بالکل زنانہ اور مخلوط ماحول (یعنی جس میں مرد اور عورتیں ہوں) میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر کمروں کو سجانے کا کوئی خاص معیار قرار نہ دیا جائے اور افراد کو اپنے مذاق کے مطابق اپنے کمرے سجانے کہا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ کمرے جس میں عورتیں رہتی ہیں نہایت صاف پاک ہیں۔ ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی ہے۔ رنگوں کا انتخاب احتیاط سے کیا گیا ہے اور متعدد تفصیلات پر توجہ کی گئی ہے۔ جن کمروں میں مرد اور لڑکے رہتے ہیں ان میں وہ صفائی اور سلیقہ نظر نہ آئے گا بلکہ ہر چیز بے ترتیب ہوگی۔ فرنیچر لوٹا ہوا ہوگا اور کمروں میں شور و غل ہوتا رہے گا۔

اگر بچہ زنانہ ماحول میں پرورش پائے تو کیا ہوتا ہے

وہ بچہ جو عورتوں میں پرورش پاتا ہے زنانہ مذاق اور نظریۂ زندگی پیدا کر لیتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ اس ماحول کے خلاف وہ جنگ شروع کر دیتا ہے اور اپنے مردانہ پن کا بے موقع مظاہرہ کرنے لگتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ عورتوں کو اپنے پر حاوی نہ ہونے دے۔

وہ ہمیشہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ جنس کا فرق ظاہر کرتا اور اپنی مردانگی جتاتا رہے۔ اس تمام کارروائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیاملی میں کشاکش جاری رہتی ہے۔ اس قسم کے بچے کی نشو و نما بڑی تیزی سے ہوتی ہے وہ یا تو (جسمانی اور نفسیاتی حیثیت سے) بہت قوی ہو جاتا ہے یا بہت کم زور نکلتا ہے اور یہ ایسا غیر معمولی موقف ہے کہ غور اور تحقیق کے قابل ہے۔ اس بارے میں مزید خیالات کا اظہار کرنے کے قبل ہمیں اس قسم کے چند اور بچوں کے حالات کی جانچ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ تنہا لڑکی جو لڑکوں کے درمیان پرورش پاتی ہے یا تو بے حد زنانہ پن اختیار کرتی ہے یا شدت سے مردانہ خصوصیات ظاہر کرتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر مجبور اور غیر محفوظ ہونے کے جذبات کا شکار بنی رہتی ہے۔

خلاصہ فصل

جب کبھی میں نے نوجوانوں کے حالات پر غور کیا تو میں نے ان میں بچپن کے ارتسامات کے اثرات پائے۔ بچوں کا فیاملی میں جو موقف ہوتا ہے وہ ان کی طرز زندگی کے ڈھالنے اور بنانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بچوں کی نشو و نما میں جو بھی مشکل پیدا ہوتی ہے وہ فیاملی کے ارکان کی باہمی رقابت اور عدم تعاون کی وجہ ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے اطراف کی سماجی زندگی پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ آخر ہماری سوسائٹی میں رقابت اور مقابلے کا روگ کیوں پھیلا ہوا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نہ صرف ہماری سماجی زندگی میں یہ خرابی موجود ہے بلکہ تمام دنیا اس کا شکار ہو چکی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اہل دنیا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے پر غالب آجائیں ایک دوسرے سے بڑھ جائیں۔ دنیا والوں کی یہ بری خواہش ان کی بچپن کی بری تعلیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ فیاملی کے ارکان کی باہمی رقابت ایک دوسرے سے مقابلے اور بچوں کا یہ احساس کہ فیاملی میں انھیں مساوی مواقع نہیں ہیں یہ بات پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر شروع سے بچوں کو تعاون کی تعلیم دی جائے تو یہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

فصل ساتویں

مدرسہ کے اثرات

مدارس کے قیام کی ضرورت کیوں ہوئی

مدرسہ فیاملی کی زندگی کا پھیلا ہوا ہاتھ ہے۔ اگر والدین اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکتے اور انھیں زندگی کے مسائل حل کرنے کے قابل کر سکتے تو مدرسہ کی تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پرانے کلچروں میں عام طور پر بچوں کی پوری تربیت گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ایک کاریگر اپنی صنعت و حرفت کی تعلیم بچوں کو خود دیا کرتا تھا اور جو مہارت اس نے اپنے باپ اور اپنے ذاتی تجربہ سے حاصل کی تھی اس سے اپنے بچوں کو واقف کر دیتا تھا۔ ہمارے موجودہ کلچر میں چونکہ ہمارے مشاغل پیچیدہ ہو گئے ہیں اس لئے ہمارا بوجھ ہلکا کرنے اور جس تعلیم کی ہم نے گھر میں ابتدا کی اس کو پورا کرنے کے لئے مدارس کا وجود ضروری ہوا۔

زندگی کے سماجی ضروریات ایسی ہیں کہ وہ اس تعلیم سے جو گھر میں دی جاتی ہے کہیں زیادہ تعلیم کا مطالبہ کرتی ہیں۔

یورپ کے مدارس

امریکا کے مدارس نے ترقی کے وہ تمام مدارج طے نہیں کئے جو یورپ کے

مدارس کر چکے ہیں لیکن اب بھی بعض اوقات ہم ان مدارس (یعنی یورپ کے مدارس) میں تحکمانہ روایات کی جھلک پاتے ہیں۔ یوروپین تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے پہل شہزادوں اور شاہی خاندان کے بچوں کو کچھ شد بود تعلیم دی جاتی تھی اور سماج میں ان ہی چند افراد کی قدر کی جاتی تھی اور دوسروں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے پیشوں میں مصروف رہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ امید نہ رکھیں۔ جب سماج کے حدود وسیع ہوئے تو مذہبی اداروں نے تعلیم کا کام اپنے ذمے لیا اور چند منتخب افراد کو مذہب (دینیات) فنون۔ سائینس اور مختلف پیشوں کی تعلیم دینا شروع کیا۔

جب مختلف صنعتوں میں ترقی ہونے لگی اور ان میں باریکیاں پیدا ہونے لگیں تو اس قسم کی تعلیم ناکافی ثابت ہونے لگی اور بہتر وسیع تعلیم کے لئے کشمکش شروع ہوئی جو زمانہ دراز تک جاری رہی۔ دیہات اور چھوٹے شہروں میں اکثر مدرسین موچی اور درزی ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ ڈنڈے کی مدد سے تعلیم دیتے تھے اس لئے نتائج خراب ہوتے تھے۔ مذہبی مدارس اور جامعات میں سائینس اور فنون کی تعلیم ہوتی تھی۔ بعض بادشاہ تک پڑھنا لکھنا نہ جانتے تھے۔

پبلک مدرسے

صنعتوں کی ترقی کی وجہ مزدوروں کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ لکھنا۔ پڑھنا۔ حساب اور ڈرائنگ سیکھیں۔ اس کے لئے پبلک مدارس قائم کرنا لازم ہو گیا۔ پبلک مدارس ہمیشہ حکومت وقت کی پالسی کے مطابق قائم کئے جاتے تھے اور ہر زمانے کی حکومت کا مطمح نظر یہی ہوتا کہ ان پبلک مدرسوں میں ایسی تعلیم دی جائے کہ جو مطیع اور فرماں بردار افراد پیدا کرے جو اعلٰی طبقے کے لوگوں کی خدمت کریں اور وقت ضرورت سپاہیوں کا کام دے سکیں۔ ان مدارس کا نصاب ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کیا جاتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک زمانے میں آسٹریا میں یہی حالت تھی۔ نادار اور مفلس افراد کے بچوں کو ایسی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ اطاعت گزار بنیں اور اتنی ہی اور اسی قسم کی تعلیم پائیں جتنی کہ ان کے پست درجے کے لئے موزوں اور مناسب ہو۔ اس قسم کی تعلیم کی

محدودیت اور اس کے نقائص بتدریج لوگوں پر ظاہر ہونے لگے۔ آزادی
مزدور پیشہ افراد طاقت ور ہونے لگے اور ان کے مطالبات بڑھنے لگے
کے کارکن مجبور ہوئے کہ ان کے مطالبات پورے کریں۔ بتدریج یہ ن
کر لیا گیا کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان میں بطور خود سوچ بچار کر
پیدا کر دے۔ ان کو ادب۔ سائنس اور فنون سے واقفیت حاصل کر
دے اور ان کی تعلیمی نشو ونما ایسی ہو کہ وہ انسانی مکمل تہذیب میں حص
اور اس میں اضافہ کر سکیں۔ اب ہم بچوں کو صرف اس مقصد سے تعلیم نہیں
وہ بڑے ہو کر روپیہ پیدا کریں یا کسی صنعتی سسٹم میں کام کریں۔ ہم چاہ
(بچے تعلیم پا کر) انسان بنیں۔ آپس میں مساوات قائم کریں۔ آزادی اور
کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہمارے کلچر کو بڑھائیں۔

اخلاق کی تعلیم وہ سب افراد جو مدارس میں اصلاح کی تحریک کرتے ہیں چاہے و
کا علم رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں وہ سب حقیقت میں سماجی زندگی میں تعا
کے لئے راستہ تیار کر رہے ہیں مثلاً اخلاقی تعلیم کے مطالبہ کا یہی مقصد
ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو پھر مطالبہ بھی صحیح ہے۔ اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے ت
ہوگا کہ تعلیم کے مقاصد اور تعلیم دینے کے طریقوں کو اب تک اچھی طرح سمجھ
گیا۔ ہمیں ایسے مدرسین کی تلاش کرنی چاہیئے جو بچوں کو صرف روپیہ کمانا نہ س
بلکہ انھیں انسانیت کے لئے مفید کام انجام دینے کے قابل بنائیں۔ مدرسی
کہ اس کام کی اہمیت کو خوب محسوس کر لیں اور پھر اس کی تکمیل کے لئے تر
حاصل کریں۔

اخلاقی تعلیم ابھی آزمائشی حالت میں ہے۔ عدالتوں کو ہمیں نظر اندا
چاہیئے اس لئے کہ ان میں اب تک اخلاق کی تعلیم دینے کی کوئی سنجیدہ او
نہیں کی گئی۔ مدارس میں بھی اس تعلیم کے نتائج اطمینان بخش نہیں رہے۔ وہ بچے
میں ناکامیاب اور ناکارہ ثابت ہوتے ہیں مدارس میں شریک کئے جاتے ہیں۔

باوجود پند و نصیحت کے ان کی اصلاح نہیں ہوتی لہذا اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ مدرسین کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ مدارس میں بچوں کی اچھی نشو و نما میں مدد دے سکیں اس قسم کا کام میرے فرائض میں بھی شامل تھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ویاناؔ کے مدارس کی حالت دوسرے مدارس کے نسبتاً بہتر ہے۔ دوسرے مقامات کے مدارس میں دماغی امراض کے ماہر معالجین مامور ہیں جو بچوں کا معائنہ کرتے اور ان کے متعلق ہدایات دیتے ہیں لیکن اگر مدرسین ان ہدایات سے اتفاق نہ کریں اور ان پر عمل نہ کریں تو ان سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ ماہر معالج بچے کو ہفتہ میں ایک دو دفعہ یا زیادہ سے زیادہ روز ایک دفعہ دیکھتا ہے وہ بچے کے ماحول۔ گھر کے گھر کے باہر کے اور مدرسے کے اثرات سے واقف نہیں ہوتا۔ ماہر معالج صرف نوٹ لکھ دیتا ہے کہ بچے کو بہتر غذا یا غدودی علاج کی ضرورت ہے اور بعض دفعہ مدرس کو بچے کے علاج کے متعلق چند ہدایات دے دیتا ہے۔ مدرس چونکہ تجویز کردہ نسخہ (یعنی ہدایات) سمجھ نہیں سکتا اور ناتجربہ کار ہوتا ہے اس لئے غلطیاں کرتا ہے۔ مدرس جب تک خود بچے کے اخلاق و عادات سے بخوبی واقف نہ ہو کچھ نہیں کر سکتا لہذا یہ بہت ضروری ہے کہ معالج اور مدرس کے درمیان تعاون ہو۔ ہر وہ چیز جو ماہر معالج بچے کے متعلق معلوم کر لے اس سے مدرس بھی خوب واقف ہو جائے تاکہ معالج سے (مرض یا خرابی کے متعلق) اچھی طرح بحث کر لینے کے بعد معالج کی مدد کے بغیر خود علاج کر سکے۔ اثناء علاج میں اگر کوئی غیر معمولی اور غیر متوقعہ مسئلہ درپیش ہو جائے تو مدرس اس کو سمجھ کر اسی طرح حل کر سکے جیسا کہ معالج کی موجودگی میں کرتا۔ سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہوگا کہ ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے جیسا کہ ہم نے ویاناؔ میں قائم کی ہے۔ اس کا مفصل ذکر میں اس فصل کے آخری حصے میں کرونگا۔

مدرسے میں بچوں کی آزمائش ہوتی ہے

جب بچہ مدرسے میں شریک ہوتا ہے تو اسے سماجی زندگی کی نئی آزمائش کا مقابلہ ہوتا ہے اور اگر اس کی نشو و نما اور پرورش میں غلطیاں کی گئی ہوں تو وہ اس آزمائش سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ (مدرسے

میں شریک ہو جانے کے بعد) اب اسے بڑے پیمانے پر تعاون کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ گھر میں لاڈ سے بگاڑ دیا گیا ہو تو وہ اس تعاون کو پسند نہیں کرتا دوسرے بچوں کے ساتھ میل ملاپ نہیں کرتا اور ہمیں پہلے ہی روز اس لاڈلے بچے میں سماجی جذبات کی کمی کا حال معلوم ہو جاتا۔ ممکن ہے یہ بچہ (مدرسے میں) رونے لگے اور گھر واپس جانا چاہے۔ وہ نہ تو مدرسے کے مشاغل میں دلچسپی لے گا اور نہ مدرس سے مانوس ہوگا۔ وہ چونکہ ہر وقت اپنے آپ میں ڈوبا رہے گا اس لئے مدرس کی باتوں پر کان نہ دھریگا۔ اور جب اپنے آپ میں محو رہے گا تو ظاہر ہے کہ تعلیم میں پیچھے رہے گا۔ مسئلی بچوں کے والدین کو اکثر یہ کہتے ہوئے ہم نے سنا ہے کہ ان کے بچے جب گھر میں رہتے ہیں تو کچھ تکلیف نہیں دیتے لیکن جب مدرسہ جاتے ہیں تو باعث زحمت ہو جاتے ہیں۔ ہمارا گمان ہے کہ بچہ جب گھر میں رہتا ہے تو خود کو اپنی مرضی کے موافق ماحول میں پاتا ہے جہاں نہ اس کی کوئی آزمائش کی جاتی ہے اور نہ اس کے عیوب و نقائص نمایاں ہوتے ہیں اس کے برعکس مدرسے میں کوئی اس کے لاڈ نہیں اٹھاتا لہذا وہ خود کو شکست یافتہ حالت میں پاتا ہے۔

ایک بچے کی مثال

ایک بچہ تھا جو مدرسے میں مدرس کی ہر بات پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہ کرتا تھا۔ مدرسے کے کسی کام سے کبھی اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی اس کے متعلق مدرسے میں عام خیال تھا کہ یہ کم زور دماغ رکھتا ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اس کو کہا کہ ہر شخص متحیر ہے کہ تم مدرسے میں تمام وقت ہنستے کیوں رہتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ مدرسہ ایک مذاق کی چیز ہے جس کو والدین نے قائم رکھا ہے اور بچوں کو بے وقوف بنانے کے لئے وہاں بھیجتے ہیں۔ اس بچے کا گھر میں ہمیشہ مذاق اڑایا جاتا تھا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ مدرسے کو بھی اپنے خلاف مذاق ہی سمجھنے لگا۔ میں نے یہ بات اس کے ذہن نشین کی کہ وہ اپنی شان قائم رکھنے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے اور یہ کہ ہر شخص اس کو بے وقوف نہیں بناتا۔ (جب یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تو) وہ مدرسہ کے مشاغل میں

دلچسپی لینے اور تعلیم میں ترقی کرنے لگا۔

مدرسین کا فرض

مدرسین کا کام ہے کہ وہ بچوں کی مشکلات معلوم کریں اور والدین کی غلطیوں کی اصلاح کریں۔ مدرسین کو بعض ایسے بچوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جو مدرسہ کی وسیع سماجی زندگی میں آسانی سے داخل ہوجاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بچوں کو گھروں میں دوسروں سے دلچسپی رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور بعض بچوں کو گھروں میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی۔

جب کوئی شخص کسی مسئلہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتا ہے یا اس مسئلہ سے دوری اختیار کرتا ہے۔ ہر وہ بچہ جو کسی قدر غبی ہو لیکن کم عقل نہ ہو سماجی زندگی میں داخل ہونے سے ہچکچاتا اور گھبراتا ہے لیکن استاد اگر چاہے تو اس بچے کی اس طرح مدد کرسکتا ہے کہ وہ اپنے ماحول (یعنی آس پاس کی سماجی زندگی) میں اپنی جگہ نکال لے۔ اب سوال یہ ہے کہ مدرس بچے کی مدد کس طرح کرے؟ مدرس کو وہی کرنا چاہیئے جو ماں کرتی ہے یعنی یہ کہ بچے کو اپنے سے مانوس کرلے اور اس میں اپنے لئے دلچسپی پیدا کرادے۔ اس انست اور دلچسپی پر بچے کی مدرسہ کی آئندہ زندگی کا انحصار ہوگا۔ سختی کرنے اور مار پیٹ سے بچے میں دلچسپی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی بچہ مدرسہ میں شریک ہونے کے بعد مدرس اور اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا مشکل پائے تو بچے پر اعتراضات کی بارش کرنے اور اس کو سخت سست کہنے سے بدتر اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ایسا کیا جائے گا تو بچے کے عمل کی تائید ہوگی اور اس کا مدرسے سے نفرت کرنا حق بجانب ہوگا۔ میں مانتا ہوں گا اگر میں بچہ ہوتا اور مدرسہ میں مجھے ہمیشہ برا کہا جاتا تو میں جہاں تک ممکن ہوتا مدرسے اور مدرسین سے دور بھاگتا اور ایسی ترکیبیں سوچتا کہ مدرسہ سے مجھے ہمیشہ کے لئے نجات ملے۔

مدرسے سے غائب ہونے والے بچے

وہی بچے مدرسے سے غائب رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں اور مدرسے میں غبی اور ناکارہ سمجھے جاتے ہیں۔

جن کے لئے مدرسہ کا ماحول ناخوشگوار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ حقیقت میں احمق نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات بڑی چالاکی سے مدرسہ نہ آنے کے وجوہ گھڑ لیتے اور والدین کے جعلی خطوط لا کر پیش کرتے ہیں۔ مدرسے کے باہر انھیں اور بھی ایسے بچے مل جاتے ہیں جو مدرسے سے غائب رہنے کے عادی ہیں۔ اور ان سے انھیں تائید ملتی ہے اور وہ حوصلہ افزائی حاصل ہوتی ہے جو مدرسے میں نہیں ہوتی۔ اس گروہ سے انھیں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو مدرسے سے نہ ہو سکی اور وہ اس ٹولی میں اپنی جگہ پیدا کر لیتے اور اس کے رکن بن جاتے ہیں۔ اس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ بچے جو مدرسے کی جماعت کا خود کو ایک جزو بنا نہیں سکتے اور جماعت میں اپنی جگہ پیدا نہیں کر سکتے کس طرح (خراب صحبت میں پڑ کر) خود کو مجرمانہ زندگی کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔

اگر مدرس بچے کی دلچسپی اور اپنے سے انس حاصل کرنا ضروری سمجھے گا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ بچے کی پہلی دلچسپیاں کیا ہیں (یعنی وہ کن چیزوں سے دلچسپی رکھتا ہے) اور پھر یہ بات بچے کے ذہن نشین کرے گا کہ جیسا وہ دوسری چیزوں سے دلچسپی لیتا رہا ویسا ہی مدرسے اور مدرس سے بھی دلچسپی پیدا کر سکتا ہے۔ جب بچے کو کسی ایک معاملہ میں اعتماد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر دوسرے معاملات کے متعلق اس میں اعتماد پیدا کر دینا آسان ہو جاتا ہے۔

معلوم کرنا چاہیئے کہ بچہ کون سے عضو سے زیادہ کام لیتا ہے

ہمیں چاہیئے کہ ہم شروع ہی سے یہ بات معلوم کریں کہ بچہ دنیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور اس کا کون عضو اس کا خاص طور پر مرکز توجہ رہا اور اچھی طرح نشو و نما پایا۔ بعض بچوں کو دیکھنے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ بعض کو سننے کا شوق ہوتا ہے۔ بعض چلنے پھرنے کو پسند کرتے ہیں۔ بصری قسم کے بچوں میں ان مضامین سے دلچسپی پیدا کر دی جا سکتی جن میں آنکھوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے مثلاً جغرافیہ۔ ڈرائنگ وغیرہ۔ اگر اس قسم کے بچوں کو مدرس صرف لیکچر دیتا رہے گا تو وہ دل لگا کر نہ سنیں گے اس لئے کہ وہ سننے کے عادی نہ ہوں گے۔ اس قسم کے بچوں کو اگر آنکھوں کے ذریعے تعلیم

حاصل کرنے کا موقع نہ ملے گا تو وہ ترقی نہ کریں گے اور فرض کر لیا جائے گا کہ وہ کند ذہن ہیں اور اس کا (یعنی کند ذہنی کا) الزام توارث پر دھر دیا جائے گا۔ اگر کوئی قابل الزام ہیں تو وہ مدرسین ہیں نہ کہ والدین اس لئے کہ مدرسین ایسے طریقے تعلیم کے اختیار نہیں کرتے کہ بچوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بچوں کو تعلیم دینے کے لئے کوئی خاص مہارت حاصل کی جائے۔ لیکن مدرس کو بچوں کی نفسی تعلیم سے دلچسپی پیدا کر لینا چاہیئے تاکہ وہ بچوں میں دوسری دلچسپیاں پیدا کر سکے۔

آجکل بعض ایسے مدارس موجود ہیں جن میں بچوں کو مختلف مضامین ایسے طریقوں سے پڑھائے جاتے ہیں کہ ان کے حواس کی تشفی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسباق کے ساتھ ڈرائنگ اور ماڈلنگ کو شریک کر لیا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان مضامین کا تعلق و ربط زندگی کے ساتھ قائم کر دیا جائے تاکہ بچے خود تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ سمجھ لیں اور تعلیم کا عملی فائدہ محسوس کریں۔

تعلیم کے ساتھ بچوں میں سوچ بچار کا مادہ بھی پیدا کرنا چاہیئے۔

یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ آیا بچوں کو مختلف مضامین کی تعلیم دینی چاہیئے یا انھیں بطور خود غور و فکر کرنے کا عادی کرنا چاہیئے؟ اس سوال کے متعدد اور متضاد جوابات پائے جاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ دونوں طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے (یعنی بچوں کو پڑھانا بھی چاہیئے اور انھیں سوچ بچار کا عادی بھی کرنا چاہیئے) مثلاً ریاضی پڑھاتے وقت بچے میں تعمیر امکنہ کے مسئلہ سے دلچسپی پیدا کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔ اس سے بچہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس قدر لکڑی کی ضرورت ہوگی۔ کتنے افراد مکان میں رہ سکیں گے وغیرہ۔ بعض مضامین ملا کر آسانی کے ساتھ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ ماہرین زندگی کے ایک جزو کو دوسرے جزو سے اچھی طرح جوڑ دیتے ہیں۔ مدرس بچوں کے ساتھ کھیلنے جا سکتا ہے اور معلوم کر سکتا ہے کہ بچوں کو کن چیزوں سے دلچسپی ہے اور ساتھ ہی بچوں کو مختلف پودوں کے اقسام۔ ان کی ساخت۔ نشو و نما اور ان پر موسم کا اثر کیا ہوتا ہے اور ان کے

استعمال کے متعلق معلومات بہم پہونچا سکتا ہے۔ اس سرزمین کی خصوصیات وہاں کی تاریخ اور اسی قسم کی متعدد باتیں جن کا تعلق زندگی سے ہو بیان کرسکتا ہے میں یہ سب باتیں یہ فرض کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ مدرس کو بچوں سے حقیقی دلچسپی ہے اور وہ شوق سے انھیں تعلیم دیتا ہے۔ اگر میرا یہ مفروضہ غلط ہے تو پھر میں نے جو کچھ کہا وہ سب بیکار ہے۔

تعاون مفید اور مسابقت نقصان دہ ہے

ہمارا موجودہ سماجی نظام ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بچہ مدرسہ آتا ہے تو 'تعاون' اختیار کرنے کے عوض 'مسابقت' کے لئے زیادہ تیار رہتا ہے اور پھر مدرسے میں بھی 'مسابقت' کی تربیت شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے اور یہ چیز بچے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ بچہ اگر کوشش کرکے دوسرے بچوں سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی اس کے لئے اتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے جتنا کہ اس کوشش میں اس کا تھک کر پیچھے رہ جانا اور اس کشمکش سے باز آجانا مضر ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اس کی دلچسپی اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کی مدد کرے اور انھیں فائدہ پہونچائے بلکہ چاہتا ہے کہ سب کچھ خود حاصل کرلے۔

جیسا کہ عائلی ایک وحدت ہونی چاہیئے جس میں ہر ایک رکن اس وحدت کا ایک برابر کا جزء سمجھا جانا چاہیئے وہی حال جماعت کا ہونا چاہیئے اگر اس چیز کو سمجھ کر بچوں کو تعلیم و تربیت دی جائے تو بچے آپس میں ایک دوسرے سے دلچسپی لیں گے، اور تعاون کا لطف اٹھائیں گے۔

میں نے کئی شریر اور بگڑے ہوئے بچے دیکھے کہ جب ان میں دوسروں میں دلچسپی لینے اور تعاون کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی گئی تو وہ سدھر گئے اور راہ راست پر آگئے۔

ایک بچے کا حال

میں خصوصیت کے ساتھ ایک بچے کا حال بیان کرتا ہوں۔ یہ بچہ ایک ایسے گھر سے آیا تھا جہاں کا ہر رکن اس کا مخالف تھا۔ جب یہ

مدرسے میں شریک ہوا تو یہ خیال ساتھ لے کر آیا کہ یہاں بھی اس کی مخالفت ہوگی۔ اس کا کام مدرسے میں ناقابل اطمینان رہا اور جب والدین کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اسے سزا دی۔ یہ صورت حال اکثر واقع ہوتی ہے کہ مدرسے سے جب بچے کو بری رپورٹ دی جاتی ہے تو مدرسے میں مدرسین اس کو برا بھلا کہتے ہیں جب بچہ رپورٹ لے جا کر والدین کو دیتا ہے تو پھر وہ اسے سزا دیتے ہیں۔ مدرسین کی لعن طعن کیا کم تھی اس پر والدین کی طرف سے سزا، آفت پر آفت ہو جاتی ہے۔ غرض یہ بچہ تعلیم میں پیچھے رہ گیا اور جماعت کے لیے باعث پریشانی ہو گیا۔ بالآخر اسے ایک ایسا مدرس مل گیا جو اس کے حقیقی حال سے واقف ہو گیا اور اس نے جماعت کے دوسرے بچوں کو سمجھایا کہ اس بچے کی کمزوری یہ ہے کہ وہ تم سب کو اپنے مخالف اور دشمن تصور کرتا ہے۔ مدرس نے دوسرے بچوں کو آمادہ کر لیا کہ وہ سب ممکنہ طور پر اس بچے کو یقین دلانے کی کوشش کریں کہ وہ اس کے دوست ہیں۔ جماعت کے بچوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد ہی یہ بچہ تعلیم میں خاطر خواہ ترقی کرنے لگا۔

کیا بچے ایک دوسرے کو سمجھ کر تعاون کر سکتے ہیں؟

اس مسئلہ میں کہ آیا بچوں کو ایسی تربیت دی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی مدد کر سکیں بعض افراد شک رکھتے ہیں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بچے بہ نسبت بڑوں کے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک ماں اپنے دو بچوں کو میرے پاس لائی۔ ایک لڑکی جس کی عمر دو سال تھی اور ایک لڑکا تین سال کا لڑکی میز پر چڑھ گئی۔ ماں ڈر گئی (اور اس خیال سے کہ بچی گر نہ جائے) اس قدر پریشان ہوئی کہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکی جہاں بیٹھی تھی وہاں سے چلانا شروع کی کہ "میز پر سے اترو۔ اترو" لڑکی نے کوئی پروا نہ کی تو اس وقت تین برس کا لڑکا کہنے لگا "وہیں کھڑی رہو" یہ سنتے ہی لڑکی فوراً میز پر سے اتر آئی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ بہ نسبت ماں کے بھائی اپنی بہن سے زیادہ واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیئے۔

جماعت میں بچوں کی حکومت

جماعت کے بچوں میں اتفاق اور تعاون کی صلاحیت بڑھانے کے لئے اکثر یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ بچوں کو اپنے امور کا بطور خود انتظام کرنے اور انجام دینے کا موقع دیا جائے یعنی جماعت میں بچوں کی حکومت جاری کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں ہمیں بہت محتاط رہنا چاہئے اور جماعت میں بچوں کی حکومت جاری کرنے سے قبل اس امر کا یقین کرلینا چاہئے کہ بچے پہلے سے اس چیز کے لئے تیار کرلئے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بچے جماعت کی حکومت کو سنجیدگی کے ساتھ جاری نہیں رکھتے اور اس کو ایک کھیل سمجھنے لگتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بہ نسبت مدرس کے سزائیں وغیرہ دینے میں زیادہ سختی کرتے ہیں یا اپنے جلسوں کو اپنے ذاتی فائدہ کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور خود اپنے لئے برتر مقام پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں پس مدرس کے لئے بیحد ضروری ہے کہ وہ ابتداً بچوں پر نظر رکھے اور ان کو مشورہ دیتا رہے۔

بچوں کی ذکاوت کی آزمائش

بچوں کی دماغی اور نفسیاتی نشو و نما کا معیار ان کے عادات و اطوار اور ان کا سماجی چلن معلوم کرنے کے لئے ہمیں کسی نہ کسی قسم کی آزمائشیں کرنی پڑتی ہیں۔ بعض دفعہ ذکاوت و فراست کی آزمائش بچوں کے لئے باعث نجات ثابت ہوتی ہے مثلاً ایک لڑکے کی تعلیمی رپورٹ خراب ہوتی ہے اور مدرس چاہتا ہے کہ اس کو نیچے کی جماعت میں ڈال دے۔ اس بچے کی ذکاوت کا امتحان لیا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں ترقی پانے کا مستحق ہے نہ کہ درجہ گھٹانے کا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ذکاوت کی آزمائش سے ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ بچے کی آئندہ نشو و نما کیسی ہوگی۔ ذکاوت کے حاصل قسمت سے ہم صرف بچے کی مشکلات معلوم کرسکتے اور ان کو دور کرنے کے کوئی طریقے اختیار کرسکتے ہیں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ آزمائش میں جب حاصل قسمت ذکاوت دماغی کمزوری نہیں بتاتا تو دوسرا صحیح طریقہ آزمائش اختیار کرنے سے یہ بدل جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا جب ذکاوتی آزمائشوں سے بچوں کو واقف کردیا جاتا اور ان سے کھیلنے کا انھیں موقع

دیا جاتا ہے تو وہ ان سے خوب آگاہ ہو جاتے ان کی باریکیاں معلوم کر لینے اور ان کے متعلق کافی تجربہ حاصل کر لیتے ہیں اور ان کا حاصل قسمت ذکاوت ترقی کر جاتا ہے۔ حاصل قسمت ذکاوت کو ایک آخری حد نہ سمجھنا چاہیے اور یہ تصور نہ کرنا چاہیے کہ توارث یا قسمت نے بچے کی صلاحیت کو محدود کر دیا ہے اور اب بچہ کوئی کار نمایاں نہیں کرے گا۔

بچے کو یا اس کے والدین کو آزمائش ذکاوت کے حاصل قسمت سے مطلع نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ وہ آزمائش کے مقصد سے واقف نہیں ہوتے اور اس کو آخری فیصلہ سمجھ لیتے ہیں۔ بچے کی تعلیم میں اس کی معذوریوں سے اتنی مشکل نہیں پڑتی جتنی مشکل بچے کو ان معذوریوں کا علم ہو جانے سے پڑتی ہے۔ جب بچے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا حاصل قسمت آزمائش ذکاوت گرا ہوا ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ تعلیم میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں چاہیے کہ تعلیم کے زمانے میں ہم بچے کا دل بڑھاتے رہیں اور اس میں دلچسپی پیدا کریں۔ اگر بچے نے اپنی قابلیت وصلاحیت پر حدود قائم کر لئے ہوں تو انھیں مٹا دیں۔

مدرسوں کی رپورٹ

مدارس کی رپورٹوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر مدرس کسی بچے کو بری رپورٹ لکھ کر دیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ (مدرس) بچے کو زیادہ محنت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اگر بچے پر گھر میں سختی کی جاتی ہے تو وہ اس بری رپورٹ کو گھر لے جانے سے ڈرتا ہے۔ ان حالات کی وجہ بعض دفعہ بچوں نے خودکشی کر لی ہے۔ پس مدرس کو چاہیے کہ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھے کہ اس کی مرتبہ بری رپورٹ کے کیا نتائج ہوں گے۔

اگرچہ کہ مدرسین بچے کی خانگی زندگی کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس پر بھی انھیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اگر بچے کے والدین امنگ بھرے اور اونچے خیالات رکھنے والے ہوں تو جب بچہ بری رپورٹ گھر لائے گا تو یہ (والدین)

ہنگامہ برپا کریں گے اور بچے کو ملامت کریں گے۔ مدرس بری رپورٹ دینے کے عوض نرمی اور فیاضی سے کام لیتا تو اس کا امکان تھا کہ بچے کا دل بڑھتا اور وہ کوشش کرکے آیندہ کامیاب ہوتا۔ اگر کسی بچے کی تعلیمی رپورٹ ہمیشہ بری رہے اور ہر شخص اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کرے کہ وہ جماعت کا بدترین طالب علم ہے تو پھر یہ بات بچے کے بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے اور وہ خود کو نکما سمجھنے لگتا ہے بدترین طالب علم بھی ترقی کر سکتا ہے۔ برے سے برے بچے درست ہو سکتے ہیں۔ ہمیں مشہور و معروف افراد کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بچہ مدرسے میں سست و پھڈی رہا ہو تو آیندہ اپنے میں ہمت اور شوق پیدا کرکے آگے بڑھ سکتا اور کارنمایاں انجام دے سکتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ رپورٹوں کے بغیر بھی بچے آپس میں ایک دوسرے کی قابلیت کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں اور معلوم کر لیتے ہیں کہ ان میں سے حساب میں املا نویسی۔ ڈرائنگ اور کھیل اور ورزشوں میں کون سب سے اچھا ہے اس طرح اپنی درجہ بندی خود کر لیتے ہیں۔

بچوں کی غلطی

بچے جو غلطی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ خیال کر لیتے ہیں کہ ترقی نہیں کر سکتے۔ دوسروں کو جب اپنے سے آگے دیکھتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ یہ آگے بڑھے ہوئے بچوں کو ملا لے نہ سکیں گے۔ اگر بچپن ہی میں یہ خیال کسی بچے کے ذہن نشین ہو جائے تو وہ آئندہ زندگی میں باقی رہے گا وہ جوان ہو کر بھی یہی سمجھتا رہے گا کہ اُسے دوسروں سے پیچھے رہنا چاہیئے۔

اکثر بچے مدرسے کی تعلیم کے زمانے میں سب جماعتوں میں کم و بیش ایک ہی نمبر پر رہتے ہیں یا تو اول رہتے یا درمیانی نمبر پر یا سب سے نیچے۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ بچوں کے غبی یا چالاک ہونے کا تعلق فطرت یا پیدائشی اثر سے ہوتا ہے بلکہ اس سے وہ حدود معلوم ہو جاتے ہیں جو بچے اپنے لئے خود قایم کر لیتے اور جن کا انحصار ان کے احساس رجائیت پر ہوتا ہے اور جو وہ اپنے

مشاغل میں ظاہر کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بچہ جو جماعت میں سب سے آخر رہتا تھا ترقی کرکے اوپر آگیا۔ بچوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی اس حد بندی کی غلطی کو سمجھ لیں۔ مدرسین اور بچے اس وہم کو دل سے دور کردیں کہ ایک اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے بچے کی تعلیمی ترقی کا تعلق 'توارث' سے ہوتا ہے۔

توارثی حدود کا تصور غلطی ہے۔

تعلیم میں جو غلطیاں کی جاتی ہیں ان میں سب سے بڑی غلطی یہی توارثی حدود کا تصور ہے (یعنی یہ تصور کرلینا کہ بچے اپنی خاندانی کمزوریوں کی وجہ تعلیم میں اچھے نہیں رہتے اور ان کی قابلیت وصلاحیت محدود ہوتی ہے بڑی غلطی ہے) اس تصور کی وجہ مدرسین اور والدین کو ایک عذر مل جاتا ہے اور وہ اپنی غلطیوں سے خود کو بری کرلیتے اور بچوں کی تعلیم اور ترقی کی کوششوں میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں۔ وہ (یعنی مدرسین اور والدین) خود کو ذمہ داری سے آزاد کرلینا چاہتے ہیں۔ اس چیز کی سخت مخالفت کی جانی چاہیئے۔ اگر کوئی مدرس بچوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو توارثی کہہ کر خود کو ذمہ داری سے بری کرلینا چاہتا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے پیشے میں کس طرح کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معلم یہ سمجھ جائے کہ خود اس کے طرز تعلیم اور اطوار کا اثر بچوں پر پڑتا ہے تو پھر 'توارثی حدود' یا 'توارثی خامیوں' کا تصور پیش کرکے خود کو ذمہ داری سے بری کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔

توارث جسمانی

میں یہاں توارث جسمانی کا ذکر نہیں کررہا ہوں اس لئے کہ بچوں کے اعضاء جسمانی میں توارث کا اثر پایا جانا مانی ہوئی بات ہے اور انفرادی نفسیات میں بھی اس نظریہ کو اہمیت دی گئی ہے کہ بچوں کی توارثی جسمانی خرابیوں کا ان کی نفسیاتی نشو ونما پر برا اثر پڑتا ہے۔

بچوں کے اعضاء کی خرابی ان کی ترقی میں مانع نہیں ہوتی۔

بچہ اپنے اعضاء کی حالت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اگر ان میں کوئی خرابی ہو تو اسی کو تعلیم میں ترقی نہ کرنے اور پیچھے رہنے کا سبب قرار دے لیتا ہے لیکن

واقعہ یہ ہے کہ بچے کے کسی عضو کی خرابی اس کی دماغی اور نفسیاتی نشو و نما میں حائل اور مانع نہیں ہوتی بلکہ بچے کا اس خرابی کے متعلق تصور اس کی تعلیمی خرابی اور نفسیاتی پستی کا باعث ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی بچہ جسمانی کمزوری یا خرابی رکھتا ہو تو یہ بات اس کے خوب ذہن نشین کر دینا ضروری ہے کہ اس کی جسمانی خرابی کا اس کی عقل و فہم یا اس کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے گا اگر وہ ایسا خیال رکھتا ہے تو اسے اپنے دل سے دور کر دے۔

ہم نے سابقہ فصل میں بتا دیا ہے کہ جسمانی کمزوری یا خرابی کوششوں اور کامیابیوں کے لئے بطور محرک ثابت ہو سکتی ہے یا آیندہ کی نشو و نما کے لیے اسے ایک رکاوٹ تصور کر لیا جا سکتا ہے۔ اگر اسے رکاوٹ تصور کر لیا جائے گا تو یقیناً اس کا برا اثر نشو و نما پر پڑے گا۔

جب میں نے یہ نظریہ اور نتیجہ پیش کیا تو ابتداءً بعض لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا اور کہا کہ میرا یہ نظریہ سائینٹفک نہیں ہے اور یہ کہ میں اپنے ذاتی خیالات پیش کر رہا ہوں جنہیں حقایق سے کوئی تعلق نہیں۔ میں محض اپنے تجربوں کی بناء پر اس نتیجہ پر پہونچا تھا اور اس کی صحت اس شہادت سے ثابت ہو رہی تھی جو بتدریج جمع ہوتی جا رہی تھی۔ اب امراض دماغی کے متعدد معالج اور ماہرین نفسیات اس نظریے کو ماننے لگے اور سمجھنے لگے ہیں کہ انسان کے عادات و اطوار میں توارث کا عمل دخل ہونے کا عقیدہ صرف ایک وہم ہے۔ یہ ایسا وہم ہے جو کئی ہزار سال سے چلا آ رہا ہے۔ جب کبھی لوگ خود کو ذمہ داری سے بری کر لینا چاہتے اور انسان کے چال چلن کے متعلق تقدیری نظریہ رکھتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ توارثی اثرات ہیں۔ اس خیال یا عقیدے کے سیدھے سادے معنی یہ ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اچھا یا برا ہوتا ہے۔ اور یہ ایک مہمل بات ہے اور اس کو صرف وہی لوگ درست مان سکتے ہیں جو اپنی ذمہ داری کا مطلق احساس نہیں رکھتے۔ 'اچھا' اور 'برا' مثل اور اخلاقی اصطلاحات کے صرف سماجی سیاق میں سمجھ میں آ سکتے ہیں اور 'اچھا ہونا'

اچھا اور برا ہونا

یا بُرا ہونا، نتیجہ ہوتا ہے اس تربیت کا جو انسان سماجی ماحول میں دوسرے انسانوں کے ساتھ رہکر حاصل کرتا ہے۔ اب اگر اس تربیت کے بعد انسان دوسروں کو فائدہ پہونچاتا ہے تو وہ "اچھا" سمجھا جاتا ہے اور اگر دوسروں کے لئے باعث زحمت و تکلیف ہوتا ہے تو "برا" کہا جاتا ہے۔

بچے کو پیدائش کے قبل سماجی ماحول نصیب نہیں ہوتا۔ بچہ پیدائش کے وقت اپنے میں ایسی چھپی ہوئی قوتیں لے کر آتا ہے کہ جو اس کو یا تو نیکی کے راستے پر لگا دیتی ہیں یا بُرائی کی طرف لے جاسکتی ہیں۔ اب یہ کہ وہ کونسا راستہ اختیار کریگا (نیکی کا یا برائی اور بدی کا) اس کا انحصار ان تاثرات اور احساسات پر ہوتا ہے جو بچہ اپنے ماحول سے۔ اپنے جسم سے حاصل کرتا ہے اور جس طرح ان تاثرات اور احساسات کی اپنے لئے ترجمانی کرلیتا ہے۔ بچے کے 'اچھا' اور 'برا' ہونے کا مدار سب سے زیادہ اس کی تعلیم پر ہوتا ہے۔

نفسیاتی قوتوں کی توارثی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے اگرچہ اس کے متعلق شہادت صاف اور واضح نہیں ہے۔ انسان کی نفسیاتی قوتوں کی نشو و نما کا زیادہ تر انحصار "دلچسپی" پر ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی اوپر بتا دیا ہے کہ "دلچسپی" کس طرح توارث کی وجہ سے نہیں بلکہ عدم ترغیب و تحریص اور ناکامی کے خیال سے مدھم پڑ جاتی ہے۔

دماغ نفس کا آلہ ہے منبع نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ دماغ کی ساخت پر ایک حد تک توارث کا اثر پڑتا ہے لیکن دماغ نفس کا آلہ ہے نہ کہ نفس کا منبع ہے۔

اگر کسی شخص کی دماغی خرابی اتنی شدید نہ ہو کہ جس کا ہم اپنے موجودہ معلومات کی بنا پر علاج نہ کرسکیں تو پھر ہم اس کے دماغ کی اس طرح تربیت کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی خرابی کا اچھا بدل پیدا کرلے۔

اعلیٰ قابلیت کو توارث سے تعلق نہیں

اعلیٰ قابلیت کسی کو بھی غیر معمولی توارث کی وجہ حاصل نہیں ہوتی بلکہ شوق۔ دلچسپی اور تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ان خاندانوں کے متعلق جن میں سے ایک ہی پشت میں غیر معمولی قابلیت رکھنے والے متعدد افراد پیدا ہو گئے ہوں ہمیں یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس میں توارث کا عمل دخل ہے بلکہ ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ فیاملی کے کسی ایک رکن کی غیر معمولی کامیابی دوسروں کے لئے باعث ترغیب و تحریک ہوئی اور خاندانی روایات نے بچوں کو اس قابل کیا کہ انھوں نے اپنی دلچسپیوں کو جاری رکھا اور مشق اور کوشش کے ذریعہ ان دلچسپیوں سے اچھا فائدہ اٹھایا مثلاً لیبگ مشہور کیمیادان ایک بڑے عطار (دوا فروش) کا بیٹا تھا۔ اس سے ہمیں یہ تصور کر لینے کی ضرورت نہیں کہ لیبگ کی علم کیمیا میں غیر معمولی قابلیت اسے باپ سے بطور ورثہ ملی۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ماحول نے اس کے شوق اور اس کی دلچسپی کو بڑھایا اور کم عمری میں جب کہ دوسرے بچے علم کیمیا مطلق نہیں جانتے اس نے اس علم کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لئے۔

موزارٹ کے والدین موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن موزارٹ کا موسیقی میں کمال حاصل کرنا توارثی نہ تھا۔ اس کے والدین نے اس میں موسیقی سے دلچسپی پیدا کر دی اور اس فن کے حاصل کرنے میں اس کی ہر طرح سے مدد کی۔ بچپن سے اس کا ماحول گانے بجانے کا رہا۔

نامور افراد کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں ان کی اٹھان اچھی ہوئی مثلاً بعض چار سال کی عمر سے پیانو بجاتے تھے بعض بالکل کمسنی میں اپنے گھر والوں کے لئے قصے کہانیاں لکھتے تھے۔ ان کا شوق ان کی دلچسپی مستقل اور مسلسل ہوتی تھی اور یہ لوگ بلا جبر خود مشق اور محنت کرتے تھے انہوں نے ہمت سے کام لیا۔ پست ہمتی کو نزدیک نہ آنے دیا اور بڑے آدمی ہوئے۔

ترقی کے خلاف حدود اڈلر کا تجربہ

بچہ اپنی نشوونما اور ترقی کے خلاف جو حدود قائم کر لیتا ہے انھیں وہ مدرس توڑ نہیں سکتا اور مٹا نہیں سکتا جس کا ایقان یہ ہوا کہ نشوونما اور ترقی کے مقررہ حدود ہوتے ہیں۔ اگر

کوئی مدرس کسی بچے کو (جو ریاضی میں کمزور ہو) کہہ دے کہ "تم میں ریاضی سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے" تو ایسا کہہ کر وہ تو ایک حد تک (اپنی ذمہ داری سے) اپنی گلوخلاصی کرلے گا لیکن ساتھ ہی بچے کو پست ہمت کر دیگا۔ مجھے خود اس کا ذاتی تجربہ ہوچکا ہے۔ میں چند سال تک اپنے مدرسے کی جماعتوں میں ریاضی میں کودن رہا اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ریاضی سے مجھے فطری لگاؤ نہیں ہے۔ اتفاقاً ایک روز جماعت میں میں نے ریاضی کا ایک ایسا سوال صحیح حل کر دیا جس سے خود مدرس پریشان تھا اور وہ اس سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کامیابی نے ریاضی کے متعلق میرا خیال ہی بالکل بدل دیا۔ اس واقعہ سے قبل اس مضمون سے مجھے بہت کم دلچسپی تھی۔ اور (جو کچھ تھی وہ) بھی بتدریج کم ہوتی جارہی تھی لیکن اس واقعہ (یا کامیابی) کے بعد مجھے لطف آنے لگا اور بڑے شوق و ذوق کے ساتھ میں اس مضمون میں اپنی قابلیت بڑھانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے کے بہترین ریاضی دانوں میں میرا شمار ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تجربے نے مجھے بتا دیا کہ کسی چیز کے لئے خاص صلاحیت رکھنے یا پیدائشی یا فطری لگاؤ کے نظریے غلط ہیں۔

مدرسے کی جماعتوں میں تعداد طلبہ زیادہ ہونا مناسب نہیں۔

ان جماعتوں میں بھی جہاں تعداد طلبہ ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے ہم بچوں کو قابو میں رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان کے عادات و اطوار اور چال چلن سے واقف ہو جائیں بہت بڑی جماعتیں (یعنی جن میں طلبہ ضرورت سے زیادہ ہوں) بلاشک دشواریاں پیش کرتی ہیں۔ ان جماعتوں میں بعض بچوں کی مشکلات پوشیدہ رہ جاتی ہیں اور صحیح طور پر ان کا حل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مدرس کو چاہئے کہ اپنے شاگردوں سے بخوبی واقف ہو جائے ورنہ وہ ان میں باہمی دلچسپی اور تعاون قائم نہ کر سکے گا۔

ایک ہی مدرس کئی سال بچوں کو پڑھائے تو اچھا ہے

میرے خیال میں اگر ایک ہی مدرس کئی سال تک بچوں کو پڑھاتا رہے

تو زیادہ مفید ہوگا۔ بعض مدرسوں میں تقریباً ہر چھ مہینے کو مدرس بدل دیا جاتا ہے۔ کسی ایک مدرس کو بھی موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ بچوں کے ساتھ کافی مدت تک رہے ان کے مسائل معلوم کرے اور ان کی ترقی وغیرہ پر غور کرے۔ اگر ایک مدرس تین یا چار سال ایک ہی گروہ (یعنی بچوں کے گروہ) کے ساتھ رہے تو بچوں کی 'طرز زندگی' کی غلطیاں آسانی سے معلوم کر لے سکتا ان کی اصلاح کر دے سکتا اور آسانی سے جماعت کو ایک اتحادی اور سماجی گروہ بنا دیتا ہے۔

طلبہ کی ترقی کا مسئلہ

ایک جماعت سے دوسری جماعت میں جلدی سے ترقی پانا اکثر دفعہ بچے کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ عام طور پر بچے سے ایسی امیدیں وابستہ کر دی جاتی ہیں جنہیں وہ پورا نہیں کر سکتا۔ بچے کو قبل از وقت ایک جماعت سے دوسری اوپر کی جماعت میں اسی وقت ترقی دی جانی چاہیئے جب کہ وہ اپنی جماعت کے لئے زیادہ عمر کا تصور کیا جائے یا جماعت کے دوسرے بچوں کے بہ نسبت تیزی سے ترقی کر رہا ہو۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا جماعت ایک اکائی ہونی چاہیئے۔ اگر جماعت ایک اکائی ہوگی تو اس کے ایک فرد کی کامیابیاں دوسروں کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ کسی جماعت میں چند ذہین بچے ہوں تو پوری جماعت تیزی کے ساتھ ترقی کرتی ہے اب اگر ان چند ذہین بچوں کو جلد ترقی دے دی جائے تو دوسرے بچوں سے ناانصافی ہو جاتی ہے اس لئے وہ ایک محرک سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میری رائے میں ذہین بچے کو جلد ترقی دینے کے عوض جماعت میں رکھ کر روزانہ معمولی کام کے علاوہ اور دوسرے مشاغل مثلاً ڈرائنگ وغیرہ دے دینا چاہیئے۔ ان مشاغل میں بھی ذہین بچے کی کامیابی دوسروں کی دلچسپیوں میں اضافہ کرے گی اور آگے بڑھنے کے لئے ان کے دل بڑھائے گی۔

اس سے زیادہ بدقسمتی بچوں کا کئی سال ایک ہی جماعت میں پڑا رہنا ہے۔ ہر مدرس اس بات سے اتفاق کرے گا کہ وہ بچے جو ایک ہی جماعت میں پڑے رہتے

ہیں مدرسے اور گھر والوں کے لئے ایک مشکل مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اگر گنتی کے چند بچے جماعتوں میں روکے جائیں تو مدرسے کے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔ ان طلبہ میں سے جو ترقی نہیں کرتے اور ایک ہی جماعت میں پڑے رہتے ہیں زیادہ تر ہیڈی اور مسئلی بچے ہو جاتے ہیں۔ ان بچوں کے ہم مکتب ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور خود یہ بچے اپنی صلاحیتوں کے متعلق قنوطی نظریہ رکھتے ہیں (یعنی سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے)

یہ ایک نہایت مشکل مسئلہ ہے اور ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کے مدنظر (بعض صورتوں میں) بچوں کو جماعتوں میں روکنے کے بغیر ہمارے لئے اور کوئی چارا نہیں بعض مدرسین نے بچوں کو اسی جماعت میں رکے رہنے سے اس طرح بچا لیا کہ انھوں نے تعطیلات میں بچوں کو تربیت دی اور انھیں ان کی طرز زندگی کی غلطیاں بتا دیں۔ جب بچے اپنی غلطیاں مان لیتے ہیں تو پھر اوپر کی جماعت میں ترقی پانے کے بعد کامیاب رہتے ہیں۔ بلا شک یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم ہیڈی بچے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ بچے نے اپنی صلاحیتوں کے متعلق جو غلط اندازہ کر لیا ہے اسے ہم بتا دیں اور اسے پوری آزادی دیں کہ وہ اپنی کوششوں سے (اپنی اصلاح کر لے) اور ترقی کرے۔

جن مدرسوں میں بچوں کی تقسیم ذہانت اور کند ذہنی کے لحاظ سے کی گئی ہے اور ان کو مختلف جماعتوں میں رکھا گیا ہے وہاں میں نے ایک خاص بات دیکھی وہ یہ کہ کند ذہن بچوں میں اکثر کمزور دماغ کے اور مفلسوں کے بچے ہوتے اور ذہین بچوں کا طبقہ تقریباً سب مالداروں کے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ میں یورپ کے مدارس کے تجربے کی بنا پر یہ کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ امریکا کے متعلق بھی میرا یہ خیال صحیح ہوگا یا نہیں۔ جو صورت حال بیان کی گئی بالکل واضح ہے اور سمجھ میں آجاتی ہے۔ نادار گھرانوں میں بچوں کو زندگی کے لئے عمدگی سے تیار نہیں کیا جاتا۔ والدین متعدد مشکلات سے گھرے رہتے ہیں انھیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ بچوں کی

تربیت کریں اور پھر خود اس قدر تعلیم یافتہ نہیں ہوتے کہ بچوں کی مدد کر سکیں۔

میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ جو بچے مدرسہ کے لئے اچھی طرح تیار نہیں کئے گئے انھیں خواہ مخواہ کند ذہنوں کی جماعت میں ڈال دینا چاہئے۔ ایک اچھا ٹرینڈ مدرس جانتا ہے کہ ان بچوں کی جو مدرسے کے لئے (گھر میں) تیار نہیں کئے گئے کمزوریوں کی کس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے اور یہ بچے خود اپنے ان ساتھیوں کی جو اچھی تیاری کے بعد مدرسے میں شریک ہوئے ہوں صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ اب اگر ایسے بچوں کو (یعنی ان بچوں کو جو بلا تیاری مدرسہ آئے ہوں) کند ذہن بچوں کی جماعت میں شریک کیا جاتا ہے تو بچے اس چیز کو محسوس کرتے ہیں اور مدرسے کے ذہین بچے اس صورت حال سے واقف ہو کر ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ چیز بچوں میں پست حوصلگی اور ان میں برتری حاصل کرنے کا خیال پیدا کرنے کے لئے ایک زرخیز زمین ہو جاتی ہے۔

مخلوط تعلیم

اصولاً تو مخلوط تعلیم کی تائید کی جانی چاہئے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو ایک دوسرے سے واقف کرانے اور ایک جنس والوں کو دوسری جنس والوں سے تعاون کرنے کا عادی کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر بھی وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مخلوط تعلیم سے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مخلوط تعلیم کا مسئلہ بجائے خود بہت پیچیدہ ہے اور جب تک اس کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھ کر ان سے اچھی طرح نمٹ نہ لیا جائے یہ دونوں جنس کے افراد (یعنی لڑکے اور لڑکیوں) کو نزدیک کرنے کے بجائے دور تر کر دیتی ہیں۔ مثلاً منجملہ اور مشکلات کے ایک یہ ہے کہ سولہ سال کی عمر تک لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ تیزی سے ترقی کرتی ہیں۔ اب اگر لڑکے اس راز سے واقف نہ ہوں تو وہ اپنی خود داری کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ لڑکیاں ان سے آگے بڑھ گئی ہیں تو پست ہمت ہو جاتے ہیں اور پھر آئندہ زندگی میں بھی عورتوں سے مقابلہ کرنے ڈرتے ہیں۔ بچپن کی شکست انھیں یاد رہتی ہے۔

ایک مدرس جو مخلوط تعلیم میں عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے مسائل اور مشکلات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس کے ذریعہ سے بہت کچھ کارنمایاں انجام دے سکتا ہے لیکن اگر وہ مخلوط تعلیم کو پوری طور سے پسند نہیں کرتا اور اس سے کافی دلچسپی نہیں رکھتا تو پھر وہ بری طرح سے ناکامیاب ہوگا۔

دوسری مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ اگر لڑکے اور لڑکیوں کی تربیت اچھی نہ ہوئی ہو اور ان پر کافی نگرانی نہ رکھی جائے تو یقیناً جنسی پیچیدگیاں رونما ہو جاتی ہیں۔

جنسی تعلیم

مدارس میں جنسی تعلیم دینے کا مسئلہ بہت ہی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ جنسی تعلیم کے لئے مدرسے کی جماعت موزوں مقام نہیں ہے۔ اگر مدرس پوری جماعت کو جنسی باتیں بیان کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ جماعت کا ہر ایک بچہ اس کی گفتگو اور بیان سے صحیح نتیجہ برآمد کر رہا ہے پس (اندیشہ ہے) کہ مدرس بغیر اس چیز کے علم کے کہ طلبہ جنسی باتوں کے سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں اور انھیں اپنی 'طرز زندگی' کے لحاظ سے کس طرح اختیار کریں گے طلبہ میں جنسی امور سے دلچسپی پیدا کر دے گا۔ البتہ اگر کوئی بچہ جنسی امور کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہئے اور مدرس سے تنہائی میں سوالات کرے تو مدرس کو چاہئے کہ بچے کو صحیح اور سیدھے سادے جوابات دے۔ اس صورت میں مدرس کو اس بات کے جانچنے کا موقع ملتا ہے کہ بچہ کیا معلوم کرنا چاہتا اور وہ بچے کو مناسب معلومات بہم پہونچا کر صحیح نتیجہ نکالنے کے راستے پر لگا دے سکتا ہے۔ جماعت میں جنس کے متعلق ہمیشہ گفتگو کرنا نقصان دہ ہوتا ہے اس سے بعض بچے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر یاد رہے کہ جنسی امور کو معمولی اور غیر اہم تصور کرنا مفید نہیں ہوتا۔

ایک ٹرینڈ مدرس بچوں کی طرز زندگی سے آسانی کے ساتھ واقف ہو سکتا ہے

اس شخص کے لئے جس نے بچوں کو سمجھنے کی اچھی تربیت پائی ہو (یعنی ٹرینڈ ہوا ہو) بچوں کی 'طرز زندگی' کے مختلف اقسام

معلوم کر لینا آسان ہے۔ کسی بچے کی صلاحیت تعاون اس کے اٹھنے بیٹھنے۔ دیکھنے اور سننے کے طور اور طریقوں۔ اس کے دوسرے بچوں سے دوستی کرنے کی قابلیت اور اس کی قوت توجہ وغیرہ سے معلوم کر لی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی بچہ اپنا ہوم ورک کرنا بھول جاتا ہو یا کتابیں کھو دیا کرتا ہو تو ہم سمجھ لیں کہ اس کو اپنے کام (یعنی تعلیم) سے دلچسپی نہیں ہے اور ہم بچے کی اس عدم دلچسپی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر بچہ مدرسے کے کھیلوں میں دوسرے بچوں کے ساتھ حصہ نہ لیتا ہو تو ہم سمجھ جائیں کہ وہ تنہائی پسند کرتا ہے اور صرف اپنی ذات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر بچہ اپنے کام کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد کا طالب ہو تو اس سے ہم پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ آزاد طبیعت اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے والا نہیں ہے بلکہ دوسروں کی مدد کا خواہشمند اور محتاج ہے۔ اس قسم کے بچے جب ہی کچھ کام کرتے ہیں جب کہ ان کی تعریف کی جاتی اور ان کا دل بڑھایا جاتا ہے۔ اکثر لاڈلے بچے مدرسے میں اسی وقت تک کامیابی کے ساتھ کام انجام دیتے ہیں جب تک کہ مدرسین ان کی طرف خاص طور پر توجہ کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی مدرسین کی توجہ ہٹ جاتی ہے ان کی مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی دیکھنے اور تعریف کرنے والا نہ ہو تو یہ کچھ کام کر ہی نہیں سکتے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں کے لئے ریاضی مشکلات پیش کرتی ہے۔ جب ان بچوں کو کہا جاتا ہے کہ چند قواعد یا جملے رٹ لیں تو یہ کام عمدگی سے انجام دیتے ہیں لیکن جب انھیں کوئی ریاضی کا سوال حل کرنا پڑتا ہے تو یہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ایک معمولی نقص معلوم ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ وہ بچہ جو ہمیشہ دوسروں کی مدد اور توجہ کا طالب رہتا ہے وہ ہماری سوسائٹی کے لئے بیحد خطرناک ہوتا ہے۔ جب کبھی اس پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے کہ دوسرے اُس سے مشکل کو دور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ زندہ تو رہتا ہے لیکن دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں کرتا بلکہ اس کا وجود دوسروں کے لئے بارِ گراں ہو جاتا ہے۔

بعض بچے توجہ کا مرکز بننا چاہتے ہیں۔

ایک قسم بچے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس قسم کے بچے مرکز توجہ بننا چاہتے ہیں۔ جب ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا تو شرارت کرکے پوری جماعت کو پریشان کرکے دوسرے بچوں کو بگاڑ کر اور ہر ایک کے لئے وبال جان ہو کر مرکز توجہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ سخت سست کہنے۔ سزا دینے سے ان کی حالت بدلتی نہیں اور اپنی حرکات سے وہ لطف اٹھانے لگتے ہیں۔ وہ مار کھانے اور پٹنے کو نظر انداز کر دیئے جانے پر ترجیح دیتے ہیں۔ بری حرکات پر سزا پانے سے جو انھیں تکلیف ہوتی ہے اِسکو یہ اپنی آنے والی مسرت (یعنی مرکز توجہ بننا) کی قیمت سمجھتے ہیں۔

سزا

اکثر بچے سزا دینے سے ڈھیٹ ہو جاتے اور ضد سے اپنی طرز زندگی پر قائم رہتے ہیں۔ سزا کو وہ اپنے اور سزا دینے والوں کے درمیان ایک مقابلہ قرار دے لیتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ آخر میں کون بازی لے جاتا ہے اور اکثر وہی جیت لیتے ہیں۔ پس وہ بچے جو والدین یا مدرسین سے مقابلہ کرنے اور لڑنے کے عادی ہو گئے ہوں خود کو ایسی تربیت دے لیتے ہیں کہ جب انھیں سزا دی جائے تو رونے کے عوض ہنسیں۔

ایک کاہل اور سست بچے نے اگر کاہلی اور سستی صرف والدین کو دق کرنے کے لئے اختیار کی ہو تو بالعموم ایک امنگ بھرا بچہ ہوتا ہے جو ناکامی اور شکست سے ڈرتا ہے۔

کامیابی

کامیابی ایک ایسا لفظ ہے کہ جس کے ہر شخص ایک جدا معنی سمجھتا ہے۔ شکست اور ناکامی کے متعلق بچوں کا جو تصور ہے وہ تعجب خیز ہے۔ اکثر افراد ایسے ہوتے ہیں جو اگر سب سے اول نہ ہو جائیں تو خود کو شکست یافتہ تصور کرتے ہیں۔ اگر وہ کامیاب بھی ہوئے ہوں تو اگر کوئی اور ان سے بہتر ہے تو اپنی کامیابی کو شکست اور ناکامی ہی سمجھتے ہیں۔

کاہل بچہ

ایک کاہل بچہ کبھی شکست کا مزا ہی نہیں چکھتا اس لئے کہ وہ خود کو کبھی

معرض امتحان و آزمائش میں نہیں ڈالتا وہ اس مسئلہ کو ہی اپنے نزدیک نہیں آنے دیتا کہ اسے دوسروں سے مقابلہ کرنا چاہیئے اگر ایسا موقع آ بھی جائے تو اسے ٹال دیتا ہے دوسرے لوگ اسے کہتے رہتے ہیں کہ اگر تم کاہلی چھوڑ دو گے تو ہمیں یقین ہے کہ تم اپنی مشکلات پر قابو پا لوگے۔ (یہ چیز اس کے ذہن نشین ہو جاتی ہے) اور خود بھی یہی سمجھنے اور کہنے لگتا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو سب کچھ کر سکتا ہوں جب کبھی وہ ناکام ہوتا ہے تو اس ناکامی کی اہمیت کو گھٹاتا اپنی خود پسندی پر قائم رہتا اور شیخی کرتا ہے کہ اس کی کاہلی ناکامی کا باعث ہوئی نہ کہ نااہلی۔

بعض دفعہ ایک کاہل بچے کو مدرسین کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم محنت کرو تو تم جماعت میں سب سے زیادہ طباع اور ممتاز ہو سکتے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے جب بغیر محنت کرنے کے وہ طباع مشہور ہے تو پھر کیوں محنت کر کے اس شہرت کو کھو بیٹھے؟ ممکن ہے کہ اگر وہ کاہلی چھوڑ دے تو اس کی طباعی کی شہرت جاتی رہے۔ اگر وہ محنت کرنے لگے گا تو اب اس کے کمالات کے مطابق اس کے متعلق رائے قائم کی جائے گی نہ کہ اس کی سابقہ شہرت کی بناء پر۔

کاہل اور لاپروا بچہ ایک اور سہولت رکھتا ہے وہ یہ کہ جب کبھی وہ تھوڑا بھی کام کر لیتا ہے تو اس کی تعریف کر دی جاتی ہے۔ اس کی تھوڑی کوشش بھی (مدرسین اور والدین کے لئے) امید افزا ہوتی ہے اور یہ اس کو لڑکے کا ایک اصلاحی اقدام سمجھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں حالانکہ اگر اتنی ہی کوشش اور وہی کام اگر کوئی محنتی بچہ کرتا تو اس پر کوئی توجہ بھی نہ کرتا۔ الحاصل کاہل بچہ دوسروں سے امیدیں باندھے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ بھی ایک لاڈ سے بگڑا ہوا بچہ ہوتا ہے جو بچپن سے دوسروں کی کوششوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کا خود کو عادی کر لیتا ہے۔

لیڈر

ایک اور قسم کا بچہ جو ہمیشہ پایا جاتا اور آسانی سے پہچان لیا جا سکتا ہے وہ ہے جو اپنے ہم عمر بچوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔ نوع انسان کے لئے

قائدین کی شدید ضرورت ہے لیکن یہ ایسے افراد ہوں جو دوسروں کے فائدہ کے لئے قیادت اختیار کریں اور ایسے قائدین شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ وہ بچے جو لیڈر بن جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف ان مواقف اور مواقع پر دوسرے بچوں سے تعاون کرتے ہیں جہاں انھیں ان دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے اور حکومت کرنے کا موقع ملے۔ اس قسم کے بچوں کا مستقبل کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ انھیں آیندہ زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی محفل میں شادی کے ذریعہ یا کسی دھندے میں جب اس قسم کے دو افراد جمع ہو جائیں تو پھر خوب تماشا نظر آجاتا ہے (یعنی جب دو ایسے افراد جن میں کا ہر ایک خود کو لیڈر سمجھتا ہو کسی محفل میں ہوں یا میاں بیوی ہو جائیں یا کسی کاروبار میں شریک ہوں تو ان میں ایسی کشمکش ہو جاتی ہے کہ یہ دوسروں کے لئے تماشہ بن جاتے ہیں)۔ ان میں کا ہر فرد چاہتا ہے کہ دوسرے پر تسلط حاصل کرے اور اس سے اپنی برتری منوالے

گھر کے بڑے بوڑھوں کو نہ چاہیے کہ بچوں کو اپنے پر حکومت کرنے دیں

بعض اوقات گھر کے بڑے بوڑھے لاڈلے بچے کا ان پر حکومت کرنا اور جیسا چاہے انھیں نچانا پسند کرتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ بچے کی ان حرکات پر ہنستے اور اس کا دل بڑھاتے ہیں۔ مدرسین واقف ہیں کہ اس طریقے سے بچے کے اخلاق درست نہیں ہوتے جو سماجی زندگی کے لئے ضروری ہے۔

بچوں کی اصلاح بچپن میں کر دی جائے۔

غرض بچے مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور یہاں ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کو علحدہ گروہ اور اقسام میں تقسیم کر کے بتائیں۔ لیکن ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ بچوں کو ان تمام حرکات سے روکنا چاہئے جو آیندہ ان کے لئے مشکلات پیدا کریں یا ان کی زندگی کو ناکامیاب کر دیں۔ یہ حرکات ایسی ہوتی ہیں جن سے بچپن ہی میں بچوں کو روکا جا سکتا اور اصلاح کر دی جا سکتی۔ اگر بچوں کی شروع ہی میں اصلاح نہ کی جائے تو پھر جوانی میں انھیں بری طرح خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بچوں کی بچپن کی غلطیوں اور جوانی کی ناکامیوں کا

راست تعلق ہوتا ہے۔ وہ بچہ جو بچپن ہی سے 'تعاون' کا عادی نہ ہو وہ بڑا ہو کر خلل اعصاب کا مریض، نشہ باز اور مجرم ہو جاتا یا خودکشی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچپن میں اندھیرے سے ڈرنے والے بچے پریشان خیال نوجوان ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ روتا رہنے والا یعنی رونی صورت بچہ خفقانی ہو جاتا ہے۔

والدین

ہمارے سماج کی موجودہ حالت کے لحاظ کرتے ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم سب والدین تک رسائی حاصل کریں اور انھیں ان کی غلطیاں بتائیں۔ والدین جو کبھی رائے مشورہ نہیں لیتے وہی سب سے زیادہ مشورے کے محتاج ہوتے ہیں۔

مشاورتی کونسل

البتہ ہم مدرسین سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعے بچوں تک ہماری رسائی ہو سکتی ہے اور ہم بچوں کی اصلاح کر سکتے اور انھیں آزادانہ، بہادرانہ اور اتحادی زندگی بسر کرنے کی تربیت دے سکتے ہیں اور ہمارے خیال میں یہی نوع انسان کی آیندہ فلاح اور بہتری کا راز ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے پندرہ سال قبل میں نے انفرادی نفسیات کی مجالس شوریٰ قایم کیں جو ویانا اور یورپ کے دوسرے شہروں میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔

اعلیٰ خیالات اور بڑی امیدیں رکھنا اچھی چیز ہے لیکن اگر ان کو عمل میں لانے کے لئے کوئی طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو پھر یہ سب بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ پندرہ سال کے تجربے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ مشاورتی کونسلیں بے حد کامیاب ہوئیں اور بچوں کی مشکلات حل کرنے اور انھیں ذمہ دار انسان بنانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ مشاورتی کونسلیں (مجالس شوریٰ) اسی وقت پوری طور پر کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ ان کی بنیاد انفرادی نفسیات کے اصول پر رکھی جائے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ اگر دوسرے مکاتب نفسیات سے تعاون کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ دوسرے مکاتب نفسیات کے ماننے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ مجالس شوریٰ قائم کریں تاکہ ہر مکتب کے معلوم کردہ نتائج دیکھنے اور مقابلہ کرنے کا ہمیں موقع ملے۔

مجلس شوریٰ کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ایک ماہر نفسیات جو مدرسین بچوں اور والدین کی مشکلات کا بخوبی تجربہ رکھتا ہے مدرسے کے مدرسین سے ملتا ہے اور ان کے مدرسے میں جو مسائل اور مشکلات درپیش ہوئے ہوں ان کے متعلق ان سے گفتگو کرتا ہے پھر جب یہ ماہر مدرسے کا معائنہ کرتا ہے تو کوئی نہ کوئی مدرس کسی مسئلی بچے کا معاملہ اس کے پاس پیش کرتا ہے مثلاً مدرس بیان کرتا ہے کہ لڑکا سست اور کاہل ہے یا جھگڑالو ہے یا شریر ہے یا چوری کرنے کا عادی ہے یا یہ کہ تعلیم میں پیچھے رہتا ہے وغیرہ۔ ماہر بچے کے متعلق مدرس سے گفتگو کرتا اور اپنے تجربے اس کو بتاتا ہے بچے کی گھر کی زندگی۔ اس کے عادات و اطوار۔ اس کی نشو و نما کے متعلق حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ جن حالات کی وجہ مشکلات پیدا ہوئے ہوں کہہ دیئے جاتے ہیں۔ پھر ماہر اور مدرس دونوں مل کر ان اسباب کے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوئیں اور غور کرتے ہیں کہ ان اسباب کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے چونکہ دونوں تجربہ کار ہوتے ہیں اس لئے کسی اچھے نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں۔

جس روز ماہر نفسیات مدرسے کو آتا ہے بچے کے ساتھ اس کی ماں کو بھی بلالیا جاتا ہے۔ جب مدرس اور ماہر تصفیہ کر لیتے ہیں کہ ماں سے کس طرح گفتگو کرنا اور اس کو بچے کی مشکلات سمجھا دینا چاہیئے تو تب ماں کو بلا لیتے ہیں۔ ماں (بچے کے متعلق) مزید معلومات بہم پہونچاتی ہے اور پھر ماں اور ماہر نفسیات کے درمیان بحث ہوتی ہے۔ اور ماہر بتاتا ہے کہ بچے کی مدد کرنے کے لئے کیا طریقہ عمل مناسب ہوگا۔ عام طور پر ماں اس قسم کے مشوروں سے خوش ہوتی اور ماہر نفسیات سے پورا تعاون کرتی ہے۔ اگر ماں مخالف ہے (یعنی دل کھول کر گفتگو نہیں کرتی) تو ماہر نفسیات یا مدرسین اس کے سامنے دوسرے اسی قسم کے بچوں کے واقعات بیان کرتے ہیں کہ ان کی مشکلات کیا تھیں کیوں کر پیدا ہوئیں اور انھیں کس طرح دور کیا گیا۔ ماں اس سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اپنے بچے کی اصلاح کرتی ہے۔

اب خود بچے کو کمرے میں طلب کیا جاتا ہے اور ماہر نفسیات اس سے باتیں کرتا ہے لیکن بچے کی غلطیوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کی مشکلات کا ذکر کرتا ہے۔ ماہر خود بچے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے خیال میں وہ کیوں تعلیم میں خاطر خواہ ترقی نہیں کر رہا ہے۔ کیا اس کے ذہن میں یہ بات تو نہیں بیٹھ گئی ہے کہ لوگ اس کو حقیر و ذلیل سمجھتے اور دوسروں کو اس پر ترجیح دیتے ہیں وغیرہ۔ ماہر نفسیات بچے کو ملامت نہیں کرتا بلکہ اس سے دوستانہ گفتگو کرتا ہے جس سے اسے بچے کا نصب العین معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ بچے کی غلطی کہہ دینا چاہتا ہے تو فرضی مثال کے ذریعہ بیان کرتا اور اس کے متعلق خود بچے کی رائے طلب کرتا ہے۔ ایک ایسے شخص کو جو اس قسم کے کام کا تجربہ نہیں رکھتا یہ بات کہ بچے ان چیزوں کو کس خوبی سے سمجھ جاتے اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

وہ سب مدرسین جنہیں میں نے اس کام کی تربیت دی بیحد خوش ہیں اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑ دینے تیار نہیں۔ اس طریقہ کار سے مدرسے کا کام ان کے لئے بیحد دلچسپ ہو گیا اور ان کی کوششیں بارآور ہو رہی ہیں۔ کوئی مدرس بھی اس کام کو اپنے لئے بارگراں نہیں سمجھتا اس لئے کہ تھوڑی دیر کی محنت سے وہ ایک ایسی مشکل کو رفع کر لیتا ہے کہ جو پہلے اسے برسوں ستاتی اور دق کرتی تھی۔ اس طریقہ عمل سے پورے مدرسے میں 'تعاون' کی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور چند روز میں بہت سی بڑی مشکلات غائب ہو جاتیں اور معمولی چند غلطیاں باقی رہ جاتی ہیں جن کی آسانی سے اصلاح کر لی جاتی ہے۔

مدرسین خود ماہر نفسیات ہوں تو اچھا ہے

حقیقت میں مدرسین خود ماہر نفسیات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بہت جلد سمجھ جاتے ہیں کہ کسی بچے کی پوری شخصیت اور جو مظاہرے اس سے ہوتے ہیں ان میں کیا ربط اور تعلق ہے۔ اگر اوقات مدرسہ میں کوئی مشکل مسئلہ پیش ہو تو خود اس کو حل کر لیتے ہیں بیشک ہماری یہ توقع ہونی چاہیے کہ سب مدرسین ایسی تربیت پالیں کہ ماہرین نفسیات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

مثلاً کسی جماعت میں کسی مدرس کے زیر تعلیم کوئی سست و کاہل بچہ ہو تو مدرس جماعت میں تحریک پیش کرے کہ بچے کاہلی پر گفتگو کریں۔ مدرس خود گفتگو کی ابتدا کرے اور اس قسم کے سوالات پیش کرے کہ کاہلی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ کوئی کاہلی کیوں اختیار کرتا ہے؟ کاہل بچہ اپنی یہ بری عادت کیوں ترک نہیں کرتا؟ کس چیز کے چھوڑ دینے سے کاہلی رفع ہو سکتی ہے؟۔ بچے خوب بحث کریں گے اور نتائج برآمد کریں گے۔ کاہل بچے کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ حقیقت میں وہی اس گفتگو اور بحث کا باعث ہوا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اس کا مشکل مسئلہ ہے وہ اس میں خوب دلچسپی لے گا اور بحث سے بہت کچھ سیکھ لے گا۔ اس کاہل بچہ پر اگر راست حملہ کیا جائے (یعنی اس کو کاہل کہا جائے) تو وہ کچھ نہ سیکھے گا۔ مگر اس طرح انجان طور پر سن کر غور کر سکتا اور اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

بچوں کے دلوں کا حال مدرس سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا اس لئے کہ مدرس ان کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور ان کے ساتھ کام کرتا ہے۔ مدرس کو مختلف اقسام کے بچوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اگر وہ ماہر و مشاق ہے تو ایک قسم کے بچوں اور دوسری قسم والوں کا باہمی تعلق معلوم کر لیتا ہے۔ یہ بھی مدرس ہی پر منحصر ہوتا ہے کہ بچہ جو برائیاں گھر میں اختیار کرتا ہے انھیں مدرسے میں بھی جاری رہنے دے یا ان کی اصلاح کر دے۔ مثل ماں کے مدرس بھی بچے کی آئندہ زندگی کا محافظ ہے اور جو خدمت انجام دے سکتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

فصل آٹھویں

نوجوانی کا زمانہ

نوجوانی کے زمانے کے حالات کے متعلق اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ کتب خانے ان سے بھر جا سکتے ہیں اور ان سب کتابوں میں اس زمانے کے متعلق اس طرح بحث کی گئی ہے کہ گویا یہ انسان کے لئے ایک نہایت نازک اور خطرناک زمانہ ہے اور اس میں انسان کی پوری فطرت اور طبیعت بدل جاتی ہے۔

نوجوانی کے زمانے میں بھی انسان کی فطرت وہی ہوتی ہے جو پہلے تھی

نوجوانی کا زمانہ خطروں سے تو پُر ہوتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس میں انسان کی فطرت یا طبیعت بالکل بدل جاتی ہے۔ سن بلوغ بڑھتے ہوئے بچے کے لئے زندگی کے نئے مسائل اور نئی آزمائشیں پیدا کرتا ہے۔ بچہ محسوس کرتا ہے کہ اب وہ زندگی کی سرحد کے قریب ہو رہا ہے۔ بچے کی طرز زندگی کی غلطیاں جو اب تک چھپی ہوئی تھیں اب ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ غلطیاں پہلے بھی تھیں اور ایک مشاق آنکھ انھیں دیکھ سکتی تھی اب جوانی میں یہ اہمیت حاصل کر لیتی ہیں اور نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ تقریباً ہر بچے کے لئے جوانی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں پر ثابت کرے کہ وہ اب بچہ نہیں رہا۔

نوجوانوں کو سمجھانا چاہئے کہ اس زمانے کو اہمیت نہ دیں

ہمیں چاہئے کہ ہم نوجوان کو سمجھائیں کہ وہ اس زمانے کو زیادہ اہمیت نہ دیں بلکہ یہ فرض کر لے کہ یہ ایک معمولی اور فطری چیز ہے (کہ وہ بچے سے جوان ہو گیا)۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو نوجوان غیر ضروری الجھن سے بڑی حد تک محفوظ رہے گا۔ اگر نوجوان

ثابت کرنا چاہے گا کہ وہ اب بچہ نہیں رہا تو پھر اس واقعہ (یعنی بالغ ہونے) کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے گا۔ جوانی کے زمانے کے اکثر حرکات ایسی ہوتی ہیں کہ جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نوجوان لڑکا یا لڑکی اپنی آزادی۔ دوسرے بیانوں سے برابری اور اپنے پورے مرد یا عورت ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اب ان حرکات یا مظاہروں کی نوعیت کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ بچے نے "جوان ہونے" کے اپنے نزدیک کیا معنی قرار دے لئے ہیں۔ اگر بچے کے ذہن میں "جوان ہونے" کے معنی ہر قسم کی نگرانی۔ بندش اور روک ٹوک سے آزاد ہو جانا ہوں تو یہ بچہ پابندیوں اور قیود کی مخالفت کریگا۔ اس زمانے میں اکثر بچے تمباکو نوشی۔ گالیاں بکنا۔ بڑی رات تک گھر سے غائب رہنے کی عادت اختیار کر لیتے ہیں بعض بچے اپنے والدین سے غیر متوقع طور پر مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ایک فرماں بردار بچہ یکایک اس طرح سرکش اور نافرمان کیوں ہو گیا۔ حقیقت میں بچے کا روّیہ نہیں بدلا بلکہ اس کے دل میں ہمیشہ والدین کی مخالفت چھپی ہوئی تھی اب یہ جوان ہوا اور اسے کسی قدر آزادی اور قوت حاصل ہوئی تو اس نے دیرینہ مخالفت ظاہر کر دی۔ ایک لڑکا جسے اس کا باپ ہمیشہ ڈرایا دھمکایا کرتا تھا جو بچپن میں خود کو ہمیشہ مطیع اور فرماں بردار ظاہر کرتا تھا۔ باپ سے بدلہ لینے کا منتظر تھا۔ جب وہ جوان اور قوی ہو گیا تو ایک روز اس نے باپ کو لڑنے کی دعوت دی۔ باپ کو خوب پیٹا اور گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

نوجوانی کی منکریت

عام طور پر جوانی کے زمانے میں بچے کو زیادہ آزادی اور خود مختاری دے دی جاتی ہے۔ والدین خیال کرتے ہیں کہ اب انھیں نوجوان کو زیادہ روک ٹوک کرنے اور اس کی اتنی نگرانی اور حفاظت کرنے کا اتنا حق نہیں رہا جتنا کہ بچپن میں تھا۔ اگر والدین اپنی نگرانی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو نوجوان اس نگرانی سے بچنے کے لئے اس سے زیادہ کوشش کرتا ہے۔ والدین نوجوان پر یہ ثابت کرنے کی کہ وہ ابھی بچہ ہی ہے جتنی کوشش کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ نوجوان یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔ (یعنی

وہ بچہ نہیں رہا بلکہ جوان ہو گیا ہے) اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان مخالفانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور ہمارے سامنے نوجوانی کے زمانے کی منکریت کی تصویر پیش ہو جاتی ہے۔

بچے کس عمر میں جوان ہوتے ہیں اور جوانی کے علامات

نوجوانی کے زمانے کی مدت ہم نہیں بتا سکتے۔ عام طور پر ۱۴ سال سے ۲۰ سال تک کا زمانہ نوجوانی سمجھا جاتا ہے لیکن بعض بچے ۱۰ یا ۱۱ سال کی عمر میں جوان ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جسم کے تمام اعضاء بڑھنے لگتے ہیں اور بعض وقت مختلف اعضاء کے افعال میں ربط قائم نہیں ہوتا مثلاً بچوں کا قد بڑھنے لگتا ہے ہاتھ پاؤں بڑے ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کسی قدر سست اور کند ذہن ہو جاتے ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اعضاء کی نشو ونما اور ان کے افعال میں ربط قائم کیا جائے لیکن یہ کام بچوں کا مذاق اڑانے یا ان پر اعتراض کرنے کے بغیر کیا جائے ورنہ وہ یقین کر لیں گے کہ وہ بھدے اور پھوہڑ ہیں۔ اگر بچے کی حرکات اور افعال کی ہنسی اڑائی جائے گی تو وہ ضرور پھوہڑ ہو جائے گا۔

اینڈوکرائین غدود کا بھی بچے کی نشو ونما پر اثر پڑتا ہے۔ یہ غدود بچے کے اعضاء کی فعلیت کی صلاحیت کو بڑھاتے ہیں۔ ان کا اثر جوانی کے زمانے ہی میں شروع نہیں ہوتا بلکہ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی یہ کام کرتے ہیں۔ جوانی کے زمانے میں ان سے ریزش بہت زیادہ اور شدت کے ساتھ گرنے لگتی ہے اور جنسی علامات صاف طور پر ظاہر ہونے لگتے ہیں مثلاً لڑکے کو ڈاڑھی نکل آتی ہے اور اس کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ لڑکی کا جسم گداز ہو جاتا اور عورت پن کے دوسرے علامات ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے متعلق نوجوانوں کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

بچہ جوانی کے لئے تیار نہ ہو تو کیا ہوتا ہے۔

وہ بچہ جو جوانی کے زمانے کے لئے اچھی طرح تیار نہیں کیا گیا ہو جب کسب معاش۔ سماج۔ سماجی زندگی۔ محبت وشادی کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ ان مسائل کا مقابلہ کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی اور اس پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ سماج کی حد تک یہ نوجوان شرمیلا کم سخن

اور تنہائی پسند ہوتا ہے اور خود کو سماج (سوسائٹی) سے علیحدہ کر کے گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ کسب معاش کے معاملے میں اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کسی کام سے اس کو دلچسپی نہیں ہوتی اور ہر کام کے متعلق اس کا یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ اس میں ناکامیاب ہوگا۔ محبت اور شادی کرانے کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے جنس والوں (یعنی عورتوں) سے جھجکتا اور ان سے ملنے جلنے سے گھبراتا ہے۔ اگر کوئی عورت اس سے بات کرے تو شرما جاتا اور جواب دینے کے لئے اسے الفاظ نہیں ملتے اس کی مایوسی روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر زندگی کے تمام مسئلوں کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں اور لوگ اس کی حالت اور ذہنیت کو سمجھ نہیں سکتے بتدریج حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ کسی سے آنکھ ملا کر نہیں دیکھتا نہ خود کچھ بولتا اور نہ دوسروں کی سنتا۔ نہ پڑھتا لکھتا نہ کچھ کام کرتا بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہتا ہے اور خیالی منصوبے باندھتا رہتا ہے۔ اس میں اس کی جنس کا کچھ خفیف اور ذلیل حصہ باقی رہ جاتا ہے (یعنی مرد کے اوصاف باقی نہیں رہتے ایک پست و ذلیل قسم کے مرد کا نمونہ بن جاتا ہے) یہ بھی ایک قسم کا جنون ہے جس کو ڈِیْ مَنْ شِیَا پْرِیْ کاکس کہتے ہیں۔ اس کو پورا جنون کہنا غلطی ہے اس لئے کہ اس قسم کے نوجوان کی اگر حوصلہ افزائی کی جائے اور اس پر ثابت کر دیا جائے کہ وہ غلط راستے پر ہے اور ساتھ ہی صحیح راستہ بتا دیا جائے تو وہ درست ہو جاتا ہے۔

کسی شخص کی پوری زندگی کو بدل دینا اس کی اختیار کی ہوئی برائیوں کی اصلاح کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ہر بگڑے ہوئے شخص کی گزشتہ۔ حالیہ اور آئندہ زندگی کو سائنٹیفک طریقہ پر جانچنا پڑتا ہے۔ صرف سرسری اور خانگی حالات معلوم کرنے سے کام نہیں چلتا۔

اگر زندگی کے تین مسائل (یعنی بنی نوع انسان سے تعلقات۔ کسب معاش۔ شادی) کے لئے نوجوان کو پہلے سے ہی اچھی طرح تیار نہ کیا گیا ہو اور اس کی تربیت اچھی نہ ہوئی ہو تو زمانہ شباب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بچے اگر اپنے مستقبل سے ڈرتے

رہینگے تو ظاہر ہے کہ آیندہ زندگی کے مقابلے کے لئے وہ کافی طور پر تیار نہ ہوں گے اور کافی کوشش نہ کریں گے۔ اس قسم کے بچے کو جتنا بھی کہا جائے گا جتنا اس کی نکتہ چینی کی جائے گی اتنا ہی اس کا یہ خیال قوی ہوتا جائے گا کہ وہ گہرے غار کے منہ پر کھڑا ہوا ہے۔ جتنا ہم اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرینگے اتنا ہی وہ پیچھے ہٹیگا۔ جب تک کہ ہم بچے کا دل نہ بڑھائیں اس کی اصلاح کے لئے ہماری ہر ایک کوشش بیکار جائے گی بلکہ اس سے بچے کو نقصان پہونچتا جائے گا۔ جب بچہ قنوطی اور ڈرپوک ہو جائے تو پھر ہم توقع نہیں کرسکتے کہ اس میں مزید کوشش کرنے کا احساس یا جذبہ باقی رہا ہو گا۔

بعض بچے جوان ہو کر بھی بچے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ بچوں کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے سے چھوٹے بچوں سے کھیلتے اور ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بچے ہی رہ سکتے ہیں۔ لیکن اکثر بچے جوان ہو کر کوشش کرتے ہیں کہ جوانوں کی طرح عمل کریں۔ اگر وہ حقیقت میں باہمت نہیں بھی ہوتے تو مسن افراد کی نقل کرتے ان کی حرکات کی تقلید کرتے ہیں۔ روپیہ اڑانا اور عشق بازی شروع کرتے ہیں۔

بعض بری صورتیں یہ ہوتی ہیں کہ جب نوجوان دیکھتا ہے کہ وہ مسائل زندگی کو حل نہیں کرسکتا تو پہلے وہ کچھ کوشش کرتا ہے لیکن بعد مایوس ہو کر مجرمانہ زندگی اختیار کرلیتا ہے اور یہ صورت خصوصاً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ نوجوان سے متعدد مجرمانہ فروگزاشتیں پہلے سرزد ہو چکی ہوں اور وہ پکڑا نہ گیا ہو وہ سمجھتا ہے کہ اب آیندہ بھی چالاکی سے وہ بچتا رہے گا اور پکڑا نہ جائے گا۔

جرم کرنا

زندگی کے مسائل خصوصاً کسب معاش اور اقتصادی مسائل سے بچنے کا سب سے آسان طریقہ جرم اختیار کرلینا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ مجرمین کی زیادہ تعداد ۱۴ سے ۲۰ سال تک کے نوجوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ چھان بین سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بچپن کی غلطیوں کی وجہ ایسا ہونا لازم ہے۔

اعصابی خرابیاں

اب اگر مشغولیت کا دائرہ تنگ ہو تو نوجوان خلل اعصاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالعموم ایسی عمر میں بچے مختلف اعصابی امراض میں مبتلا ہو جاتے اور اپنی اس خرابی کو مسائل زندگی حل نہ کر سکنے کی وجہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی احساس برتری کو کم نہیں ہونے دیتے۔

اعصابی خرابیاں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی شخص سماجی مسائل سے دوچار ہوتا ہے لیکن ان کے مقابلہ کے لئے سماجی طریقے پر تیار نہیں رہتا۔ یہ مشکل کشمکش پیدا کر دیتی ہے۔ عنفوان شباب میں جسمانی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اس قسم کی کشمکشوں کو اچھی طرح قبول کر لیتی ہے۔ تمام اعضا میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور تمام نظام عصبی متاثر ہو جاتا ہے اور پھر یہ اعصابی ہیجان ناکامیوں کی صورت میں بطور عذر پیش کر دیا جاتا ہے۔ ایسا شخص خود یہ سمجھنے لگتا اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ناکامیوں کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے بلکہ اس کی بیماری پر ہے اور یہ تصور اس کو بتدریج اعصابی خرابی کا پکا مریض بنا دیتا ہے۔

ہر ایک اعصابی مریض اچھے اور نیک ارادوں کا اظہار کرتا ہے وہ سماجی جذبات رکھنے اور زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کی اہمیت کا قائل ہوتا ہے۔ لیکن عصبی مرض کو بطور عذر پیش کر کے خود کو سماج کے اس عام مطالبہ سے مستثنیٰ قرار دے لیتا ہے۔ اس کا پورا طرز عمل ایسا ہوتا ہے کہ گویا وہ پکار کر کہہ رہا ہے "میں ہر چند چاہتا ہوں کہ اپنے تمام مسائل اور مشکلات حل کروں لیکن بدقسمتی سے ایسا کرنے سے روک دیا گیا ہوں۔"

مریض اور مجرم کا فرق

اعصابی خلل کے مریض اور مجرم میں یہ فرق ہے کہ مجرم اکثر اپنے برے ارادوں کو علانیہ طور پر ظاہر کرتا ہے اور اس کے سماجی جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ مضر ثابت ہوتا ہے خلل اعصاب کا وہ مریض جس کی نیت تو اچھی ہوتی ہے لیکن نیت کے برخلاف اس کے اعمال ایسے ہوتے ہیں جن سے

اس کا کینہ پرور اور خود پسند ہونا ظاہر ہو جاتا ہے اور جو شخص دکھاوے کے لئے دوسروں سے تعاون کرتا ہے یا وہ مجرم جو سماج کا کھلا مخالف ہوتا اور جو بڑی محنت اور کوشش سے رہے سہے سماجی جذبات کو دبا دیتا ہے۔

لاڈلے بچے جوان ہوکر ناکامیاب ہوتے ہیں

ان نوجوانوں کی جو جوانی کے زمانے میں ناکامیاب ہوتے ہیں زیادہ تر تعداد لاڈلے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اس لئے کہ ان بچوں کے لئے جن کا بچپن میں ہر کام ان کے لئے دوسرے انجام دیا کرتے تھے بڑے ہونے کے بعد جوانی کی ذمہ داریوں کا مقابلہ کرنا غیر معمولی بار ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے جوان ہونے کے بعد بھی چاہتے ہیں کہ ان کے لاڈ اٹھائے جائیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب وہ مرکز توجہ نہیں رہے تو وہ اپنی زندگی کو برا کہتے ہیں کہ اس نے انھیں دھوکہ دیا اور ناکامی کا باعث ہوئی اور یہ کہ ان کی پرورش مصنوعی گرم فضا میں ہوئی حالانکہ باہر کی حقیقی فضا بہت سرد ہے۔ اس وقت بچوں کی ترقی رک جاتی ہے۔ وہ بچے جن سے اچھی امیدیں وابستہ تھیں تعلیم میں ناکامیاب ہونے لگتے اور وہ بچے جو ہمیشہ پیچھے رہتے تھے ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور خلاف توقع قابلیت ان سے ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اس سے ہمارے پچھلے بیان کی تردید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ایک بچہ جس کی حالت امید افزا تھی ان توقعات کو جو اس سے رکھی گئی تھیں پوری نہ کر سکنے کے خیال سے ڈر گیا ہو۔ جب تک اس کی مدد کی گئی اور اس کا دل بڑھایا گیا وہ آگے بڑھتا رہا لیکن جب اس کے خود کوشش کرنے کا وقت آیا تو اس نے ہمت ہار دی اور پیچھے ہٹ گیا۔ بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی نئی آزادی سے قوت حاصل کرتے ہیں اور انھیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے راستے صاف طور پر نظر آجاتے ہیں۔ ان کے ذہن میں نئے خیالات تیرے کام آتے رہتے ہیں۔ ان کی تخلیقی زندگی شدت سے کام کرتی ہے۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے انھیں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ بچے ہوتے ہیں جنہوں نے

ہمت نہیں ہاری جو آزادیٔ عمل کو مشکلات کا باعث نہیں سمجھے اور نہ انھیں شکست کا ڈر ہوا بلکہ آزادیٔ عمل کو کارنمایاں انجام دینے اور دنیا کو فائدہ پہنچانے کا سنہری موقع سمجھا۔

لڑکے اور لڑکیوں کا دل بڑھایا جائے تو کام کے ہو جاتے ہیں

وہ بچے جنہیں پہلے حقارت کی نظر سے دیکھا گیا اور پھر ان سے غفلت کی گئی ہو جب دیکھتے ہیں کہ ان کے ساتھیوں کی تعریف کی جاتی اور ان کا دل بڑھایا جاتا ہے تو ان کے دلوں میں بھی اس کی توقع پیدا ہوتی ہے۔ بعض بچوں پر تعریف کی خواہش خودنمائی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ لڑکوں میں تعریف کی خواہش کافی خطرناک ہوتی ہے لیکن لڑکیاں تو چونکہ اپنے آپ پر کافی اعتماد نہیں رکھتیں جب تک ان کی تعریف نہ کی جائے دل بڑھایا نہ جائے کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔ اس قسم کی لڑکیاں آسانی سے ایسے لوگوں کا شکار ہو جاتی ہیں جو خوشامد کرنا خوب جانتے ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ متعدد لڑکیوں نے جن کی گھر میں قدر افزائی نہیں کی گئی باہر جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ انھوں نے ایسا صرف یہ دکھانے نہیں کیا کہ وہ جوان ہو گئی ہیں۔ بلکہ اس امید پر ایسا کیا کہ اپنے لئے ایک ایسا موقف پیدا کر لیں جہاں ان کی قدر بڑھے اور وہ مرکز توجہ ہو جائیں۔ میں اب ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مثال

ایک نادار اور مفلس لڑکی تھی جو ۱۵ سال کی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جو اس لڑکی کے بچپن کے زمانے میں ہمیشہ بیمار رہا کرتا تھا۔ اس کی ماں کا زیادہ تر وقت لڑکے کی تیمارداری میں گزرتا تھا اور ماں اس لڑکی کی کافی دیکھ بھال نہ کر سکتی تھی۔ لڑکی کا باپ بھی اکثر بیمار رہا کرتا تھا اور بھائی کی تیمارداری کے بعد جو وقت بچتا تھا وہ باپ کی خبرگیری میں صرف ہو جاتا تھا۔ اس سے لڑکی نے محسوس کر لیا اور خوب سمجھ گئی کہ نگرانی اور خبرگیری کسے کہتے ہیں۔ اب اس کے دل میں بھی خواہش پیدا ہو گئی کہ اس کی بھی اسی طرح خبرگیری کی جائے لیکن گھر میں اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس اثنا میں اسے ایک چھوٹی بہن پیدا ہو گئی اور چونکہ باپ

اچھا ہو گیا تھا اس لئے ماں اس نو مولود کی دیکھ بھال میں اپنا وقت صرف کرنے لگی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی نے خیال کر لیا کہ گھر میں وہی ایک ایسی ہے جس کا کوئی چاہنے اور محبت کرنے والا نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ وہ ایک قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی لیکن گھر میں اچھی طرح رہتی تھی اور مدرسے میں بھی بہترین لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ وہ تحتانی مدرسے میں کامیاب رہی اس لئے رائے قرار پائی کہ اس کی تعلیم جاری رکھی جائے پس اسے مدرسہ فوقانیہ میں شریک کیا گیا۔ اس مدرسہ کا معلم اس سے واقف نہ تھا۔ لڑکی ابتدا میں اس مدرسے کے تعلیمی طریقوں کو نہ سمجھ سکی اور مدرس اس پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی پست ہمت ہو گئی۔ لڑکی کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس کا دل بڑھایا جائے اس کے کام کی قدر کی جائے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے خیال کیا کہ نہ گھر میں میرا کوئی قدرداں ہے اور نہ مدرسے میں پس اب میرے لئے دنیا میں کیا رکھا ہے؟ اب اس نے کسی ایسے مرد کی تلاش شروع کی جو اس کی کچھ پروا اور قدر کرے۔ چند تجربوں کے بعد یہ لڑکی ایک روز گھر سے غائب ہو گئی اور ایک شخص کے ساتھ چودہ دن گزاری۔ گھر والے بیحد پریشان ہوئے اور اس کا پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ معلوم نہ ہوا کہ کہاں چلی گئی۔ ہمارے خیال میں اس لڑکی نے بہت جلد محسوس کر لیا ہوگا کہ یہاں بھی اس کی قدر نہیں کی گئی اور وہ اپنی اس حرکت پر پچھتائی ہوگی اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ ایسا ہی ہوا لڑکی کے دل میں خودکشی کا خیال پیدا ہوا اس نے گھر والوں کو خط لکھا کہ "پریشاں مت ہو میں نے زہر کھا لیا ہے اور بہت خوش ہوں" حالانکہ اس نے زہر نہیں کھایا تھا اور کیوں نہیں کھایا۔ ہمیں معلوم ہے۔ اس کے والدین حقیقت میں اس پر مہربان تھے لہذا اس نے خیال کیا کہ اس طرح لکھنے سے وہ ان کی ہمدردی حاصل کرے گی پس اس نے زہر نہیں کھایا اور انتظار کرتی رہی یہاں تک کہ اس کی ماں آکر اسے گھر لے گئی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اگر لڑکی بھی جانتی کہ اس تمام کاوش اور دردسری کا باعث اس کی قدر افزائی اور حوصلہ افزائی کی خواہش

ہوئی ہے تو وہ ان مشکلات میں نہ پڑتی۔ مدرسہ فوقانیہ کا مدرس بھی اگر اس نکتے کو سمجھ لیتا تو لڑکی کو ان مصیبتوں سے بچا لیتا۔ سابقہ مدرسے میں اس کی رپورٹیں ہمیشہ بہت اچھی رہتی تھیں حالیہ مدرسہ کا مدرس اگر سمجھ لیتا کہ یہ لڑکی اس بارے میں بڑی حساس ہے اور احتیاط سے کام لیتا تو اس کا دل نہ ٹوٹتا اور یہ پست ہمت نہ ہوتی۔

مثال ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ ایک ایسے والدین کو جن کی اخلاقی حالت پست تھی لڑکی پیدا ہوئی۔ ماں کی خواہش تھی کہ لڑکا ہو اس لئے جب لڑکی پیدا ہوئی تو وہ مایوس ہوئی۔ اس سے گویا کہ اس نے عورت کی اہمیت کو گھٹا دیا اور اس کا لڑکی پر برا اثر پڑا۔ لڑکی نے ماں کو باپ سے یہ متعدد بار کہتے ہوئے سنا کہ لڑکی کی صورت اچھی نہیں ہے یہ بڑی ہوگی تو کوئی بھی اسے پسند نہ کرے گا۔ جب یہ بڑی ہو جائے تو ہم اس کو کیا کریں۔ اس زہریلی فضا میں دس سال زندگی بسر کرنے کے بعد ایک روز لڑکی نے ایک خط دیکھا جو اس کی ماں کے کسی دوست نے لکھا تھا۔ اس خط میں ماں کو اس لڑکی کی پیدائش پر تسلی دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ تم ابھی جوان ہو اور تمھیں لڑکا ہو سکتا ہے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ یہ تحریر پڑھ کر لڑکی نے کیا محسوس کیا ہوگا!! چند ماہ بعد وہ گاؤں کو چچا سے ملنے گئی۔ جب وہاں تھی تو گاؤں کے ایک معمولی نوجوان سے اس کی ملاقات ہوئی اور وہ اس کا عاشق ہو گیا۔ اس نے چند روز بعد اس سے قطع تعلق کر لیا لیکن لڑکی نے دوسروں کے ساتھ عشق بازی کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ جب یہ میرے پاس رجوع ہوئی تھی اس وقت عاشقوں کی کافی تعداد جمع کر چکی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک بھی اس کی خاطر خواہ خوشامد اور تعریف نہیں کرتا۔ لڑکی میرے پاس علاج کے لئے اس لئے آئی تھی کہ وہ خوف اور پریشانی کے خبط میں مبتلا ہو گئی تھی۔ تنہا کہیں نہ جا سکتی تھی۔ جب وہ اس طریقے سے بھی تعریف اور حوصلہ افزائی حاصل نہ کر سکی تو دوسرا طریقہ اس نے اختیار کیا وہ یہ کہ اس نے اپنا

دکھ درد بیان کرکے گھر والوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ جب تک وہ اجازت نہ دے گھر کا کوئی فرد کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔ وہ روتی اور خودکشی کر لینے کی دھمکیاں دیتی اور اس طرح گھر والوں کو دق کرتی۔ میں نے بڑی مشکل سے لڑکی کو یہ بات سمجھائی اور اسے قائل کیا کہ اس کی حقیقی مصیبت یہ ہے کہ شروع جوانی میں اس کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی جو نہیں کی گئی اس کا اس نے ضرورت سے زیادہ اثر لیا اور اس اثر کو زائل کرنے کی فکر میں ان مشکلات میں پھنس گئی۔

جنسی تعلقات

لڑکے اور لڑکیاں دونوں نوجوانی کے زمانے میں جنسی تعلقات کو غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں اور اس بارے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اب بڑے ہو گئے اور اس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں مثلاً کوئی لڑکی لڑتی جھگڑتی رہتی ہے اور ہمیشہ یہی سمجھتی رہتی ہے کہ اس کو بے موقع طور پر روکا جا رہا ہے تو عام طور پر احتجاجاً وہ کسی مرد سے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہے اس کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ ماں اس کی حرکت سے واقف ہے یا نہیں وہ تو محض اس تصور میں مگن رہتی ہے کہ وہ ماں کو پریشان کر سکتی ہے۔ میں نے اکثر ایسی لڑکیاں دیکھیں جو ماں سے یا باپ سے لڑ کر گلی کوچوں میں نکل گئیں اور جو پہلا مرد انھیں ملا اس سے جنسی تعلق قائم کر لیئے حالانکہ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو ہمیشہ نیک چلن سمجھی جاتی تھیں۔ اچھی پرورش پائی تھیں اور ایسی تھیں جن سے کبھی ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں لڑکیوں کا قصور نہ تھا۔ ان کی تربیت بری طور سے ہوئی تھی۔ انھوں نے خود کو کمتر موقف میں پایا اور خیال کیا کہ صرف اسی ایک طریقے سے وہ اپنے لئے بہتر اور برتر موقف پیدا کر سکتے ہیں۔

متعدد لڑکیاں جنہیں بے موقع لاڈ کیا گیا ہو اپنے جنس یعنی عورت کی طرح عمل کرنا اپنے لئے مشکل پاتی ہیں۔ ہمارے کلچر میں یہ عام خیال ہے کہ مرد عورت سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

بعض لڑکیاں اپنی جنس کو پسند نہیں کرتیں

اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں عورت ہونا

پسند نہیں کرتیں اور میری اصطلاح میں مردانہ دعویٰ کرنے لگتی ہیں۔ یہ مردانہ دعوے کئی صورتوں سے ظاہر ہوتا ہے بعض وقت اس قسم کی عورتیں مردوں کو ناپسند کرتی اور ان سے دور بھاگتی ہیں بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مردوں کو پسند تو کرتی ہیں لیکن جب ان سے ملتی ہیں تو بھوکلائی جاتی اور ان سے بات چیت نہیں کر سکتیں ایسی محفلوں میں شریک ہونا نہیں چاہتیں جہاں مرد ہوں اور جب جنسی مسائل ان کے سامنے پیش ہوں تو بے چین ہو جاتی ہیں۔ کہتی تو بہت کچھ ہیں کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ اور کچھ سن بڑھنے کے بعد شادی کر لیں لیکن کبھی دوسرے جنس والوں سے دوستی نہیں کرتیں اور شادی کے لئے کسی قسم سے سلسلہ جنبانی نہیں کرتیں۔

بعض دفعہ عورتوں کی اپنی جنس سے نفرت عنفوان شباب میں شدت سے ظاہر ہوتی ہے۔ لڑکیاں اس عمر میں لڑکوں کی حرکات اختیار کرتی ہیں۔ لڑکوں کی تقلید کرنا چاہتی ہیں۔ لڑکوں کی برائیوں کی نقالی انھیں آسان معلوم ہوتی ہے اور وہ تمباکو نوشی۔ شراب پینا۔ گالیں بکنا اختیار کر لیتی ہیں۔ جتھوں اور بدمعاشوں کی ٹولیوں میں شریک ہوتی ہیں اور جنسی آزادی کا بے باکی کے ساتھ مظاہرہ شروع کر دیتی ہیں۔

اس قسم کی لڑکیاں اکثر عذر پیش کرتی ہیں کہ اگر وہ اس طرح کی حرکات نہ کریں تو لڑکے ان میں دلچسپی نہ لیں گے۔

جب لڑکیوں میں اپنی جنس کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے تو پھر یہ ہم جنسی مباشرت۔ عصمت فروشی اور دوسری خلاف فطرت عادتیں اختیار کر لیتی ہیں۔

تمام کسبیوں کا ابتدائی عمر سے یہی خیال رہتا ہے کہ کوئی بھی انھیں پسند نہیں کرتا۔ اور وہ یقین کر لیتی ہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل کام انجام دینے کے لئے پیدا ہوئی ہیں اور یہ کہ وہ کبھی کسی مرد کی سچی محبت حاصل نہیں کر سکتیں۔ ان وجوہ سے ہمارے خیال میں یہ عورتیں خود کو تباہ کر لیتی ہیں۔ جنسی فعل میں ان کا جو پارٹ (حصہ) ہوتا ہے اس کو حقارت سے دیکھتی اور جنسی فعل کو روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔

اپنی جنس سے نفرت نوجوانی کے زمانے میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہم نے ہمیشہ

یہ پایا کہ لڑکی نے بچپن سے ہی لڑکی ہونا ناپسند کیا لیکن اس زمانے میں اسے اس ناپسندیدگی کے اظہار کا موقع نہیں ملا یا ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔

نہ صرف لڑکیاں اس دعویٰ تذکیر (مرد ہونے کا دعویٰ) کا شکار رہوتی ہیں بلکہ وہ سب بچے جو مرد ہونے کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں تذکیر کو اپنا نصب العین قرار دے لیتے ہیں اور پھر شک میں پڑھ جاتے ہیں کہ آیا وہ اس نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں ۔

ہمارے کلچر میں تذکیر کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس سے لڑکی اور لڑکیاں دونوں مشکل میں پھنس جاتی ہیں خصوصاً جب وہ اپنے جنس کے فرائض اور ذمہ داریوں سے پوری طور پر واقف نہ ہوں ۔ متعدد بچے یہ خیال دل میں لئے ہوئے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ایک نہ ایک روز ان کی جنسیت بدل جائے گی ۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ دو سال کی عمر کو پہونچنے کے بعد بچے اپنی جنس سے واقف ہو جائیں اور بلا کسی شک اور شبہ کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں ۔

زنانہ وضع کے لڑکے

اکثر دیکھا گیا کہ وہ لڑکا جو زنانہ ڈیل ڈول رکھتا ہے مصیبت میں مبتلا رہتا ہے ۔ اجنبی لوگ اس کو بعض دفعہ عورت سمجھ لیتے ہیں اس کے جاننے والے اسے کہتے رہتے ہیں کہ تم کو حقیقت میں عورت ہونا چاہئے تھا ۔ ایسا لڑکا اپنی صورت شکل ۔ ڈیل ڈول کو اپنا ایک نقص ایک کمزوری تصور کرتا اور عشق و محبت اور شادی بیاہ کے نام سے گھبراتا ہے ۔

وہ لڑکے جو یقین نہیں رکھتے کہ وہ جنسی فعل کو کامیابی سے انجام دے سکیں گے جوانی میں لڑکیوں کی نقالی شروع کر دیتے ۔ زنانہ پن اختیار کرتے اور لاڈ میں بگڑی ہوئی لڑکیوں کی ساری برائیاں اختیار کر لیتے ناز و نخرے کرتے اور مٹکنے لگتے اور بالکل زنانہ طبیعت بنا لیتے ہیں ۔

نوجوانوں کا جنسی میلان بچپن میں قایم ہوتا ہے

نوجوانوں کا دوسری جنس والوں سے جو طرز سلوک ہوتا ہے اس کی بنیاد بھی چوتھے یا پانچویں

سال میں قائم ہوتی ہے۔ بچوں میں پیدائش کے چند ہی ہفتوں کے بعد جنسی میلان ظاہر ہونے لگتا ہے لیکن ہمیں کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جو اس میلان کے لیئے باعث تحریک اور تقویت ہو۔ اگر جنسی میلان کو ابھارا نہ جائے تو وہ فطری طور پر بروقت اپنا کام کرے گا اور اس سے ہمیں کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی بچہ زندگی کے پہلے سال میں عضویاتی ہیجان کے آثار ظاہر کرے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ بچے کے ساتھ تعاون کرکے اس کی توجہ اس کے اعضا سے ہٹا دینی چاہیئے اور ماحول سے اس میں دلچسپی پیدا کر دینی چاہیئے۔

اگر کسی بچے کی خلاف فطرت طریقوں سے خود سیری کی عادت ترک نہ ہو تو ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ جنسی خواہش کی وجہ وہ ان حرکات کا مرتکب نہیں ہو رہا ہے بلکہ ان کے ذریعے سے اپنے اور کوئی مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے۔ عام طور پر ان حرکات سے بچے دوسروں کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ والدین ان کی ان حرکات سے پریشان اور متفکر ہو جاتے ہیں پس وہ والدین کے جذبات سے کھیلنا اور فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب بچوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان بری عادات کے ذریعے وہ بزرگوں کی توجہ حاصل نہ کر سکے تو پھر یہ عادتیں ترک کر دیتے ہیں۔

بچوں کے اعضا میں ہیجان نہ پیدا کرنا چاہیئے

ہم نے کہہ دیا ہے کہ بچوں کے اعضا میں کوئی تحریک پیدا نہ کی جائے۔ اکثر والدین بچوں کو بہت چاہتے ہیں اور بچے بھی انھیں چاہتے ہیں۔ محبت میں اضافہ کرنے کی خاطر بچوں کو لپٹا لیا۔ گلے لگایا جاتا اور پیار کیا جاتا ہے۔ یقیناً والدین جانتے ہیں کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ اور جب جانتے ہوئے ایسا کرتے ہیں تو گویا بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بچوں کی محبت کے جذبات کو اکسانا نہ چاہیئے اور نہ ان کی نفسیاتی جذبات کو محرک کرنا چاہیئے۔ اکثر بچوں نے اور بعض سن رسیدہ افراد نے مجھ سے بیان کیا کہ بچپن میں باپ کے کتب خانہ میں فحش تصاویر کی کتاب دیکھنے یا اسی قسم کی سینما فلم دیکھنے سے

ان کے جذبات میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی۔ بچے اور نوجوان اگر اس قسم کی کتابیں اور سینما فلم نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔ اگر ہم بچوں کے جذبات نہ بھڑکائیں اور ان میں تحریک پیدا نہ ہونے دیں تو پھر کوئی مشکلات پیدا نہ ہوں گی۔

جنسی معلومات

بچوں کو غیر ضروری اور نامناسب جنسی معلومات بہم پہونچانا بھی ان کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے۔ اس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کر دیا ہے بعض لوگوں کو بچوں کو جنسی معلومات بہم پہونچانے کا خبط ہو جاتا ہے۔ انھیں اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی بچہ اس مسئلہ میں جاہل اور لاعلم نہ رہ جائے۔ اگر ہم اپنی اور دوسروں کی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا کہ جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے بچپن میں جنسی معلومات سے بے خبر رہنا ہمارے لئے عذاب ثابت نہیں ہوا۔ مناسب ہو گا کہ ہم اس وقت تک انتظار کریں کہ بچہ خود کچھ پوچھے یا دریافت کرلے۔ اگر والدین بچے سے دلچسپی رکھتے ہوں تو اگر بچہ کچھ نہ بھی کہے تو اس کا منشا معلوم کرلیں گے۔ اگر بچہ والدین کو اپنا ایک ساتھی تصور کریگا۔ تو ضرور ان سے پوچھے گا۔ جب بچہ پوچھے تو اس کو اس طرح کے جواب دینا چاہیئے جو وہ سمجھ سکے اور اتنے ہی معلومات بہم پہونچانا چاہیئے جو وہ ہضم کر سکے۔

یہ بھی مناسب ہو گا کہ والدین بچوں کے سامنے اپنی باہمی محبت کا کسی قسم کا مظاہرہ نہ کریں۔ اگر ممکن ہو تو بچوں کو ایک ہی بستر پر بلکہ ایک ہی کمرے میں تک اپنے ساتھ نہ سلائیں۔ بھائی بہنیں بھی علٰحدہ سوئیں تو بہت مناسب ہو گا۔ والدین کو چاہیئے کہ بچوں کی نشو و نما کو دیکھتے رہیں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے نہ رہیں۔ اگر والدین بچوں کی عادات اور اطوار اور ان کی کوششوں سے واقف نہ ہوں گے تو معلوم نہ کر سکیں گے کہ بچوں پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں اور وہ انھیں کدھر لے جا رہے ہیں۔

جوانی کا زمانہ کوئی خاص زمانہ نہیں

جوانی کے زمانے کے متعلق عام طور پر لوگوں کو

یہ وہم ہوگیا ہے کہ یہ زمانہ خاص اور عجیب ہوتا ہے۔ انسانی ارتقاء یا نشو ونما کے مختلف زمانوں کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ گویا کہ ارتقاء یا نشو ونما کا ہر دور دوسرے دور سے جدا اور بجائے خود ایک علیحدہ اور مکمل دور ہے مثلاً عمر کے انقلابی زمانہ کے متعلق بھی اکثر افراد کا یہی خیال ہے۔ عمر کے یہ مختلف دور یا زمانے حقیقت میں تغیرات نہیں ہوتے بلکہ زندگی کا ایک سلسلہ ہوتے ہیں یہ فطری انوکھے مظاہرے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہر دور یا زمانے کے متعلق فرد کی توقع کیا ہوتی ہے وہ اس کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے اور اس دور کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو کس طرح تیار کر لیتا ہے۔ اکثر افراد جب جوان ہوتے ہیں تو ایسے پریشان ہو جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے بھوت کو دیکھ لیا۔ اگر ہم یہ بات صحیح طور پر سمجھ لیں کہ جوانی کا زمانہ کوئی خاص زمانہ نہیں ہے تو ہم بچوں کو جوانی کے زمانے کے واقعات سے متاثر نہ ہونے دیں گے۔ البتہ ہم انھیں اتنی اجازت دیں گے کہ سماجی حالت کے مطابق اور اپنی عمر کا لحاظ کرتے وہ اپنی طرز زندگی میں کسی قدر تبدیل کر لیں۔

اکثر افراد کا خیال ہے کہ جوانی پر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ان کی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ جوانی کا زمانہ گذر جانے کے بعد۔ نہ دنیا کو ان کی ضرورت باقی رہتی اور نہ انھیں دوسروں سے تعاون کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا حق باقی رہتا ہے۔ اس قسم کے خیالات ہی جوانی کے زمانے کی مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

اگر بچے کو اس قسم کی تربیت دی جائے کہ وہ محسوس کرے کہ وہ سماج (سوسائٹی) کا ایک رکن ہے اور سماج کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے اور یہ کہ دوسرے جنس والے اس کے برابر والے اور ساتھی ہیں تو بچے کو موقع ملے گا۔ کہ وہ جوان ہو کر جوانی کے زمانے کے تمام مسائل اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے خود ہی حل کر لے۔ اگر بچہ خود کو دوسروں سے کمتر تصور کرے اور جوانی کے

متعلق غلط تاثرات لیا ہوا جوان ہو تو سمجھ لو کہ وہ خود مختار اور آزادانہ زندگی کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس بچے کی حالت جوان ہونے کے بعد یہ ہوگی کہ جب تک کوئی اسے مجبور کرتا رہے۔ اس کو اس کے فرائض یاد دلاتا رہے تو وہ کچھ کرتا رہے گا۔ جب اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا تو بزدلی کا اظہار کریگا۔ اور ہر کام میں ناکامیاب رہے گا۔ ایسا بچہ غلامی کے لئے موزوں ہوگا آزادی کی دنیا میں اس کا کوئی مقام نہ ہوگا۔

فصل نویں

جرم اور اس کا انسداد

انفرادی نفسیات کے ذریعہ ہم مختلف قسم کے انسانوں کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان دوسرے انسان سے کوئی غیر معمولی طور پر جدا نہیں ہوتا۔

مجرم کون ہوتے ہیں

مجرمین کی زندگی ناکامیاب ہونے کی وہی وجہ ہوتی ہے جو مشکل بچوں، خلل اعصاب کے بیماروں، خبطیوں، خودکشی کر لینے والوں نشہ بازوں اور خلاف وضع فطری طریقوں سے جنسی خواہشیں پوری کرنیوالوں کی ناکامیابی کی ہوتی ہے۔ یہ سب وہ افراد ہوتے ہیں جو مسائل زندگی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب کی ناکامیابی کی نوعیت یکساں ہوتی ہے۔ ان میں کے ہر ایک فرد میں سماج سے دلچسپی نام کو نہیں ہوتی۔ یہ لوگ دوسرے انسانوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے

باوجود اس کے ہم ان افراد کو دوسرے انسانوں سے بالکل جدا تصور نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جسے ہم کامل تعاون کرنے والا اور مکمل طور پر سماجی جذبات رکھنے والا کہہ سکیں۔

مجرمین کی کمزوریاں اور ناکامیاں معمولی افراد کی خامیوں اور ناکامیوں سے شدید تر ہوتی ہیں۔

ہمارے اور مجرمین کے مقاصد ایک ہوتے ہیں لیکن مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ جدا ہوتا ہے

مجرمین کی ذہنیت سمجھنے کے لئے ایک اور چیز بیان کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اور ہمارے مقاصد ایک ہی ہوتے ہیں۔ ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ مشکلات پر قابو پالیں۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ہم اس منزل پر پہونچ جائیں جہاں پہونچنے کے بعد ہم خود کو قوی۔ برتر اور کامیاب محسوس کریں۔ پروفیسر ڈیوی نے ہمارے اس خیال کو "سلامتی کی جد و جہد" کہا ہے جو درست اور صحیح ہے۔ دوسروں نے اسے تحفظ نفس کہا ہے۔ ہم جو چاہیں نام دیں لیکن ہم انسانوں میں یہ خواہش کہ پست حالت سے بلند مقام پر پہونچنا شکست کو فتح سے بدل دینا۔ سب سے آخر سے سب سے اول ہو جانے کی کوشش کرنا تیزی سے کام کرتی ہوئی پائیں گے۔ یہ کوشش یہ کشمکش مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے یعنی بچپن کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور آخر عمر تک جاری رہتی ہے۔

زندگی کے معنی یہ ہیں کہ اس کرہ ارض پر زندہ رہنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر عبور حاصل کرنا۔ پس اگر ہم یہی میلان اور یہی خواہش مجرمین میں بھی پائیں تو ہم تعجب نہ کریں۔ مجرم اپنے تمام حرکات اور افعال سے ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے مسائل حل کرنے۔ مشکلات پر عبور حاصل کرنے اور برتری حاصل کرنے کے لئے کشمکش کر رہا ہے۔ مجرم اور دوسروں میں جو فرق ہوتا ہے وہ مقصد اور خواہش کی حد تک نہیں ہوتا۔ مقصد اور خواہش دونوں کے ایک ہوتے ہیں لیکن اس مقصد یا خواہش کی تکمیل کے لئے جو راستہ مجرم اختیار کرتا ہے وہ دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔ جیسے

ہی ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ سماج کے مطالبوں کو سمجھنے اور بنی نو
دلچسپی نہ لینے کی وجہ مجرم نے غلط راستہ اختیار کیا تو اس کے اعمال
راز ہم پر کھل جاتا ہے یعنی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیوں غیر سماجی حر
جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

مجرم معمولی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں

میں اس چیز پر بہت زور دینا چاہتا ہوں اس۔
اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں۔ وہ مجرمین
تصور کرتے اور معمولی انسانوں کی طرح نہیں
بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سب مجرم کمزور دماغ والے
توارث کے اثرات پر زور دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ مجرم
لے کر پیدا ہوتا ہے اس لئے جرم کرنے پر مجبور ہے بعض لوگ کہتے ہیں
ماحول سے ہوتا ہے۔ جو ایک دفعہ مجرم ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ مجرم رہتا
خیالوں کے خلاف بہت کچھ شہادت پیش کی جا سکتی ہے اور ہمیں سمجھ
اگر ہم ان خیالوں کو صحیح مان لیں تو پھر ہمیں جرم کے مسائل حل کرنے کا
نہ رہے گا حالانکہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے زمانے میں ہی اس
حاصل کر لیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جرم ہمیشہ تباہی کا باعث ہوا ہے اور ا
ہیں کہ اس کے انسداد کے لئے کچھ نہ کچھ کریں لہذا ہم یہ کہہ کر کہ جرم کر
ہے مسئلہ کو بالائے طاق نہیں رکھ دے سکتے۔

ماحول یا توارث میں جبر نہیں ہے۔ ایک ہی خاندان کے بچے او
ماحول میں رہنے والے۔ بچے مختلف چال چلن رکھ سکتے ہیں بعض دفعہ ا
فیاملی میں کوئی بچہ مجرم نکل آتا ہے تو بعض اوقات ایک ایسی فیاملی میں
ارکان جرائم پیشہ ہوں اور جو کئی دفعہ قید خانوں اور تادیب خانوں میں
آئے ہوں۔ اچھی عادات اور اطوار کے بچے نکل آتے ہیں۔
ہے کہ بعض مجرمین کچھ عرصے کے بعد تائب ہو جاتے ہیں چنانچہ یہ واقعہ

نقب زن نے تیس سال کی عمر کے بعد جرائم چھوڑ کر خاموش زندگی اختیار کی اور اچھا شہری ہو گیا ماہرین نفسیات کو پریشان کر دیا اور وہ نہ بتا سکے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اگر جرم کرنے کا رجحان پیدائشی نقص ہوتا یا ماحول کی وجہ ہوتا تو ایسی اصلاح نہ ہونی چاہیئے تھی۔ ہمارے نظریئے سے تو ہم اس واقعہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بعض وقت کوئی شخص اپنی مرضی کے مطابق موقف میں ہوتا ہے۔ ماحول کے مطالبات اس پر کم ہوتے ہیں تو ان صورتوں میں اس سے طرز زندگی کے نقائص پوری طرح سطح پر نہیں آتے۔ کسی کو اس کی من مانی چیز آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک نقب زنی کرتے رہنے کے بعد بوڑھا اور بھدا ہونے لگتا ہے اور اپنے پیشے کے لئے موزوں نہیں رہتا۔ اس کے جوڑ بند سخت ہو جاتے ہیں اور وہ آسانی سے دیوار چڑھ نہیں سکتا۔ نقب زنی اب اس کے لئے مشکل ہو جاتی ہے۔

مجرم دیوانے نہیں ہوتے

قبل اس کے میں اور کچھ کہوں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ مجرمین دیوانے ہوتے ہیں بعض خبطی جرائم کرتے ہیں لیکن ان کے جرائم کی نوعیت بالکل جدا ہوتی ہے۔ ان جرائم کا ہم انھیں ذمہ دار نہیں سمجھتے اس لئے کہ وہ ان کو جرائم نہیں سمجھتے اور ان کی برائی سے واقف نہیں ہوتے یہی حال کم عقل اور بے وقوف مجرم کا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا آلہ کار ہوتا ہے۔

حقیقی مجرم کون ہوتا ہے

حقیقی مجرم وہ ہوتے ہیں جو جرم کا منصوبہ باندھتے اور اس کی اجرائی کا اسکیم تیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ چند بیوقوفوں اور سادہ لوح افراد کو دام فریب میں پھانس کر انھیں باغ سبز دکھا کر ان کے دل بڑھا کر ان سے جرائم کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح تجربہ کار مجرم نوجوانوں سے کام لیتے ہیں مختصر یہ کہ حقیقی اور تجربہ کار مجرم ہی جرم کا منصوبہ باندھتا اور خاکہ تیار کرتا ہے اور بچے اور نوجوان اس کے دھوکے میں آکر منصوبے کو عمل کا جامہ پہناتے ہیں۔

مجرم اور معمولی انسانوں کے نصب العین کا فرق

اب میں پھر اس عامل قوت کا ذکر کرتا ہوں جس کے متعلق اوپر بحث کر چکا ہوں۔ وہ عامل قوت ہی ہوتی ہے جو ہر مجرم اور ہر معمولی انسان کو کامیابی حاصل کرنے درجہ کمال کو پہنچنے کی کوششوں میں لگا دیتی ہے لیکن مجرمین اور معمولی انسانوں کے نصب العین میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مجرم کا نصب العین ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ خانگی اور ذاتی طور پر سب سے اعلیٰ اور برتر رہے جس چیز کے حاصل کرنے کی مجرم کوشش کرتا ہے اس میں دوسروں کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہوتا مجرم تعاون کرنے والا نہیں ہوتا۔ سماج اپنے ارکان سے مطالبات رکھتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں پس ہمیں چاہیئے کہ رفاہ عام کا لحاظ رکھیں اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی اپنے میں صلاحیت پیدا کریں۔ مجرم کا نصب العین ایسا ہوتا ہے کہ اس میں سماج کا فائدہ شامل نہیں ہوتا اور یہی چیز ہر مجرم کی زندگی میں صاف طور نظر آتی ہے۔ ہم آگے دیکھیں گے کہ ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ یہاں میں صرف اس چیز کو ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ہم مجرم کی ذہنیت سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ کس حد تک اور کس طرح وہ تعاون میں کامیاب رہا۔ مجرمین کی تعاون کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ بعض اس میں کم ناکامیاب ہوتے ہیں تو بعض زیادہ مثلاً بعض مجرمین چھوٹے چھوٹے جرائم کرتے ہیں اور اس حد سے بڑھتے نہیں بعض دوسرے بڑے بڑے جرائم کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض لیڈر رہتے ہیں تو بعض پیرو۔ مجرمین کی مجرمانہ زندگیوں کے اقسام سمجھنے کے لئے ہر مجرم کے طرز زندگی کی جانچ کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

مجرموں کی زندگی کے اقسام سمجھنے کے لئے ان کے طرز زندگی کی جانچ کرنی چاہیئے

ہر فرد کا طرز زندگی اس کی ابتدائی عمر میں قائم ہو جاتا ہے چنانچہ ہم چار یا پانچ سال کی عمر سے ہی اس کی نمایاں خصوصیات دیکھنے لگتے ہیں لہذا کسی فرد کے طرز زندگی کا بدل دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ فرد کا طرز زندگی اس کی پوری شخصیت

ہوتی ہے اور شخصیت جب ہی بدلی جا سکتی ہے جب ہم اس کے بنیادی نقائص سمجھ سکیں۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ کیوں مجرمین باوجود متعدد دفعہ سزائیں پانے۔ ذلیل وخوار کیئے جانے اور سماجی زندگی کی خوبیوں سے محروم رہنے کے کبھی اپنی اصلاح نہیں کرتے اور بار بار جرائم کرتے ہیں۔

مالی مشکلات افراد کو جرم کرنے پر مجبور نہیں کرتیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر گرانی کا زمانہ ہو اور لوگ زیر بار ہو گئے ہوں تو جرائم بڑھ جاتے ہیں چنانچہ اعداد شمار بتاتے ہیں کہ گیہوں کی قیمت کے اضافہ کے ساتھ ہی جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے لیکن یہ کہنا کہ مالی حالت ہی جرم کرنے کا باعث ہوتی ہے صحیح نہ ہوگا بلکہ اس سے اکثر افراد کی قلعی کھل جاتی۔ ان کی بری اخلاقی حالت اور محدود صلاحیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مجرمین کی تعاون کی قابلیت اپنے حدود رکھتی ہے اس لئے وہ ان حدود سے باہر ہو کر دنیا کو فائدہ نہیں پہونچاتے۔ اور پھر مجرمین یہ تھوڑی سی قابلیت تعاون بھی بتدریج کھو بیٹھتے ہیں اور جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں۔ متعدد واقعات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں متعدد افراد ایسے ہوتے ہیں جو خوش حالی کی حالت میں جرم اختیار نہیں کرتے لیکن جب کوئی مشکل آن پڑتی ہے جس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ بھی جرم کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جو چیز اہم ہے وہ انسان کا طرز زندگی اور اس کا اپنے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ ہے۔

انفرادی نفسیات کے ان تمام تجربوں کے بعد ایک معمولی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مجرم کو دوسروں سے مطلق دلچسپی نہیں رہتی وہ ایک حد تک دوسروں سے تعاون کر سکتا ہے اور جب یہ حد ختم ہو جاتی ہے تو جرم اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی ایسا مشکل مسئلہ پیش ہوتا ہے جسے وہ حل نہیں کر سکتا تو اس کی تعاون کی صلاحیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان مسائل زندگی پر غور کرنا جن کا آئے دن ہمیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور جنہیں مجرمین حل نہیں کر سکتے دلچسپی سے خالی نہیں۔ بہر حال ہماری زندگی کے جتنے مسائل ہوتے ہیں وہ سماجی ہوتے ہیں اور ہم انھیں جب ہی حل کر سکتے ہیں جب کہ

ہم اپنے میں دوسروں سے دلچسپی پیدا کرلیں۔

انفرادی نفسیات نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم زندگی کے مسائل کو تین قسموں میں تقسیم کریں سب سے پہلے ہم ان مسائل پر غور کریں گے جو ہمارے اور دوسروں کے (۱) تعلقات سے متعلق ہیں یعنی مسائل رفاقت (دوستی ملاقات کے مسئلے) مجرمین کبھی بعض دفعہ دوست احباب رکھتے ہیں لیکن یہ انہی کی ذات والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے جتھے بنا لیتے اور ایک دوسرے سے وفاداری کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان مجرمین نے اپنی عاملہ قوت کا دائرہ تنگ کرلیا ہے۔ یہ لوگ سماج کے دوسرے افراد سے دوستی نہیں کرسکتے اور خود کو بن باسی (جلا وطن) تصور کرتے اور اپنے ہم جنسوں سے مل جل کر رہنا کیا چیز ہے جانتے ہی نہیں۔

(۲) دوسرے قسم کے مسائل وہ ہیں جن کا تعلق کسب معاش سے ہے جب ان کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو مجرمین کی ایک کثیر تعداد کا جواب یہ ہوتا ہے کہ "ان دنوں مزدوری کا جو برا حال ہے تم جانتے ہو" مجرمین کام کرنا ایک مصیبت سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے لوگوں کو کام سے رغبت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں پائی جاتی اور وہ مشکلات کا مقابلہ کرنے آمادہ نہیں ہوتے۔ مفید کام کی تعریف یہ ہے کہ وہ کام جو دوسروں سے دلچسپی رکھنے کے بغیر انجام نہ پاسکے اور جس میں دوسروں کا فائدہ ہو۔ یہ چیزیں ہم مجرم میں نہیں پاتے۔ چونکہ تعاون نہ کرنے کا رجحان ابتداء عمر میں پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اکثر مجرمین کسب معاش کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں رہتے۔ اکثر مجرمین پیشوں میں مہارت نہیں رکھتے بلکہ اناڑی ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پچھلے حالات معلوم کرلیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مدرسے میں شریک ہونے سے قبل بلکہ اس سے بھی پہلے ان میں 'دلچسپی' موجود نہ تھی۔ ان لوگوں نے تعاون کرنا کبھی سیکھا ہی نہیں۔ 'تعاون' کے لئے تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے اور ان مجرمین کو یہ تعلیم اور تربیت نہیں ملی۔ پس اگر وہ کسب معاش کے مسائل میں ناکامیاب رہیں تو ہم انھیں قصوروار قرار نہیں دے سکتے۔ اگر کسی شخص نے کبھی جغرافیہ پڑھی ہی نہ ہو اور ہم اس میں اس کا امتحان لیں تو وہ غلط جوابات دے گا یا جواب ہی نہ دے سکے گا۔ پس

اسی طرح ہمیں مجرمین اور کسب معاش کے مسئلہ کو دیکھنا چاہیئے۔

(۳) تیسری قسم کے مسائل کا تعلق محبت اور شادی کی زندگی سے ہے۔ ایک اچھی اور کامیاب شادی کی زندگی کے لئے دوسروں سے دلچسپی رکھنے اور تعاون کرنے کی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ یہ انکشاف قابل غور ہے کہ جو مجرمین تادیب خانوں کو بھیجے جاتے ہیں ان میں کے آدھے سے زیادہ امراض خبیثہ میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ آسان طریقوں سے اپنے عشق اور محبت کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔ مجرمین اپنی معشوقوں کو ایک بے جان ملک تصور کرتے اور سمجھتے ہیں کہ محبت خریدی جا سکتی ہے۔ ان کے خیال میں جنسی زندگی فتح کرنا اور قبضہ کرنا ہے۔ وہ عورت کو ایک مقبوضہ چیز سمجھتے ہیں نہ کہ زندگی کی شریک اور ساتھی اکثر مجرمین کہتے ہیں "میں جو چاہتا ہوں وہ مجھے نہ دی جائے تو پھر زندگی کس کام کی"۔

مجرموں کے علاج کا طریقہ

اب معلوم ہوا کہ مجرمین کے علاج میں ہمیں کہاں سے ابتداء کرنی چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم انھیں "تعاون" کی تعلیم اور تربیت دیں۔ مجرمین کو چند روز تادیب خانے میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ سماج کے لئے خطرہ ہو جاتے ہیں۔ موجودہ حالات میں یہ بحث ہی چھیڑی نہیں جا سکتی کہ سماج کو مجرمین سے بچانا ہے وغیرہ حالانکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ جب مجرمین سماجی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو پھر ہم انھیں کیا کریں؟ زندگی کے تمام مسائل میں تعاون نہ کرنا انسان کی طبیعت کا معمولی نقص نہیں ہے۔ دن کے ہر لحظے میں ہمیں تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم میں تعاون کی صلاحیت کس درجہ ہے ہمارے دیکھنے۔ سننے اور گفتگو کے طریقے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

مجرمین کے بولنے اور سننے کا طریقہ ہی جدا ہوتا ہے

اگر میرے مشاہدے صحیح ہوں تو میں نے تو یہ پایا کہ مجرمین کا دیکھنے۔ بولنے اور سننے کا طور و طریقہ معمولی لوگوں سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ ان کی زبان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی

فرق اور امتیاز کی وجہ ان کی سمجھ بوجھ بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ جب ہم بولتے ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری گفتگو لوگ سمجھیں۔ سمجھنا خود ایک سماجی عنصر ہے۔ ہم الفاظ کو انھیں معنی میں استعمال کرتے ہیں جو عام طور پر رائج ہوں اسی طرح ہم دوسروں کی گفتگو کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اور دوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔ مجرمین کی حالت اس سے بالکل جدا ہوتی ہے وہ اپنی ایک خاص منطق اور خاص سمجھ رکھتے ہیں اور یہ چیز ہم اس وقت غور سے دیکھ سکتے ہیں جب وہ اپنے جرائم کا حال بیان کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے وقوف یا احمق نہیں ہوتے۔ اگر ان کی مفروضہ برتری کو مانتے ہوئے ہم انھیں بولنے کا موقع دیں تو وہ اپنی تقریر صحیح نتائج نکال کر ختم کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مجرم کہے گا کہ "میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک اچھا پائے جامہ پہنا ہوا تھا۔ میرے پاس پائجامہ نہ تھا اس لئے مجھے اسے مار ڈالنا پڑا" اب اگر ہم یہ مان لیں کہ اس کی خواہش بہت ہی واجبی تھی اور اس کو اچھے اور مفید طریقوں سے کسب معاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو پھر مجرم کا عذر معقول قرار پاتا ہے۔ لیکن ہمارے یہ دونوں مفروضات عقل سلیم کے خلاف ہیں۔

ایک مقدمہ

حال ہی میں ہنگری کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ کئی عورتوں نے مل کر متعدد افراد کو زہر دیا اور سب مر گئے۔ ان میں سے ایک عورت کو قید خانے بھیجا گیا اور اس نے اپنے بیان میں کہا کہ "میرا لڑکا بیمار تھا اس لئے ایک لفنگے کی مدد سے میں نے اسے زہر دے دیا۔" اگر وہ تعاون کو خارج کر دیتی تو اب اس کے پاس کیا رہتا؟ یہ عورت چالاک ہے لیکن اس کا معاملات اور مسائل کو دیکھنے کا طریقہ ہی جدا ہے۔ اس کا ادراک ذہنی بالکل علٰحدہ ہے۔ پس ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مجرمین جب اپنی خواہش کی چیزیں دیکھتے اور انھیں آسانی سے حاصل کر لینا چاہتے ہیں تو کس طرح اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اس مخالف دنیا سے جس سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہمیں اپنی خواہش کی چیزیں چھین لینی چاہیئے۔ وہ دنیا کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنی اور دوسروں کی اہمیت کا غلط اندازہ رکھتے ہیں۔

مجرم ڈرپوک ہوتے ہیں

مجرمین میں تعاون کی صلاحیت نہ ہونے کے متعلق صرف یہی چیز قابل غور نہیں ہے۔ سب مجرم بزدل اور ڈرپوک بھی ہوتے جن مسائل کو حل کرنے کی وہ اپنے میں طاقت نہیں پاتے انھیں وہ ٹال دیتے ہیں۔ جرائم کرنے کے علاوہ ان کی زندگی کے طریقے سے بھی ان کی بزدلی ظاہر ہوتی ہے۔ جرم کرنے میں بھی ہم ان کی بزدلی دیکھ سکتے ہیں مثلاً اپنی حفاظت کے لئے وہ اندھیرے اور تنہائی کو پسند کرتے۔ دوسرے پر اچانک حملہ کرتے اور قبل اس کے کہ وہ خود کو بچا سکے اس کے ہتھیار چھین لیتے ہیں مجرمین تصور کرتے ہیں کہ وہ بڑی بہادری کے کام انجام دے رہے ہیں لیکن ہمیں نہ چاہیے کہ اسے صحیح سمجھکر بیوقوف بنیں۔ جرم کرنا بزدل کی بہادری کی نقالی ہے۔ مجرم ایک ذاتی برتری کے نصب العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور یقین کرلیتے ہیں کہ وہ سورما ہیں جو غلط ادراک ذہنی اور عقل سلیم کے خلاف ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ بزدل ہیں اگر انھیں یقین ہو جائے کہ ہمیں ان کی بزدلی کا علم ہے تو انھیں بیحد صدمہ ہوگا۔ ان کا یہ خیال کہ وہ پولس کو بھی مغلوب کردے سکتے ہیں ان کے سر پھرا دیتا اور انھیں مغرور کردیتا ہے اور اکثر ان کا یہ تصور ہوتا ہے کہ انھیں کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اکثر مجرمین کے حالات کی جانچ سے اس بات کا پتہ چلے گا کہ بدقسمتی سے ان کے متعدد جرائم پردہ راز میں رہ گئے اور یہ صورت حال بیحد تکلیف دہ ہے۔ مجرم جب پکڑے جاتے ہیں تو وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ "اس دفعہ ہم نے کافی چالاکی سے کام نہیں لیا لیکن آئندہ پولیس کو بیوقوف بنائیں گے اور بچ نکلیں گے۔" اگر دوسری دفعہ یہ بچ جاتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ انھیں ان کا مقصد حاصل ہوگیا۔ ان کو برتری حاصل ہوگئی اور ان کے ساتھی ان کی تعریف کرتے اور ان کے شیدائی ہو جاتے ہیں۔

مجرمین کی اصلاح مدرسوں قیاطی اور تادیب خانوں میں کی جاسکتی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ مجرم کے بہادری اور چالاکی کے خیال خام کو اس کے دل سے دور کردیں لیکن سوال یہ ہے کہ کب اور کہاں ہم ایسا کرسکتے ہیں ؟ ہم قیاطی۔ مدرسے اور تادیب خانے ہیں یہ کرسکتے ہیں میں آگے بتاؤں گا کہ مجرمین کے خیال خام کو دور کرنے کا بہترین

طریقہ کیا ہے۔ اس وقت میں ان حالات کی صراحت کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ لوگ تعاون کرنے میں ناکامیاب ہوتے ہیں۔

فیا ملی میں کیا ہوتا ہے

بعض دفعہ اس کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے مثلاً ماں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ بچے کو اپنے سے تعاون کرنا سکھائے ماں اس قدر سادہ لوح ہوتی ہے کہ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا یا خود اس میں تعاون کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان والدین کو جن کی شادی کے بعد کی زندگی خوش گوار نہیں رہتی یا جو شادی کے بعد علیحدہ ہو جاتے ہیں اپنے بچوں میں تعاون کی صلاحیت خاطر خواہ بڑھانے کا موقع نہیں ملتا۔ بچہ سب سے پہلے ماں سے مانوس ہوتا ہے اور بعض دفعہ ماں نہیں چاہتی کہ بچے کی سماجی دلچسپی کو اتنا بڑھائے کہ اس میں باپ اور دوسرے بڑے اور بچے شامل ہو جائیں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ گھر والوں پر خود کو حاکم سمجھتا ہوا تین چار سال کا ہو جاتا ہے کہ فیا ملی میں دوسرا بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اب یہ پہلن بچہ تصور کرتا ہے کہ اسے شکست ہو گئی۔ وہ اپنے مقام سے ہٹا دیا گیا اور ماں سے یا نومولود سے تعاون کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ تمام حقائق قابل غور ہیں اگر آپ کسی مجرم کی زندگی کی جانچ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خرابی کی ابتدا اس کے بچپن کے فیا ملی کے تجربوں کی وجہ سے ہوئی۔ صرف ماحول کا ہی اس پر برا اثر نہیں پڑا بلکہ بچپن میں وہ اپنے موقف کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہا اور کوئی ایسا اسے نہ ملا جو اس کی اصلاح کرتا۔

اگر فیا ملی میں کسی بچے کو خصوصی اہمیت حاصل ہو یا غیر معمولی اچھی خصوصیتوں کا حامل ہو تو یہ چیز دوسرے بچوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ اس قسم کا بچہ سب کی توجہ حاصل کر لیتا ہے اور دوسرے بچے دل شکستہ ہو جاتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی کوئی پروا نہیں کرتا بس وہ تعاون نہیں کرتے بلکہ مقابلہ کرنے آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن اپنے آپ پر بھروسہ بھی نہیں رکھتے۔ وہ بچے جو اس طرح پیچھے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ انھیں ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے کام لینا سکھایا نہیں جاتا اور ان میں ان کی نشوونما کا نقص اکثر نظر آ جاتا ہے۔ اسی قسم کے بچے آگے چل کر مجرمین خلل اعصاب

کے مریض اور خودکشی کرنے والے ہوتے ہیں۔

مدرسے میں کیا گزرتی ہے

وہ بچہ جس میں تعاون کی صلاحیت نہیں ہوتی جب مدرسے میں شریک ہوتا ہے تو پہلے ہی روز اس کی حرکتوں سے یہ چیز ہم معلوم کرلے سکتے ہیں کہ اس میں تعاون کی کمی ہے۔ وہ دوسرے بچوں سے دوستی نہیں کرسکتا۔ مدرس کو پسند نہیں کرتا۔ جماعت میں متوجہ نہیں رہتا اور سبق نہیں سنتا۔ اب اگر اس کی اس کمزوری کو سمجھ کر اس کے ساتھ واجبی سلوک نہ کیا جائے تو ایک اور رکاوٹ اس کے راستے میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کا دل بڑھانے اور اسے تعاون کی تربیت دینے کے عوض اس کو ملامت کی جاتی اس کو ڈانٹا ڈپٹا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے تعلیم سے نفرت ہوجاتی ہے اور ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں جب اس کی ہمت اور خود اعتمادی پر چاروں طرف سے حملے کئے جانے لگتے ہیں تو پھر اسے سماجی زندگی سے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

کسی مجرم کی حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب وہ تیرہ سال کا تھا تو چوتھی جماعت میں تھا اور اس پر کند ذہنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ بہرحال غلط برتاؤ سے بچے کی پوری زندگی خطرے میں پڑھ جاتی ہے اس کی دلچسپی دوسروں سے بتدریج غائب ہوتی جاتی اور اس کا نصب العین زندگی غلط قائم ہوجاتا ہے۔

افلاس کا اثر

افلاس بھی انسان کے لئے ایسے اسباب پیدا کردیتا ہے کہ وہ مقصد حیات کی غلط تعبیر کرے۔ ایک مفلس گھر کا بچہ گھر کے باہر سماجی تنگ نظری اور تعصب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے خیالی ولے ناکامیوں کا شکار ہوتے رہتے اور مصیبتوں اور غم و اندوہ میں مبتلا رہتے ہیں بعض دفعہ بچے کو والدین کی مدد کے لئے روپیہ کمانا پڑتا ہے۔ سن بڑھنے کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ مالدار لوگ آرام کی زندگی بسر کرتے اور جو چاہے خرید کرسکتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بھی آرام کی زندگی بسر کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مالداروں کو ہے۔

بڑے شہروں میں مجرمین کی تعداد زیادہ کیوں ہوتی ہے اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ بڑے شہروں میں کثیر دولت کے ساتھ شدید افلاس کا وجود بھی ہوتا ہے۔

اگرچہ رشک و حسد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن ان حالات میں بچے کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ برتری حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ محنت کرنے کے بغیر دولت ہاتھ آ جائے۔

جسمانی نقص احساس کمتری کا باعث ہوتا ہے

احساس کمتری پیدا ہونے کی ایک وجہ جسمانی نقص بھی ہوا کرتا ہے۔ یہ نظریہ میری ایجاد ہے اور میں قصوروار ہوں کہ میں نے اس نظریئے کا اعلان کرکے عصبیات اور طبِ دماغی میں توارث کے نظریوں کا راستہ کھول دیا جب اعضا کی کمزوریوں اور ان کے نفسیاتی نعم البدل کے متعلق لکھنا شروع کیا تھا اسی وقت میں نے اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ احساس کمتری کا جسمانی نقص کو تمام تر ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ اس کی زیادہ تر ذمہ داری ہماری تعلیم کے طریقے پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم تعلیم کے صحیح طریقے استعمال کریں تو وہ بچے جو جسمانی نقائص رکھتے ہیں اپنے سوائے دوسروں میں دلچسپی لینگے۔ وہ بچہ جو اعضا سے معذور ہوتا ہے جب تک اسے دوسروں سے دلچسپی رکھنا نہ سکھایا جائے اپنے آپ سے دلچسپی رکھے گا۔ اکثر افرادِ اینڈوکرائین غدود کی خرابی میں مبتلا رہتے ہیں لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اب تک قطعی طور پر بتا نہیں سکے کہ ان غدود کا معمولی کام کیا ہے۔ غدود کے کام مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ ہماری شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ کوئی صحیح طریقہ معلوم کریں اور اس کے ذریعے بچوں میں تعاون کرنے اور دوسروں سے دلچسپی رکھنے کی عادت ڈال کر انھیں اچھا انسان بنائیں تو پھر ہمیں اس خیال کو دور کر دینا چاہیے۔

مجرمین کی زیادہ تعداد یتیموں پر مشتمل ہوتی ہے

مجرمین میں یتیموں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور میرے خیال میں ہماری تہذیب پر یہ ایک دھبہ ہے کہ ہم یتیموں میں تعاون کی اسپرٹ پیدا نہ کر سکے۔ اسی طرح بہت سی ناجائز اولاد مجرم بن جاتی ہے اس لئے کہ

کوئی ان کی محبت حاصل کر کے ان کی دلچسپی دوسرے انسانوں کی طرف منتقل کرنے والا نہیں ہوتا۔

لاوارث اور بدشکل بچے اکثر جرم اختیار کرتے ہیں

لاوارث بچے بھی اکثر جرم اختیار کر لیتے ہیں خصوصاً جب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ مجرمین میں بدشکل افراد کو بھی ہم پاتے ہیں اور یہ چیز قانون توارث کی اہمیت بتانے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ بچے کا بدشکل ہونا بھی کیا مصیبت ہے! بدشکل بچہ بڑے گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ مختلف قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اچھا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اسے سماجی تعصب کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اگر یہ بچہ بہت ہی بدشکل ہو تو عمر تمام اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اسے بچپن کی وہ دلفریبی اور تازگی نصیب نہیں ہوتی جسے ہم سب پسند کرتے ہیں۔ یہ سب قسم کے بچے اگر ان سے اچھا اور مناسب سلوک کیا جائے تو اپنے میں سماجی دلچسپی پیدا کر لے سکتے ہیں۔

بعض مجرم غیر معمولی خوبصورت ہوتے ہیں

یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ بعض دفعہ مجرمین غیر معمولی خوبصورت لڑکے اور مرد ہوتے ہیں۔ بدصورت افراد کے متعلق اگر ہم یہ رائے قائم کریں کہ وہ قانون توارث کا شکار رہتے جسمانی نقائص رکھتے ہیں مثلاً لولے لنگڑے ہوتے یا شگاف دار تالو رکھتے ہیں تو بتائیے کہ ہم ان خوبصورت مجرمین کے متعلق کیا کہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نشو و نما ایسے حالات کے تحت ہوئی کہ ان کے لئے اپنے میں سماج سے دلچسپی پیدا کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ لاڈ سے بگڑے ہوئے بچے ہوتے ہیں۔

دو قسم کے مجرم

مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جانتے ہی نہیں کہ دنیا میں انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے اور نہ انھیں کبھی اس کا تجربہ ہوا۔ اس قسم کے مجرم کا سلوک دوسرے انسانوں سے مخالفانہ اور معاندانہ ہوتا ہے۔ وہ ہر شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی کبھی بھی کسی نے قدردانی یا تعریف نہیں کی۔

دوسری قسم لاڈلے بچے کی ہے۔ اکثر قیدیوں کو میں نے شکایت کے طور پر کہتے ہوئے سنا کہ ان کے مجرمانہ زندگی اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کی ماؤں نے انھیں لاڈ میں بگاڑ دیا۔ اس مسئلہ پر مجھے بہت کچھ کہنا چاہئے لیکن میں نے مختلف طریقوں سے یہ بات واضح کر دینے کی کوشش کی ہے کہ مجرمین کو صحیح معنی میں تعاون کی تعلیم اور تربیت نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ مجرمین کے والدین کی خواہش تھی کہ انھیں اچھے اور ہمدرد انسان بنائیں لیکن والدین کو اس کا صحیح طریقہ معلوم نہ ہو سکا۔ یا یہ کہ والدین نے آمرانہ طریقہ اختیار کیا ہوگا اور سختی کی ہوگی اس لئے انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر والدین نے لاڈ کیا اور بچوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تو اس سے انھوں نے بچوں کو یہ سکھایا کہ وہ صرف اپنی زندگی کو اہم سمجھیں اور کوئی ایسی تخلیقی کوشش نہ کریں جس سے انھیں دنیا اچھی نظر سے دیکھے۔ ایسے بچے مشکلات سے کشمکش کرنے کی قابلیت کھو دیتے ہیں اور ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ کوئی ان کی طرف متوجہ رہے، کوئی ان کی مدد کرتا رہے۔ اگر آسانی سے ان کی خواہشیں پوری نہیں ہو جاتیں تو وہ ماحول کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔

چند مثالیں

اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ہم غور کرینگے کہ آیا ان مثالوں میں وہ باتیں جو اب تک بیان کی گئیں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

پہلی مثال

پہلی مثال جو بیان کی جاتی ہے وہ شیلڈن اور ایلی نر گلوئیک کی کتاب "پانچ سو مجرمین کی سوانح حیات" سے لی گئی ہے۔ اس کتاب میں سے میں نے ایک شخص "جان" کے حالات کا انتخاب کیا ہے جو پرانا پاپی تھا۔ یہ لڑکا اپنی مجرمانہ زندگی کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے:-

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں بگڑ جاؤں گا۔ پندرہ یا سولہ سال کی عمر تک میں دوسرے لڑکوں کی طرح تھا۔ مجھے کھیل اور ورزش کا شوق تھا اور میں ان میں حصہ لیا کرتا تھا۔ کتب خانے سے کتابیں لے کر پڑھا کرتا۔ میرا وقت اچھا گزرتا تھا۔ میرے ماں باپ نے مجھے مدرسے سے نکال کر کام پر لگا دیا وہ مجھے پچاس سینٹ دے کر میری باقی سب ہفتہ وار اجرت لے لیا کرتے تھے" اس بیان میں وہ ایک الزام لگا رہا ہے۔ اگر ہم اس کے اور

اس کے ماں باپ کے تعلقات کے متعلق سوال کریں اور فیاملی میں اس کا موقف کیا تھا معلوم کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ گھر میں اس پر کیا گزری۔ فی الحال ہم یہ سمجھیں گے کہ اس کے ماں باپ نے اس سے تعاون نہیں کیا۔

(سلسلہ بیان) "میں ایک سال تک کام کرتا رہا اس کے بعد ایک لڑکی کے پاس آنے جانے لگا۔ لڑکی کھیل تماشے کی شوقین تھی اور اپنا وقت مزوں میں گزارنا چاہتی تھی" مجرمین کی زندگیوں میں ہم اکثر یہ بات پاتے ہیں کہ وہ ایسی لڑکیوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں جو پرلطف زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔ یاد ہو گا کہ یہ چیز ہم نے پہلے بیان کر دی ہے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے تعاون کی صلاحیت کی حد معلوم کر لی جا سکتی ہے۔ یہ لڑکا بھی ایک ایسی لڑکی سے تعلق پیدا کر لیتا ہے جو مزے کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور لڑکے کے پاس صرف پچاس سینٹ رہتے ہیں لہذا ہم اس صورت کو محبت اور عشق کے مسئلہ کا صحیح حل نہیں کہہ سکتے۔ دوسری لڑکیاں بھی تھیں جن سے وہ محبت کر سکتا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ وہ صحیح راستے پر نہ تھا۔ ان حالات کے تحت اگر میں ہوتا تو کہتا کہ اگر لڑکی ہمیشہ مزے اڑانا چاہتی ہے تو یہ میرے لئے موزوں نہیں ہے۔ زندگی میں کونسی چیز اہم ہے اس کے متعلق لوگوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں۔

(سلسلہ بیان) "ان دنوں پچاس سینٹ میں ایک لڑکی کو کھیل تماشے دکھانا کھلانا پلانا ناممکن ہے۔ بوڑھا (یعنی باپ) مجھے پچاس سینٹ سے ایک جبہ زیادہ نہ دیتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا دکھ ہوتا تھا اور میں اس فکر میں رہتا تھا کہ میں اور روپیہ کس طرح حاصل کروں"

یہ لڑکا عقل سلیم رکھتا تو کہتا کہ میں کچھ اور کام تلاش کروں گا اور اس کے ذریعہ سے مزید روپیہ کماؤں گا لیکن وہ کسی آسان طریقے سے روپیہ حاصل کرنے کی فکر میں ہے اور یاد رہے کہ اس کا لڑکی سے دوستی محبت قائم رکھنا خود اس کی خوشی اور خواہش کی تکمیل کے لئے ہے۔

(سلسلہ بیان) "ایک روز ایک شخص سے میری پہچان ہو گئی"۔

اب جب کہ اس ڈراما میں ایک اجنبی شخص آگیا تو اس لڑکے کی اور آزمائش شروع ہوگئی۔ ایک ایسے لڑکے کو جو تعاون کی قابلیت رکھتا ہو آسانی سے بہلایا نہیں جاسکتا لیکن اس لڑکے نے اب ایسا راستہ اختیار کرلیا ہے کہ اسے آسانی سے بہلایا جاسکتا ہے۔

(سلسلہ بیان) "یہ اجنبی شخص گرگ جہاں دیدہ تھا یعنی پکا چور۔ ایک عیار اور چالاک شخص اور اپنے کام میں خوب ماہر اور اس کے علاوہ لینے دینے والا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر بستی میں خوب چوریاں کیں اور اس وقت سے میری چوری کا سلسلہ جاری رہا۔"

مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکے کے ماں باپ ذاتی گھر رکھتے ہیں۔ باپ ایک کارخانے کا فورمین (مزدوروں کا صدر) ہے۔ فیملی کی مالی حالت ایسی ہے کہ مشکل سے آمدنی گھر کے اخراجات کے لئے کافی ہوجاتی ہے۔ فیملی میں تین بچے ہیں جن میں سے ایک یہ لڑکا بھی ہے۔ سوائے اس لڑکے کے فیملی کا اور کوئی رکن مجرم نہیں ہوا۔ معلوم نہیں وہ سائنس داں جو قانون توارث کو مانتے ہیں اس مثال کو دیکھ کر کیا کہیں گے! لڑکے نے بتایا کہ اس نے پندرہ سال کی عمر میں مختلف قسم کے جنسی فعل کا تجربہ حاصل کیا۔ مجھے یقین ہے کہ بعض لوگ کہیں گے کہ یہ لڑکا غیر معمولی جنسی خواہش رکھتا ہے۔ اس لڑکے کو دوسروں سے دلچسپی نہیں ہے وہ صرف مزے اور لطف کی زندگی چاہتا ہے۔ کوئی بھی اپنی جنسی خواہش کو بڑھا لے سکتا ہے یہ چیز مشکل نہیں ہے۔ یہ لڑکا چاہتا ہے کہ اسی میں شہرت حاصل کرے۔ جنسی میدان کا سورما کہلائے۔ سولویں سال کی عمر میں وہ ایک ساتھی کے ساتھ نقب زنی اور چوری کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ چند اور باتیں معلوم ہوئیں جن سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ جو یہ ہیں کہ لڑکے کی خواہش تھی کہ فاتح کی شکل بنایا رہے۔ لڑکیاں اس کی گرویدہ رہیں۔ انھیں روپیہ دے کر اپنے قابو میں رکھے۔ وہ ایک بڑی گھیر کی ٹوپی پہنتا اور ٹائی کے عوض ایک لال رنگ کی دستی باندھتا ہے اور پرتلے میں طپنچہ لگایا رہتا ہے۔ ایک مغربی خارج البلد شخص کا نام اختیار کرلیا ہے۔ ایک شیخی باز لڑکا ہے اور خود کو بڑا سورما بتانا چاہتا ہے۔ اس نے جو کچھ قصور کیا اس کا اقرار کرلیا بلکہ اس سے زیادہ باتیں قبول دیں مثلاً یہ کہ لوگوں کا مال چرا لینے میں اس کو ذرا تامل نہیں ہوتا۔ اس کے

خیال میں دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں ہے۔ وہ عام انسانوں کے لئے اپنے دل میں سوائے حقارت کے اور کچھ نہیں رکھتا۔ یہ تمام بظاہر شعوری خیالات ہیں لاشعوری نہیں ہیں۔ یہ لڑکا انھیں سمجھ نہیں سکتا اور نہیں جانتا کہ ایک مربوط شکل میں ان خیالات کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی وبال ہے لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ زندگی سے کیوں بیزار ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا۔: "دنیا نے مجھے سکھایا ہے کہ کسی پر بھروسہ نہ کروں۔ لوگ کہتے ہیں کہ چور ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرا ایک ساتھی تھا میں نے اس کو چکما دیا اور پھر اس نے بدلہ لے لیا۔ اگر میرے پاس اس قدر روپیہ ہوتا جتنے کی مجھے ضرورت تھی تو میں مثل دوسروں کے دیانتدار ہوتا یعنی اگر مجھے بلا محنت اور مشقت کے میری خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی روپیہ مل جاتا تو میں یہ راستہ اختیار نہ کرتا۔ مجھے محنت مزدوری کرنا کبھی بھی پسند نہ آیا اور اب بھی مجھے اس سے سخت نفرت ہے میں کبھی کام نہ کروں گا۔" اس بیان کے آخر حصے کی ہم یہ تعبیر کر سکتے ہیں کہ گویا لڑکا کہہ رہا ہے کہ میرے جذبات اور خواہشات کا دبانا مجھ پر بے جا سختی کرنا میرے مجرمانہ زندگی اختیار کرنے کا باعث ہوا۔ مجھے مجبوراً اپنی خواہشوں کو دبانا پڑتا ہے اس لئے میں جرم کرتا ہوں یہ نکتہ غور و خوض کے قابل ہے۔

(سلسلہ بیان) "میں نے کبھی جرم کی خاطر جرم نہیں کیا بلکہ مجھے اس میں لطف آتا تھا۔ موٹر چلاتے ہوئے کسی جگہ پہونچتا وہاں چوری کرتا اور بچ کر واپس آتا۔" اس تمام کارروائی کو وہ بہادری تصور کرتا ہے اور غور نہیں کرتا کہ حقیقت میں یہ بزدلی ہے۔

(سلسلہ بیان) "اس سے پہلے جب میں ایک دفعہ پکڑا گیا تو اس وقت میرے پاس چودہ ہزار ڈالر کے زیورات تھے۔ ان زیورات کی چوری کے بعد میں فوراً اپنی داشتہ لڑکی کے پاس گیا اور صرف اتنی رقم بہنائی جتنی کہ مجھے اس کے پاس پہونچنے کے لئے چاہیئے تھی۔ پولس نے مجھے پکڑ لیا۔" یہ لوگ (یعنی چور) اپنی محبوبہ لڑکیوں کو روپیہ دیتے

ہیں اس لئے انھیں آسانی سے اپنے قابو میں لاتے ہیں اور اس کو اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

(سلسلہ بیان) "قید خانے میں مدرسہ ہے جس میں تعلیم پاؤں گا لیکن اپنی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ خود کو سماج کے لئے زیادہ خطرناک بنانے کے لئے۔ اگر مجھے لڑکا ہوتا تو میں گلا گھونٹ کر اس کا خاتمہ کر دیتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک انسان کو پالنے اور بڑا کرنے کا جرم اپنے سر لیتا۔" لڑکے کے ان آخری الفاظ سے نوع انسان سے حد درجے کی مخالفت ظاہر ہوتی ہے وہ تو دنیا میں نوع انسان کا باقی رہنا ہی نہیں چاہتا۔ اب بتائیے کہ اس شخص کی ہم کس طرح اصلاح کر سکتے ہیں؟ اس کے سوائے اور کوئی علاج نہیں کہ ہم اس کی تعاون کی صلاحیت کو بڑھائیں اور زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے میں جو غلطی کر رہا ہے وہ اُسے بتا دیں۔ اگر ہم اس کی بچپن کی غلط فہمیوں کا پتہ لگا لیں تو ہم اس کو قائل کر سکتے ہیں۔ اس نے جو بیان دیا اس میں وہ باتیں نہیں کہیں جو میں اہم سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بچپن میں اس پر کچھ ایسے واقعات گزرے جنہوں نے اسے نوع انسان کا دشمن بنا دیا۔ قیاس سے کام لیتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ یہ لڑکا اولاد اکبر ہوگا اور جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے لاڈ سے بگاڑ دیا گیا ہوگا بعد جب فیاملی میں دوسرا بچہ پیدا ہوا تو اس نے اپنی پہلی جگہ کھو دی اور اس کو اس کا صدمہ ہوا۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی بچپن کی معمولی باتیں انسان کی تعاون کی صلاحیت کو کس طرح برباد کر دیتی ہیں۔

اس لڑکے جان نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کو صدر محبس کے صنعتی مدرسے میں شریک کیا گیا تھا جہاں اس سے بہت بُرا سلوک کیا گیا اور وہ سماج کے خلاف سخت نفرت کے جذبات لئے ہوئے مدرسہ سے نکلا۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا چاہیے۔

مجرمین کو چیالنج دینا بیکار ہے

ماہر نفسیات کی نظر میں محبس میں بے رحمانہ سلوک مجرمین کو چیالنج دینا اور ان سے قوت آزمائی کرنا ہے۔ اسی طرح مجرمین جب لوگوں کو لگاتار یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ آج کل جرم کی خوب ہوا چلی ہے ہمیں اسے روکنا

چاہیئے تو وہ اس کو چیالنج سمجھتے ہیں۔ چونکہ مجرمین خود کو سورما تصور کرتے ہیں اس لئے چیالنج بڑی خوشی سے قبول کر لیتے اور اس کو اپنے لئے کھیل سمجھتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ خود سوسائٹی انھیں جرائت دلا رہی ہے اور اب بڑی مستعدی کے ساتھ جرائم کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص ساری دنیا کا مخالف ہو تو پھر اس کو ڈرانے دھمکانے سے زیادہ اور کونسی چیز مقابلے کے لئے آمادہ کر سکتی ہے؟

ضدی بچوں کو بھی مقابلے کی دعوت نہ دینی چاہیئے

ضدی بچوں کی تعلیم میں بھی ان کو مقابلے کی دعوت دینا بڑی غلطی ہے۔ بچے کہتے ہیں اچھا آؤ دیکھیں کون زبردست ہے اور کون زیادہ دیر تک مقابلے کی تاب لا سکتا ہے۔ ضدی بچے مثل مجرمین کے اپنی قوت اور طاقت کے گھمنڈ میں سرشار رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر وہ چالاکی سے کام لیں تو بازی لے جا سکتے ہیں۔ تادیب خانوں میں بھی مجرمین کو بعض دفعہ دھمکیاں دی جاتی ہیں اور یہ بہت نقصان دہ پالسی ہے۔

دوسری مثال

اب میں ایک خونی کے جسے سولی دی گئی روزنامچے سے چند باتیں بیان کرتا ہوں۔ اس خونی نے دو آدمیوں کو وحشیانہ طریقے سے قتل کیا اور قتل کرنے کے پہلے اپنے خیالات لکھ لئے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مجرمین جرم کرنے سے قبل کس طرح ذہن میں منصوبہ باندھتے ہیں۔ کوئی بھی بلا منصوبے کے جرم نہیں کر سکتا اور اس منصوبے میں خود کو حق پر ہونا ثابت کرتا ہے۔ مجرموں کے اقبال جرم کے متعلق میں نے جتنے بیان دیکھے ان میں سے ایک بیان میں بھی یہ نہ پایا کہ جرم کی نوعیت سیدھے سادے لفظوں میں بیان کی گئی ہو یا مجرم نے اپنا حق پر ہونا ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس سے سماج کے جذبات کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مجرم کو بھی سماج کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور جرم کرنے کے لئے اسے پہلے اپنے سماجی جذبات کو مار ڈالنا اور سماجی دلچسپی کی دیوار توڑ دینی پڑتی ہے۔ یہی چیز ڈاس ٹی وسکی کے قتل میں پائی جاتی ہے کہ قاتل راس کول نیکو دو مہینے تک بستر پر پڑا سوچتا رہا کہ مقتول کو مارنا چاہیئے یا نہیں۔ قاتل نے اپنے دل میں یہ سوال کر کے

خود کو قتل پر آمادہ کیا کہ میں نپولین ہوں یا ایک جوں یا طفیلی کیڑا ہوں ؟ مجرمین خود کو دھوکہ دیتے اور اسی قسم کے تصورات دل میں پیدا کر کے اپنے آپ کو جرم کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔

مجرم جانتا ہے کہ وہ غلط راستے پر ہے

حقیقت میں ہر ایک مجرم جانتا ہے کہ وہ زندگی کے مفید اور صحیح راستہ پر نہیں ہے اور زندگی کا صحیح اور مفید راستہ کیا ہے اس سے بھی وہ خوب واقف ہوتا ہے اور باوجود اس علم کے صرف بزدلی کی وجہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بزدل اس لئے ہو جاتا ہے کہ کوئی مفید کام انجام دینے کی اس میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ مجرمین اپنی عمر کے آخری زمانہ میں خود کو اپنے گناہوں کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا مختلف عذر پیش کر کے اپنے افعال کو حق بجانب قرار دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی قاتل کہتا ہے کہ مقتول اوباش تھا اور ہمیشہ بیمار رہتا تھا۔ اب روزنامچے کے اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔:

”میرے لوگوں نے مجھے حقیر و ذلیل سمجھ کر مجھ سے قطع تعلق کر لیا تھا اور میری بیماری نے میری مصیبت میں اضافہ کر کے مجھے تباہ و برباد کر دیا تھا (اس کی ناک میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی)۔ کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جو برائی کے راستے سے مجھے روک سکتی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی تکلیفوں کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس پر بھی میں اپنی حالت پر صبر اور قناعت کر سکتا تھا لیکن پیٹ کا سوال تھا۔ پیٹ کو کوئی حکم نہیں دے سکتا۔“ مجرم یہاں اپنی لاچاری اور مجبوری ظاہر کر رہا ہے۔

(سلسلہ روزنامچہ) ”میرے لئے پیشین گوئی کی گئی تھی کہ میری موت سولی سے ہو گی پس میں نے خیال کیا کہ اگر مرنا ہی ہے تو فاقوں سے مرنے یا سولی سے مرنے میں کیا فرق ہے ؟“

ایک دفعہ ایک لڑکے کی ماں نے پیشین گوئی کی کہ مجھے یقین ہے کہ ایک روز تو میرا گلا گھونٹ دیگا۔ جب لڑکا سترہ سال کا ہوا تو خالہ کا گلا گھونٹ دیا۔ پیشین گوئی اور مقابلے کی دعوت دینا دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

(سلسلہ روزنامچہ مجرم) "مجھے نتائج کی پرواہ نہیں اس لئے کہ کسی حال مجھے مرنا ہے۔ میری تو کوئی حقیقت نہیں۔ میرا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ لڑکی جسے میں محبت کرتا ہوں مجھ سے بھاگتی ہے۔" یہ قاتل اس لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس اچھے کپڑے اور روپیہ لڑکی کو دینے کے لئے نہ تھا۔ وہ لڑکی کو مثل ایک بے جان ملک کے سمجھتا تھا۔ محبت اور شادی کے متعلق اس کا یہی تصور تھا۔

(سلسلہ روزنامچہ) "میں جو کرنا چاہتا ہوں کر گزروں گا چاہے اس میں میری نجات ہو یا تباہی میرے لئے دونوں برابر ہیں۔"

میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجرمین تضاد کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی حالت بالکل بچے کی سی ہوتی ہے کہ ہر چیز انھیں مل جائے یا کچھ بھی نہ ملے یہ قاتل بھی وہی بات کہہ رہا ہے کہ "فاقہ کشی یا سولی" "نجات یا ہلاکت"۔

(سلسلہ روزنامچہ) "میں نے جمعرات کا دن مقرر کیا۔ مقتول کا انتخاب کر لیا اور اب موقع کا منتظر رہا اور دل میں کہتا رہا کہ جب قتل ہوگا تو ایسا بڑا کام ہوگا جو ہر شخص نہیں کر سکتا چھری لی اور اچانک حملہ کر کے مقتول کا کام ختم کر دیا۔"

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ خونی خود کو بڑا بہادر تصور کرتا ہے۔ قتل کے بعد اس نے روزنامچے میں لکھا ہے:-

"جیسا کہ چرواہا اپنی مینڈیوں کو ہانکتا ہے ویسا ہی بھوک انسان کو برے سے برے جرم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں کل کا دن بھی نہ دیکھ سکوں لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ بھوک کی تکلیف سے بدتر اور کوئی تکلیف نہیں اور پھر میری بیماری نے میری زندگی کو تلخ کر دیا ہے۔ اب آخری تکلیف یہ ہوگی کہ لوگ قتل کے مقدمہ کا تصفیہ کرنے بیٹھیں گے۔ ہر شخص کو اپنے کرتوت کی سزا بھگتنی چاہیئے۔ بھوک سے مرنے سے تو سولی پر چڑھ جانا بہتر ہے۔ اگر میں فاقوں سے مر جاؤں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں لیکن اب عدالت میں مجمع ہوگا اور ممکن ہے کہ کوئی میرے لئے اظہار افسوس بھی کر دے۔ کوئی شخص بھی کبھی اس قدر خائف نہ ہوگا جتنا کہ آج کی رات میں خائف ہوں۔"

بیان کے آخری حصے سے ظاہر ہوا کہ جیسا کہ وہ خود کو بہادر اور سورما سمجھتا تھا ویسا نہیں ہے۔ جب اس پر جرح کی گئی تو کہا:

”اگرچہ میں نے مقتول کے جسم کے کسی نازک اور اہم حصے پر وار نہیں کیا لیکن میں نے قتل کیا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے سولی دی جائے گی۔ مقتول بہت ہی اچھے کپڑے پہنا ہوا تھا اور میں جانتا تھا کہ مجھے کبھی ایسے کپڑے نہیں مل سکتے۔“

اس بیان میں قاتل نے بھوک اور فاقہ کشی کو قتل کی وجہ نہیں بتائی بلکہ کپڑوں کا ذکر کیا ہے۔ اب کپڑے اس کے ذہن نشین ہو گئے۔

(سلسلہ روزنامچہ) ”قتل کرتے وقت مجھے معلوم نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“ مجرمین اکثر اسی قسم کی باتیں بناتے ہیں۔ بعض دفعہ مجرمین جرم کرنے سے پہلے شراب پی لیتے ہیں۔ تاکہ جرم کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی دلچسپی اور احساس کی دیوار توڑ کر نکلنے کے لئے مجرمین کو کس قدر کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر مجرم کی زندگی کے حالات میں یہ سب چیزیں نظر آئیں گی جو اس خونی کے بیان سے میں نے بتائے۔

مجرم کی اصلاح کس طرح کی جاسکتی ہے

اب ہمارے لئے حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہم کریں کیا؟ تقریباً ہر مجرم کی زندگی کے حالات سے ہم یہ بات معلوم کر لے سکتے ہیں کہ وہ اس امر کی بے حد کوشش کرتا ہے کہ دوسروں پر برتری حاصل کرلے حالانکہ اس کو سماج سے دلچسپی رہتی ہے اور نہ تعاون کی تربیت اس نے پائی۔ مجرم کا مثل خلل اعصاب کے مریض کے صرف ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ ہم اس میں تعاون کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ میں اس نکتہ پر جتنا بھی زور دوں کم ہوگا۔ اگر ہم مجرم کے دل میں انسانی فلاح اور بہبود کا خیال پیدا کر دیں اگر ہم اس میں نوع انسان سے دلچسپی پیدا کر دیں۔ اگر ہم اس کو تعاون کی تربیت دے دیں۔ اگر ہم اسے دوسروں سے مل جل کر زندگی کے مسائل حل کرنے کا عادی کر دیں تو سمجھ لو کہ ہمارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اگر ہم ایسا کرنے میں ناکامیاب ہوئے تو پھر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔

جیسا کہ مجرم اپنے مسائل کی مشکل کی وجہ سیدھے راستے پر نہیں آسکتا اسی طرح ہم مجرم کے لئے اس کے مسائل کو آسان کر کے اس کو صحیح راستے پر نہیں لگا سکتے۔ مجرم کو صرف یہ کہتے رہنے سے کہ وہ غلطی پر ہے اور اس سے بحث کرنے سے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ کئی سال سے وہ دنیا کو اسی طرح دیکھتا آیا۔ (یعنی کئی سال سے اس کا طریقہ زندگی غلط رہا)۔ اگر ہم اس کی اصلاح کرنا چاہیں تو ہمیں اس کی طرز زندگی کی بنیادوں پر نظر ڈالنی چاہئے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ اس کی ناکامیوں کا سلسلہ پہلے کہاں سے شروع ہوا اور کن حالات کی وجہ اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی شخصیت کی خصوصیات جب وہ چار یا پانچ سال کا تھا قائم ہو گئیں اسی وقت سے اس نے اپنے اور دنیا کے متعلق غلط خیالات اپنے ذہن میں قائم کر لئے اور غلطیاں کیں جو اب اس کی مجرمانہ زندگی میں ہمیں نظر آرہی ہیں۔ اس کی ابتدائی بچپن کی غلطیوں کو ہمیں خوب سمجھ لینا اور اس کی اصلاح کر دینی چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کی ابتدائی طرز زندگی کا غور سے مطالعہ کریں۔ بڑا ہونے کے بعد اس کے جو تجربے ہوتے ہیں اس پر جو گزرتی ہے ان تمام چیزوں کو وہ اپنی طرز زندگی کے درست ہونے کی تصدیق کے لئے پیش کرتا ہے۔ اگر اس کے تجربے اس کے منصوبوں کے لئے موزوں نہیں ثابت ہوتے تو وہ کڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ تجربوں کو مفید مطلب بنا لیتا ہے۔ اگر کسی شخص کا طرز زندگی یہ ہو کہ وہ ہمیشہ یہ تصور کرتا ہے کہ لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے ذلیل کرتے ہیں تو ایسا شخص اپنے اس تصور کے درست ہونے کی تائید میں بہت کچھ شہادت فراہم کر لیتا ہے۔ وہ تو شہادت کی تلاش میں رہتا ہے لیکن فریق مخالف کو اس کی اطلاع تک نہیں ہوتی۔

مجرم کو صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے اور وہ اپنے ہی خیالات میں مست رہتا ہے۔ اس کا دیکھنے اور سننے کا طریقہ ہی خاص ہوتا ہے اور ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا جو اس کی قائم کردہ طرز زندگی کی تائید میں نہیں ہوتے۔ ہم تاوقتیکہ مجرم کی مختلف تعبیروں کی کنہ نہ معلوم کریں۔ اس کی تربیت کا

حال دریافت نہ کرلیں اور اس کی ابتدائی طرز زندگی سے آگاہ نہ ہو جائیں ہم اس کو کسی طرح قائل نہیں کر سکتے۔

جسمانی سزا مفید کیوں نہیں ہوتی

منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کیوں جسمانی سزا پر اثر نہیں ہوتی۔ مجرم سزا کو سماج کی اپنے سے مخالفت سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے سماج سے میرا تعاون کرنا ناممکن ہے۔ ممکن ہے کہ مدرسے میں بھی اس پر یہی گزری ہو۔ چونکہ بچپن میں اس نے تعاون کی تربیت نہیں پائی تھی اس لئے مدرسے میں اس کا کام خراب رہا یا جماعت میں اس کا چلن بُرا رہا اس کو ملامت کی گئی اور سزا دی گئی اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سزا سے وہ ’تعاون‘ کی جانب مائل ہوا یا سزا نے صورت حال کو بدتر کر دیا؟ اور اس نے محسوس کیا کہ سب لوگ اس کے خلاف ہیں؟ ہم میں سے کون ایسا ہے جو ایسا موقف پسند کرے گا جہاں ہمیشہ برا بھلا سننے یا سزا پانے کی امید رہے۔

مدرسے میں بچوں کو سزا دینا۔

جب بچے کو مدرسے میں سزا پانے کا ڈر ہو تو اس کا رہا سہا بھروسہ بھی جاتا رہتا ہے۔ مدرسے کے کاموں سے۔ مدرسین اور ہم مکتب والوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ مدرسے سے بھاگنے اور غائب ہونے لگتا ہے اور ایسی جگہ چھپنے لگتا ہے کہ اس کا پتہ نہ چل سکے۔ ان جگہوں میں اسے دوسرے آوارہ لڑکے مل جاتے ہیں جو اسی کے راستے پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ یہ لڑکے چونکہ اسے خوب سمجھتے ہیں اس لئے اس کو ملامت نہیں کرتے بلکہ اس کی تعریف کرتے اور دل بڑھاتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار کئے ہوئے طریقہ زندگی میں بڑا نام کمائے گا۔ چونکہ یہ بچہ سماجی زندگی کے مطالبوں سے دلچسپی نہیں رکھتا اس لئے ان آوارہ لڑکوں کو اپنا دوست اور سماج کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ آوارہ لڑکے اس کو پسند کرتے ہیں اور یہ ان کی صحبت میں خوش رہتا ہے اس طرح ہزاروں لڑکے مجرموں کی ٹولیوں میں شریک ہو جاتے ہیں اور جب ہم ان کے ساتھ مجرموں کا سلوک کرتے ہیں تو اس سے ان کے اس خیال کی توثیق ہو جاتی ہے کہ

ہم سب ان کے دشمن ہیں اور صرف مجرمین ان کے دوست ہیں۔

اس قسم کے بچے کا زندگی کے کاموں میں ناکامیاب رہنا ضروری نہیں۔ ہمیں نہ چاہیے کہ ہم اس بچے کو بالکل مایوس ہو جانے دیں۔ اگر ہم مدرسوں میں ان میں اعتماد اور ہمت پیدا کرنے کا انتظام کر دیں تو ان کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ پر ہم آگے مفصل بحث کرینگے یہاں صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ مجرم سزا کو سوسائٹی کی اپنے سے مخالفت اور انتقام سمجھتا ہے جیسا کہ وہ بچپن سے سمجھتا چلا آیا۔

جسمانی سزا بے اثر ہونے کے اور بھی اسباب اور وجوہ ہیں۔ اکثر مجرمین اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔ بعض مجرمین خودکشی کے قریب ہوتے جاتے ہیں بہرحال یہ لوگ جسمانی سزا سے بالکل نہیں ڈرتے۔ مجرمین اپنے اس خیال میں کہ وہ پولیس کو نیچا دکھائیں گے۔ ایسے مست رہتے ہیں کہ جسمانی سزا سے انھیں کچھ تکلیف نہیں ہوتی اور اس چیز کو وہ اپنی طرف سے مقابلے کی دعوت کا قبول کرنا تصور کرتے ہیں۔ اگر جیل کے ملازمین ان پر سختی کرتے اور ان سے برا سلوک کرتے ہیں تو یہ بھی اپنی ضد اور ہٹ کی انتہا کر دیتے اور تصور کرتے کہ وہ اپنے اس عمل سے پولیس کو شکست دے رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا مجرمین ہر معاملے کی یہ تعبیر کرتے ہیں کہ وہ سماج سے برسرپیکار ہیں اور انھیں اس جنگ میں فتح حاصل کرنی ہے۔ اب اگر ہم بھی یہی تصور کرلیں تو پھر گویا ہم نے ان سے دھوکہ کھایا اور شکست کھائی۔ برقی کرسی بھی مجرمین کے لئے ایک چیلنج ہوتی ہے۔ چونکہ مجرمین کا یہ تصور ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ قوی دشمن سے ہے اس لئے جتنی سخت سزا تجویز کی جائے اتنا ہی زیادہ اپنی مکاری ظاہر کرنے کی ان میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اکثر مجرموں کا جرم کے متعلق یہی خیال ہوتا ہے مثلاً ایک مجرم جسے برقی کرسی کے ذریعہ جلا دیا جانے کی سزا دی گئی ہو اس خیال میں محو رہتا ہے کہ وہ گرفتار ہونے سے کس طرح بچ سکتا تھا مثلاً دل میں کہتا ہے کہ کاش میں مقام واردات پر اپنی عینک نہ چھوڑ دیتا۔

انفرادی نفسیات سے کام لیا جائے ہمارے لئے صرف ایک چارہ کار ہے وہ یہ کہ

ہم معلوم کرلیں کہ بچپن میں کس چیز نے مجرم کو 'تعاون' سے روکا۔ انفرادی نفسیات نے اس نامعلوم رقبہ کو ہمارے لئے کھول دیا ہے اور اب ہم صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ پانچ سال کی عمر میں بچے کا نفس ایک اکائی ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کی مختلف ڈوریاں بٹ کر ایک رسی ہو جاتی ہیں۔ توارث اور ماحول بچے کی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں لیکن ہمیں اس سے تعلق نہیں کہ بچہ دنیا میں کیا لے کر آتا ہے اور دنیا میں اس کے تجربے کیا ہوتے ہیں بلکہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے اپنے تجربوں سے کیا کام لیا۔ ان سے کیا فائدہ اٹھایا اور ان کا اس پر کیا اثر ہوا۔ ہمارے لئے اس نکتے کا سمجھنا ضروری ہے اس لئے کہ توارثی صلاحیتوں یا کمزوریوں سے ہم واقف نہیں ہیں۔ جو چیز ہمارے غور کے قابل ہے وہ صرف یہ ہے کہ بچہ جس موقف میں ہے وہاں اس کے لئے کیا امکانات ہیں اور ان امکانات سے اس نے کس قدر فائدہ اُٹھایا اور اٹھاتا ہے۔ مجرمین کی تائید میں ایک چیز ہے وہ یہ کہ مجرمین بھی ایک حد تک تعاون کرتے ہیں لیکن یہ اتنا نہیں ہوتا کہ ہماری سماجی زندگی کے مطالبوں کو پورا کرے اور اس کمی تعاون کی ذمہ دار ماں ہوتی ہے۔

ماں کا فرض

ماں کو جاننا چاہیے کہ وہ بچے کی دلچسپی کو کس طرح وسیع کر سکتی ہے۔ بچے کے دل میں پہلے اپنے سے اور بعد دوسروں سے کیوں کر دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔ ماں کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ بچہ نوع انسان اور اپنی آئندہ پوری زندگی میں دلچسپی لے سکے۔ ممکن ہے کہ ماں نہ چاہتی ہو کہ بچہ دوسروں سے دلچسپی رکھے یا ماں کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہو۔ میاں بیوی میں اختلاف ہو اور دونوں طلاق لینے کی فکر میں ہوں اور ایک دوسرے سے بدگمان لہتے ہوں اس لئے ماں بچے کو اپنے سے ہی ملا ہوا رکھنا چاہتی ہو۔ اگر حالات ایسے ہوں تو ماں بچے کو لاڈ کرتی اور بگاڑ دیتی ہے اور اسے اپنی نگرانی اور مدد کا محتاج بنائے رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں 'تعاون' کی نشو و نما کس قدر محدود ہو گی۔

بچے میں دوسرے بچوں سے دلچسپی پیدا کرنی چاہیے

بچے میں سماج سے دلچسپی پیدا

کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے کہ اس میں دوسرے بچوں سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایک بچہ ماں کا چہیتا ہو تو دوسرے بچے اس سے دوستی کرنے میں پس و پیش کرتے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور یہ صورت حال چہیتے بچے کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے اور یہی مجرمانہ زندگی کی ابتداء کا باعث ہو جاتی ہے۔ اگر فیملی کا کوئی لڑکا غیر معمولی قابلیت رکھتا ہو تو اس کے بعد کا بچہ اکثر مسئلی بچہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے نمبر کا بچہ عام طور پر بہ نسبت پہلے بچے کے زیادہ خوش مزاج اور خوش اخلاق ہوتا ہے اور بڑا بھائی محسوس کرتا ہے کہ وہ اس محبت اور توجہ سے محروم ہے جو دوسرے کو حاصل ہے۔ اس احساس کی وجہ وہ خود کو دھوکہ دے لے سکتا اور اس خیال سے مخمور کر لے سکتا ہے کہ اس سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ وہ ایسی شہادت فراہم کرنے کی فکر میں رہتا ہے جس سے اس کی اس بدگمانی کی تصدیق ہو سکے۔ بتدریج اس کا چال چلن بگڑ جاتا ہے اور اس سے سختی کی جاتی ہے اور اس کے اس عقیدے کی کہ اس سے ہمیشہ بُرا سلوک کیا گیا اور اسے عمداً پیچھے ڈال دیا گیا تائید ہو جاتی ہے۔ چونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے محروم کیا جا رہا ہے تو وہ چوری شروع کر دیتا ہے۔ پکڑا جاتا اور سزا پاتا ہے اور اس سے اس کو مزید شہادت اس بات کی مل جاتی ہے کہ اس کا کوئی چاہنے والا نہیں ہے اور سب لوگ اس کے دشمن ہیں۔

والدین بچوں کے سامنے زمانے اور لوگوں کی شکایت نہ کریں۔

جب ماں باپ بچوں کے سامنے زمانے کو برا کہتے اور بری حالات کی شکایت کرتے ہیں تو گویا بچوں کی سماجی دلچسپی کی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ماں باپ کا بچوں کے سامنے اپنے عزیزوں اور ہمسایوں کو بُرا کہنا۔ دوسروں پر اعتراضات کرنا ان کے متعلق برے خیالات یا نفرت ظاہر کرنا بچوں کو نقصان پہونچاتا ہے ایسے ماں باپ رکھنے والے بچے انسانوں کے متعلق برے خیالات رکھتے ہوئے بڑے ہوں تو کوئی تعجب نہیں اور بالآخر بچے خود ماں باپ ہی کے خلاف ہو جائیں تو بھی اچنبھا

نہ ہونا چاہیئے۔ جب سماجی دلچسپی کے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں تو صرف 'انانیت' باقی رہ جاتی ہے بچہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کیوں دوسروں کے لئے کچھ کروں اور چونکہ یہ خیال رکھتے ہوئے وہ خود اپنے مسائل زندگی حل نہیں کر سکتا تو وہ ٹال مٹول میں پڑ جاتا ہے اور کسی طرح بچ نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے کشمکش کرنا اسے مشکل معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہونچے تو اس کی پروا نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے "یہ جنگ ہے اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے"۔

مثالیں

اب میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے آپ معلوم کر لیں گے کہ مجرمانہ زندگی کی نشو ونما کس طرح ہوتی ہے۔

پہلی مثال

ایک فیملی کا دوسرے نمبر کا بچہ مشکل بچہ تھا۔ بظاہر وہ بالکل صحیح اور تندرست تھا۔ اس میں کوئی توارثی خرابیاں بھی نہ تھیں اس کا بڑا بھائی گھر میں سب کا منظور نظر تھا اور یہ چھوٹا بھائی ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ بڑے بھائی کو اس کے کارناموں میں ملا لے اور اس سے آگے بڑھ جائے گویا کہ وہ شرط دوڑ رہا ہے اور اپنے رفتار نما کو پیچھے کر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس میں سماجی دلچسپی کافی نشو ونما نہ پائی تھی۔ وہ ہر کام کی انجام دہی کے لئے ماں کا محتاج رہا کرتا تھا اور ماں سے ممکنہ خدمت لیا کرتا تھا۔ بڑے بھائی سے آگے بڑھ جانا اس کے لئے بہت مشکل تھا اس لئے کہ بھائی جماعت میں سب سے اول رہتا تھا اور یہ سب سے آخر تھا۔ اس کی دوسروں پر حکومت کرنے اور تسلط حاصل کرنے کی خواہش صاف طور پر ظاہر تھی۔ گھر کی ایک قدیم بوڑھی خادمہ کو احکام دیا کرتا اور اس کو کمرے کے اطراف پھراتا اور مثل سپاہی کے ڈرل کراتا۔ خادمہ اس کو بہت چاہتی تھی اس لئے جرنل بن کر کھیلنے دیتی تھی حالانکہ اس وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ اگر اس کو کوئی کام انجام دینا پڑتا تو یہ پریشان ہو جاتا اور اس کو مشکل بتاتا اور بالآخر انجام نہ دے سکتا تھا۔ جب

جب کبھی ضرورت ہوتی ماں سے روپیے لیتا اور ماں اس کی اس حرکت پر ہمیشہ اُسے ملامت کیا کرتی تھی۔ یکایک اس نے شادی کرلی اور اس طرح اپنی مشکلات بڑھالیں۔ اب اگر اسے کچھ خیال تھا تو یہی کہ اس نے بھائی سے پہلے شادی کرلی اور اسے وہ اپنی بڑی کامیابی سمجھتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس نے اپنا معیار زندگی بہت پست قائم کیا تھا۔ اس نے اس مضحکہ خیز طریقے سے خود کو فاتح بنانا چاہا۔ وہ شادی کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی بیوی ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ جب اس کی ماں اس کی مالی مدد پہلے کی طرح نہ کرسکی تو اس نے پیانو خریدنا اور بغیر ان کی قیمت ادا کرنے کے دوسروں کو فروخت کرنا شروع کیا اور یہ چیز بالآخر اس کے قید میں جانے کا باعث ہوئی۔ لڑکے کی اس روئداد سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی جوانی کی بری زندگی کی جڑیں بچپن میں مضبوط ہوئیں۔ اس کی بچپن سے نشوونما اس کیفیت میں ہوئی کہ اس کا بڑا بھائی اس پر ایسا چھایا رہا جیسا کہ ایک بڑا درخت چھوٹے درخت پر چھایا رہتا ہے اور اپنا سایہ ڈالتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں یہ چیز بٹھالی کہ خوش اخلاق بڑے بھائی کے مقابلے میں اس کو بدتمیز سمجھا جاتا۔ اسے ذلیل کیا جاتا اور اس سے غفلت کی جاتی ہے۔

دوسری مثال

اب میں ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں جو ایک ۱۲ سال کی لڑکی کی ہے جو بہت امنگ بھری تھی اور جسے اس کے والدین نے بگاڑ دیا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی جس سے یہ حسد کرتی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن سے رقابت گھر اور مدرسے میں ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسے موقعے بتانے کی کوشش میں رہتی جن میں کہ اس پر اس کی بہن کو ترجیح دی گئی مثلاً کہتی کہ فلاں وقت چھوٹی بہن کو زیادہ مٹھائی دی گئی اور فلاں وقت زیادہ پیسے دیئے گئے وغیرہ۔ ایک روز اس لڑکی نے اپنی ایک ہم مکتب کی جیب سے پیسے چرائے۔ پکڑی گئی اور سزا پائی۔ میں نے لڑکی کو پوری صورت حال بتادی اور اس کے ذہن سے یہ خیال کہ وہ چھوٹی بہن سے مقابلہ نہیں کرسکتی دور کردیا اور ساتھ ہی گھر والوں کو بھی سب باتیں سمجھادیں اور انھوں نے کوشش کر کے بہنوں کی باہمی رقابت روک دی اور حتی الامکان ظاہر نہ ہونے دیا کہ

چھوٹی بہن کو اس پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ۲۰ سال قبل گزرا۔ اب یہ لڑکی ایک دیانت دار عورت ہے۔ اس کی شادی ہو چکی اور ایک بچے کی ماں ہے۔ اس وقت سے زندگی میں اس سے کوئی سخت لغزش یا غلطی واقع نہیں ہوئی۔

خلاصۂ بیان

میں نے وہ تمام مواقف بتا دیئے جو بچوں کی نشوونما کے لئے بے حد خطرناک ہوتے ہیں اب میں مختصر طور پر انھیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان مواقف کی اہمیت ظاہر کر دینا اس لئے ضروری ہے کہ اگر انفرادی نفسیات کے نتائج صحیح ہیں تو پھر ان مواقف کے اثرات مجرم کی زندگی پر جو پڑتے ہیں ان کا علم ہمارے لئے ضروری ہے ہم اس علم کے بعد ہی مجرم کو تعاون کی زندگی اختیار کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ان بچوں کی جو مشکلات رکھتے ہیں تین قسمیں ہوتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:—

(۱) ناقص اعضاء رکھنے والے بچے یعنی معذور۔

(۲) لاڈلے بچے۔

(۳) وہ بچے جن کی نگرانی اور پرورش نہیں کی جاتی یعنی آوارہ۔

(۱) معذور بچے محسوس کرتے ہیں کہ فطرت نے انھیں ان کے پیدائشی حق سے محروم کر دیا ہے۔ ایسے بچوں کو اگر شروع سے ہی دوسروں سے دلچسپی رکھنے کی بطور خاص تربیت نہ دی جائے تو یہ اپنے آپ میں محو اور غرق ہو جاتے ہیں۔ دوسروں پر حکومت کرنے کے موقعے تلاش کرنے لگتے ہیں۔ میں نے خود ایک واقعہ دیکھا کہ ایک لڑکا جس کے عشق و محبت کے اقدامات کو ایک لڑکی نے روک دیا اور اس سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے انکار کر دیا اسے اپنی لئے ذلت کا باعث سمجھ کر ایک لڑکے کو جو اس سے زیادہ احمق تھا لڑکی کو مار ڈالنے پر آمادہ کیا۔

(۲) لاڈلے بچے ہمیشہ ماں باپ سے چمٹے رہتے ہیں اور باقی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

(۳) آوارہ بچے۔ دنیا میں کوئی ایسا بچہ نہیں ہوتا جس کی مطلق نگرانی اور پرورش نہ کی گئی ہو۔ پیدائش کے بعد چند مہینوں تک اگر بچے کی نگرانی نہ کی جائے

تو بچہ زندہ نہیں رہ سکتا تاہم یتیموں۔ ناجائز اولاد۔ لاوارث اور معذور بچوں کو غفلت کردہ یا آوارہ بچے کہہ سکتے ہیں۔

مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو بچپن میں بدشکل اور آوارہ تھے۔ دوسرے وہ جو خوبصورت اور لاڈلے تھے۔

جب کبھی مجھے مجرمین سے ملنے کا موقع ملا یا کتابوں اور اخباروں میں میں نے جرائم کے بیان پڑھے تو میں نے ہر مجرم کی شخصیت کی اٹھان معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہونچا کہ انفرادی نفسیات ہی وہ علم ہے جو مجرم کے حقیقی حالات پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

قدیم جرمن کتاب سے چند مثالیں

اب میں ایک قدیم جرمن کتاب سے جس کا مصنف انٹن فان فیورباش ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ پرانی کتابوں ہی میں مجرمانہ نفسیات کے بہترین بیانات پائے۔

پہلی مثال

(۱) کونارڈ کے کی مثال جس نے ملازم کی مدد سے اپنے باپ کو قتل کیا۔

اس نوجوان قاتل کے باپ نے ہمیشہ اس سے غفلت برتی۔ اس کے ساتھ باپ کا سلوک بے رحمانہ رہا اور پھر وہ پورے گھر والوں کو مار پیٹ کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ نوجوان نے باپ کو پلٹا کر مار دیا۔ باپ نے عدالت میں نالش کی اور حاکم عدالت نے نوجوان کو کہا "تیرا باپ بدمعاش اور جھگڑالو ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیا سزا دوں"۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ حاکم نے نوجوان کی طرف داری کر کے اس کے لئے ایک عذر اور حیلہ فراہم کر دیا۔ گھر والوں نے ممکنہ کوشش کی کہ یہ مصیبتیں ختم ہوں لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ سب مشکلات میں مبتلا تھے اور ان پر ایک مایوسی طاری تھی۔ باپ نے ایک آوارہ عورت کو گھر میں رکھ لیا اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ لڑکے کی ایک ایسے مزدور سے دوستی ہوئی جسے مرغیوں کی آنکھیں نکال کر اندھا کر دینے کا شوق تھا۔ اس مزدور نے نوجوان کو رائے دی کہ باپ کا خاتمہ کر دے۔ لڑکے نے پہلے تو ماں کے خیال سے پس وپیش کیا لیکن جب حالات بدتر ہوگئے تو بڑی سوچ بچار کے بعد

راضی ہوگیا اور مزدور کی مدد سے باپ کو مار ڈالا۔ اس مثال میں ہم دیکھیں گے کہ لڑکے کی سماجی دلچسپی کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ اُسے وہ باپ تک بھی پھیلا نہ سکا۔ لڑکے کو ماں سے بہت محبت تھی اور اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ایک اور بات اس مثال سے معلوم ہوتی وہ یہ کہ اس لڑکے میں تھوڑی سی جو سماجی دلچسپی تھی اس کو دور کرنے کے لئے اس کے مزدور دوست کو اسے پھسلانا اور جرم کی اہمیت کم کرکے بتانا پڑا تب وہ راضی ہوا۔ اور پھر جب ظالم اور سنگ دل مزدور دوست سے اسے مدد ملی تو اس نے جرم کرنے کے لئے کمر باندھی۔

دوسری مثال

(۲) مارگرِٹ زُوان زِی گر کی مثال جو لوگوں کو زہر دے کر مارتی تھی۔

یہ ایک خیراتی لڑکی تھی یعنی اس کی پرورش خیرات سے ہوئی تھی۔ یہ پست قد۔ لنگڑی اور کوبڑی تھی لہذا جیا کہ انفرادی نفسیات بتاتی ہے خودپسند اور خودنما تھی۔ ہمیشہ کوشاں رہتی کہ دوسروں کی توجہ حاصل کرے۔ بیحد خلیق تھی۔ متعدد عشقیہ رومانس کے بعد جب وہ بالکل ناامید ہوگئی تو ایک عورت کو زہر دینے کی تین کوششیں کیں تا یہ مر جائے تو اس کے شوہر کو اپنے قبضے میں کرلے۔ اسے کامیابی نہیں ہوئی اور وہ سمجھ نہ سکی کہ کیا کرے۔ اس نے بہانہ کیا وہ حاملہ ہوگئی ہے اور پھر مردوں کو اپنا کرنے کی خاطر خودکشی کی کوشش بھی کی۔

مجرمین بڑے شوق سے اپنی حالات زندگی لکھتے ہیں چنانچہ یہ لڑکی لکھتی ہے:

”جب کبھی میں کوئی برا کام کرتی تو مجھے خیال آتا تھا کہ مجھ پر تو کوئی ترس کھانے والا نہیں ہے تو پھر میں کیوں دوسروں پر ترس کھاؤں“ لڑکی نے اپنے اس خیال سے بغیر جاننے کے انفرادی نفسیات کے نظریوں کی تصدیق کردی ہے لڑکی کے ان الفاظ سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ کس طرح جرم کرنے کے لئے خود کو تیار کرتی تھی۔ اور اپنے فعل کی برائی کو کم سمجھنے کی کوشش کرتی تھی جب اس قسم کے لوگ علاج کے لئے میرے پاس آتے ہیں اور میں انھیں سمجھاتا ہوں کہ وہ دوسروں سے دلچسپی پیدا کریں اور ان سے تعاون کریں تو عام طور سے مجھے یہ جواب دیتے ہیں کہ ”لیکن دوسرے ہم سے کوئی دلچسپی

نہیں رکھتے" میں انھیں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ کسی کو تو ابتداء کرنی چاہیے۔ اگر دوسرے تعاون نہیں کرتے تو تم کو اس سے کیا۔ میرا مشورہ تمہیں یہ ہے کہ تم ابتدا کرو چاہے دوسرے تعاون پسند ہوں یا نہ ہوں۔

(۳) ایک لڑکے - ین - یل اولاد اکبر کی مثال۔

تیسری مثال یہ لڑکا ایک پاؤں کا لنگڑا تھا۔ باپ کے عوض ماں اور چھوٹے بھائی کا نگران تھا۔ ایک زمانے تک سیدھے راستے پر رہا اس کے بعد اس کی حالت بدل گئی۔ اس کو برتری کی خواہش ہو گئی اور اس نے حاکمانہ رنگ دکھانا شروع کیا یہاں تک کہ ایک روز ماں کو یہ کہکر کہ "دور ہو لے وحشی عورت" گلیوں میں بھیک مانگنے کے لئے گھر سے نکال دیا۔ ہمیں اس نوجوان پر افسوس آتا ہے کہ اسے اپنی ماں سے تک دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اگر ہمیں اس کے بچپن کے حالات معلوم ہوتے تو ہم بتا سکتے کہ اس نے مجرمانہ زندگی بتدریج کس طرح اختیار کر لی۔ ایک عرصے تک یہ نوجوان بیکار رہا اور ہاتھ خالی ہو گیا۔ امراض خبیثہ میں بھی مبتلا ہو گیا۔ ایک روز وہ کام کی تلاش میں نکلا لیکن کوئی کام نہیں ملا اور گھر آکر چھوٹے بھائی کو مار ڈالا تاکہ اس کی کمائی پر قبضہ کر لے۔ یہاں ہم معلوم کر لے سکتے ہیں کہ جن چیزوں نے نوجوان کو تعاون کرنے سے روکا اور جرم کرنے پر مجبور کیا وہ یہ تھیں۔ بیکاری۔ ناداری۔ امراض خبیثہ۔ انسان ایک حد تک مصائب برداشت کر سکتا اور دوسروں سے تعاون کر سکتا ہے لیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب مصائب اور تکالیف حد سے بڑھ جاتی ہیں تو پھر تعاون وغیرہ چھوڑ کر جرم کرنے پر اتر آتا ہے۔

(۴) ایک بن ماں باپ کے لڑکے کی مثال۔

چوتھی مثال اس لڑکے کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ اسے پرورش کے لئے ایک رضاعی ماں (یعنی دایہ) کے سپرد کیا گیا۔ دایہ نے حد سے زیادہ لاڈ دے کر اس کو بگاڑ دیا اور اب وہ لاڈلا بچہ قرار پایا۔ اس کی نشو و نما بری طرح ہوئی۔ وہ کام دھندے میں ہشیار تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ہر شخص اس کو اچھا سمجھے اور یہ سب کے

آگے رہے۔ دایہ کے اغوا پر اس سے عشق بازی کی پھر اس نے جھوٹ بولنا شروع کیا اور دھوکہ بازی اختیار کی۔ جہاں سے بھی ہو سکا روپیہ حاصل کرنے لگا۔ اس کے رضاعی ماں باپ متوسط درجے کے لوگ تھے لیکن اس نے شاہزادوں کا سا چلن اختیار کیا اور خوب روپیہ اڑایا اور بالآخر ایک روز اپنے رضاعی ماں باپ کو گھر سے نکال دیا۔ بری تربیت اور لاڈ کی وجہ یہ نوجوان اس قابل نہیں رہا کہ دیانت داری سے روزی کمائے اس کا نصب العین یہی ہو گیا کہ جھوٹ اور دھوکے کی زندگی بسر کرے۔ وہ ہر شخص کو اپنا مخالف سمجھتا اور اس پر قابو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ اس کی رضاعی ماں نے اس کو اپنی اولاد اور اپنے شوہر سے زیادہ چاہا اس لئے اس میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہر چیز پر اس کو حق حاصل ہے ہر چیز اس کو مل جانی چاہیئے۔ اس کی نالائقی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ معمولی طریقوں کے ذریعے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہم نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ کسی بچے کا یہ احساس کم تری رکھنا کہ تعاون اختیار کرنا اس کے لئے بے کار ہو گا کوئی معقول وجہ نہیں رکھتا۔ مسائل زندگی کے حل کرنے میں کسی انسان کو بھی ناکامیاب نہ ہونا چاہیئے۔

مجرم اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے غلط ذریعے اختیار کرتا ہے۔ پس چاہیئے کہ ہم اسے بتا دیں کہ اس نے غلط طریقے اختیار کئے ہیں اور ایسا کیوں کیا ہے اس کی وجہ بھی بتا دیں اور پھر اس کو ایسی تربیت دیں کہ اس میں دوسروں سے دلچسپی رکھنے اور تعاون کرنے کی ہمت آجائے۔

اگر دنیا کو معلوم ہو جائے کہ جرم کرنا بزدلی ہے نہ کہ بہادری تو مجھے یقین ہے کہ پھر مجرمین جرم کرنے کو اچھی چیز نہ ثابت کر سکیں گے اور نہ کوئی بچہ مجرمانہ زندگی اختیار کرنا پسند کرے گا۔ تمام فوجداری کے مقدموں میں چاہے وہ صحیح طور پر بیان کئے گئے ہوں یا نہیں ہم مجرمین کی ابتدائی غلط طرز زندگی کا اثر نمایاں پاتے اور معلوم کر لے سکتے ہیں کہ غلط طرز زندگی کی وجہ ان میں تعاون کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔

میں پھر کہتا ہوں کہ تعاون کی تربیت ضروری ہے۔ تعاون کی قابلیت کو

توارث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر انسان میں تعاون کی امکانی قوت ہوتی ہے اور یہ فطری ہوتی ہے۔ یہ قوت تربیت اور کوشش سے بڑھتی ہے۔

جرم کے متعلق جتنے نظریئے پیش کئے گئے ہیں وہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں البتہ اگر کوئی ہمیں یہ بتا دے کہ کوئی شخص تعاون کی قابلیت رکھنے کے باوجود مجرم ہوگیا تو ہم ان نظریوں پر غور کرنے آمادہ ہوں گے۔ میں نے تو کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ کسی سے سنا کہ اس نے کوئی شخص ایسا دیکھا جو تعاون کی صلاحیت رکھتے ہوئے مجرم ہوگیا ہو۔ پس جرم کو روکنے کا صحیح علاج یہی ہوگا کہ تعاون کی تعلیم اور تربیت دی جائے۔ جب تک کہ دنیا اس نظریئے کو مان نہ لے مجھے امید نہیں کہ اسے جرائم کی مصیبت سے نجات ملے گی۔

تعاون کی تعلیم ہم اسی طرح دے سکتے ہیں جیسا کہ جغرافیہ کی تعلیم دی جاتی ہے اس لئے کہ وہ ایک سچی اور حق بات ہے اور حق بات ہر وقت سکھائی جاسکتی ہے۔ اگر کسی بچے یا نوجوان کا ہم جغرافیہ میں امتحان لیں اور اس نے امتحان کی پہلے سے تیاری نہ کی ہو تو وہ یقیناً ناکامیاب ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی بچے یا نوجوان کی ان مواقف میں آزمائش کی جائے جہاں تعاون کا علم ضروری ہے تو وہ اگر پہلے سے تیار نہ ہو تو ناکامیاب رہے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے تمام مسائل کا حل تعاون کی استعداد پر منحصر ہوتا ہے۔

ہم نے مسلہ جرم کی سائنسی تحقیق ختم کی اب ہم کو جرات کے ساتھ حقیقت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ہزاروں برس گزر گئے لیکن جرم کی روک تھام کا کوئی مفید طریقہ معلوم نہ ہوسکا۔ اب تک جو طریقے اختیار کئے گئے وہ سب ناکامیاب ہوئے اور اب بھی جرائم کا سلسلہ جاری ہے۔ ہماری تحقیق نے ہمیں بتا دیا کہ کیوں اب تک اس بارے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ صحیح کارروائی کبھی بھی نہیں کی گئی جو یہ تھی کہ مجرم کی طرز زندگی کو بدل دیا جائے اور اس کو غلط طرز زندگی اختیار کرنے سے روکا جائے اس کے سوائے اور کوئی تدبیر جرم کی روک تھام کے لئے کارگر نہیں ہوسکتی۔

اب ہم اپنی تحقیق کے نتائج کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ ہم نے معلوم کرلیا کہ مجرم نوع انسان سے جدا نہیں ہوتا وہ بھی مثل دوسرے انسانوں کے ایک۔ انسان ہوتا ہے۔ اس کا چلن دوسرے انسانوں کے چلن کے مطابق ہوتا ہے لیکن اپنی ایک خاص قسم ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔ یہ ایک اہم بات ہے۔ اگر ہم سمجھ جائیں کہ جرم اپنے طور پر ایک جدا چیز نہیں ہے بلکہ کسی شخص کی ایک خاص طرز زندگی کی علامت ہے اور ساتھ ہی اگر ہم معلوم کرلیں کہ یہ خاص طرز زندگی کیوں اختیار کیا گیا تو ہم انسداد جرائم کے مسئلہ کو لاینحل نہ سمجھیں گے بلکہ پورے یقین کے ساتھ کہ اصلاح ممکن ہے اپنا کام شروع کریں گے۔

ہم نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ مجرم خود کو لاتعاونی خیالات اور افعال کا عادی کرلیتا ہے اور اس کی یہ عادت بچپن یعنی چار یا پانچ سال کی عمر سے نشوونما پاتی چلی آتی ہے۔ عمر کے ان ابتدائی سالوں میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے جو تعاون کرنے اور دوسروں سے دلچسپی رکھنے کی صلاحیت کی نشوونما روک دیتی ہے ہم نے بتادیا کہ کس طرح یہ رکاوٹیں بچے کی ماں اس کا باپ۔ دوسرے بچے۔ سماجی تعصبات۔ ماحول کی مشکلات ہوسکتے ہیں۔

ہم نے معلوم کرلیا کہ مختلف قسم کے مجرمین اور ان لوگوں میں جو زندگی میں ناکامیاب ہوئے ایک ہی علت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ان سب میں تعاون۔ دوسروں سے دلچسپی اور نوع انسان کی بھلائی کے خیال کا وجود نہیں ہوتا۔ اب اگر ان لوگوں کا علاج ہے تو وہ یہی ہے کہ ان میں تعاون کی صلاحیت پیدا کردی جائے اور اس کو بڑھایا جائے۔ اس کے سوائے اور کوئی تدبیر ایسی نہیں کہ جو مفید ثابت ہو۔ ہر چیز کا انحصار صرف اس ایک چیز پر ہے کہ تعاون کی قابلیت کیسی ہے۔

مجرم اور دوسرے ناکامیاب افراد میں یہ فرق ہے کہ مجرم تعاون کے خلاف ایک عرصے تک مسلسل تربیت پانے کی وجہ ناکامیاب افراد کے مانند مسائل اور مشاغل زندگی میں کامیاب ہونے کی توقع نہیں رکھتا لیکن بہ نسبت ان کے تھوڑی قوت عمل اس میں

باقی رہتی ہے اور اس قوت کو وہ غلط طور سے استعمال کرتا ہے۔ زندگی کے غلط راستے پر چپتی سے چلتا اور ایک حد تک تعاون بھی کرتا ہے لیکن اس کا یہ تعاون اپنی ہی قسم کے افراد اور مجرمین سے ہوتا ہے پس اس طرح مجرم خلل اعصاب کے مریض۔ نشہ باز اور خودکشی کرنے والے سے جدا ہوتا ہے۔ مجرم کا دائرہ عمل بہت محدود ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ سوائے جرم کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کرسکتا اور جرم کے حدود بھی مقرر کرلیتا ہے یعنی ایک ہی قسم کا جرم بار بار کرتا ہے۔ اس کے عمل کی دنیا بس مختصر ہوتی ہے گویا کہ وہ تنگ کوٹھڑی میں رکھا اور مقید کردیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم میں ہمت کی کس قدر کمی ہوتی ہے اور ایسا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ ہمت تعاون کی قابلیت کا ایک جزو ہے۔

مجرم ہر وقت اپنے خیالات اور جذبات کو مجرمانہ زندگی کی تیاری میں لگایا رہتا ہے۔ دن کو وہ منصوبے باندھتا اور رات کو ان کے متعلق خواب دیکھتا ہے اور اس طرح اس تھوڑی سی سماجی دلچسپی کو جو اس میں باقی رہتی ہے فنا کردیتا ہے۔ وہ اپنے برے کرتوت کو واجبی قرار دینے کے لئے ہمیشہ عذر اور حیلے گڑھتا رہتا اور جرم اختیار کرنے کے وجوہ بیان کرتا ہے۔

سماجی احساس کی دیوار کا توڑنا آسان نہیں بلکہ مشکل سے وہ ٹوٹتی ہے لہذا جرم کرنے کے لئے معقول وجہ پیدا کرنی پڑتی ہے۔ مجرم اہل دنیا کی ناانصافی اور ظلم کو وجہ قرار دے کر یا نشہ میں چور ہوکر سماجی احساس کی دیوار توڑتا ہے۔ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مجرم کس طرح اپنے حالات کی اپنی مرضی کے موافق تعبیر کرتا ہے اور یہ بھی ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ مجرم سے بحث کرنے سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور عمر تمام بحث کرنے تیار رہتا ہے۔ جب تک کہ ہم یہ معلوم نہ کرلیں کہ اس نے یہ رویّہ کیوں اختیار کیا ہم اس کی اصلاح نہیں کرسکتے۔ مجرم کے مقابل میں ہمیں ایک سہولت حاصل ہے جس کی وجہ وہ ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتا وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی لئے اس سے بھی ہمیں دلچسپی رہتی ہے۔

اور ہم اس کی مدد کرنے آمادہ رہتے ہیں۔

مجرم جرم کا منصوبہ اس وقت باندھتا ہے اور اس کو پورا کرنے کی تیاری کرتا ہے جبکہ وہ کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور اس سے تعاون کے ذریعے سے نجات حاصل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا بلکہ کسی آسان طریقہ سے اسے حل کر لینا چاہتا ہے۔ یہ مشکل خاص طور پر اس وقت پیش آتی ہے جب مجرم کو روپئے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثل دوسرے انسانوں کے وہ اپنی حفاظت اور برتری کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشکلات کو حل اور رکاوٹوں کو دور کرے لیکن اس کی ساری کوشش سماج کے چوکھٹے کے باہر ہوتی ہے۔ اس کا نصب العین خیالی ذاتی برتری ہوتا ہے اور اسے حل کرنے کے لئے وہ پولیس۔ قانون اور سماجی تنظیم کو شکست دینے اور فاتح ہونے کے خیال میں محو رہتا ہے۔ گویا کہ وہ ایک قسم کا کھیل کھیلتا ہے یعنی قانون شکنی کرنا اور پکڑے جانے سے بچنا۔ ایسی مکاریاں کرنا کہ کوئی اسے پکڑ نہ سکے۔ مثلاً مجرم کسی کو زہر دے کر اسے اپنی بڑی کامیابی تصور کرتا اور اس طرح اپنے نفس کو دھوکہ دیتا اور خیال خام میں خود کو مخمور کر لیتا ہے۔

پہلی سزا پانے سے پہلے عام طور سے مجرم کئی جرائم کر چکتا ہے اور پکڑا نہیں جاتا جب گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر میں زیادہ چالاکی سے کام لیتا تو پکڑا نہ جاتا۔

ان سب باتوں سے مجرم کا احساس کم تری ظاہر ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ محنت اور مشقت سے بھاگتا ہے اور دوسروں سے تعاون کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ معمولی طریقوں سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ تعاون کی تربیت نہ پانا مجرم کی مشکلات میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اکثر مجرمین بن سیکھے مزدور ہوتے ہیں۔ مجرم اپنی اس کمزوری کو ذلیل احساس برتری کے مظاہرے سے چھپانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا بہادر اور غیر معمولی انسان ہے کیا ہم ایک ایسے شخص کو جو زندگی کے میدان سے بھاگ گیا ہو سورما کہہ سکتے ہیں؟ مجرم حقیقت میں خواب کی

حالت میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ حقایق زندگی سے واقف نہیں ہوتا اور نہ واقف ہونا چاہتا ہے اس لئے کہ اگر حقائق کا علم ہو جائے تو پھر اسے مجرمانہ زندگی چھوڑنی ہو گی لہذا وہ اسی خیال میں رہتا ہے کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوں۔ میں جسے چاہوں گولی مار دے سکتا ہوں۔ یا اس کا یہ تصور ہوتا ہے کہ میں سب سے زیادہ ہشیار اور چالاک ہوں جرائم کرتا ہوں لیکن پکڑا نہیں جاتا۔

ہم نے اس چیز کی نشان دہی کر دی ہے کہ مجرمانہ زندگی کی جڑیں کب اور کہاں مضبوط ہوتی ہیں۔ مجرمین کس طرح ان بچوں میں سے پیدا ہوتے ہیں جو بچپن میں مشکلات میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں یا بے موقع لاڈ سے بگاڑ دیئے جاتے ہیں۔

ان بچوں کے لئے جو جسمانی نقائص رکھتے ہوں بڑی ضرورت ہے کہ ان میں دوسروں سے دلچسپی پیدا کر دی جائے ورنہ وہ صرف اپنے سے دلچسپی رکھیں گے اور خود غرض ہو جائیں گے اور ان کی نشو و نما صحیح طریقے پر نہ ہو گی۔

ان بچوں کا جن سے لاپروائی برتی گئی ہو۔ ان بچوں کا جن کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ ان بچوں کا جن سے سب نفرت کرتے ہوں اور ان سے کبھی کوئی تعاون نہ کرتا ہو اور انھوں نے کبھی نہ جانا کہ کوئی انھیں پسند کرتا ہے کسی کی یہ محبت حاصل کر سکتے ہیں اور زندگی کے مسائل تعاون کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں ان سب کا یہی موقف اور حال ہوتا ہے۔

لاڈلے بچوں کا تصور۔

لاڈلے بچوں کو چونکہ اپنی کوشش سے کچھ حاصل کرنے کی تربیت نہیں دی جاتی اس لئے ان میں یہ تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا صرف یہ کہہ دینا کہ ”فلاں چیز کی مجھے ضرورت ہے“ کافی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ دنیا کو چاہیئے ہمارے کہنے پر ہمارے مطالبے پورے کر دے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ان کی منہ مانگی چیزیں انھیں نہیں ملتیں تو پھر انھیں دنیا کی بدسلوکی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دوسروں سے تعاون کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر مجرم کے حالات میں ہمیں اسی

چیز کی جھلک نظر آتی ہے کہ انھوں نے تعاون کی تربیت نہیں پائی۔ ان میں تعاون کی صلاحیت نہیں ہے اور جب مسائل زندگی سے یہ دچار ہوتے ہیں تو انھیں سوجھائی نہیں دیتا کہ انھیں کیسا حل کریں۔ پس ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے ہمیں انھیں تعاون کی تربیت دینی چاہیے۔

مجرمین کا کس طرح علاج ہوسکتا ہے

مجرمین کا علاج ہمیں معلوم ہوگیا اور اس بارے میں ہمیں کافی تجربہ بھی ہوچکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ انفرادی نفسیات کے ذریعے ہر مجرم کی اصلاح کی جاسکتی ہے لیکن غور کیجئے کہ ہر مجرم کا ایسا علاج کرنا کہ اس کا طرز زندگی بدل جائے کس قدر بڑا کام ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے کلچر میں اکثر لوگ جب مشکلات میں پھنس جاتے ہیں تو تعاون کی صلاحیت کھودیتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سختی اور مصیبت کے زمانے میں مجرمین کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تعاون کی تربیت کے ذریعے جرم کو دور کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں پوری نوع انسان کو تربیت دینی ہوگی۔ اگر ہم مجرم یا احتمالی مجرم کو اپنے موافق بنالینا اپنا مقصد قرار دے لیں تو میرے خیال میں اس میں ہم کامیاب نہ ہوں گے اس لئے کہ یہ چیز عملاً بہت مشکل ہے تاہم بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ہر ایک مجرم کی حالت بدل نہ سکیں تو ان لوگوں کی تو کچھ مدد کرسکتے ہیں جو مشکلات کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے مثلاً بے روزگاروں اور ایسے لوگوں کو جو کسی صنعت اور حرفت سے واقف نہ ہوں لیکن محنت مزدوری کرنا چاہتے ہوں کام پہ لگا دیں۔ سماج کے مطالبوں کو کم کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے اور اس سے سماج کے متعدد افراد رہی سہی صلاحیت تعاون کو کھو بیٹھنے سے محفوظ رہیں گے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کرلیا جائے تو بلاشک مجرمین کی تعداد میں کمی ہوجائے گی۔ میں نہیں جانتا کہ آیا اس وقت ہمارے ملک کی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ ہم بیکار شخص کو کام پر لگاسکیں۔ ہمیں چاہئے کہ ایسی حالت پیدا کریں۔ اس کے علاوہ ہم اپنے بچوں کو ان کے آئندہ مشاغل کے لئے بہتر تعلیم دیں تاکہ وہ زندگی کا عمدگی سے مقابلہ کرسکیں اور ان کے عمل کا دائرہ وسیع ہو۔ اس قسم کی تعلیم ہمارے

قیدخانوں میں بھی دی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے بعض تدبیریں اختیار کی گئی ہیں لیکن اسمیں اور توجہ اور کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ہر ایک مجرم کا فرداً علاج کرنا ممکن نہیں ہے لیکن کئی مجرمین کو ملا کر ان کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً میری تحریک ہے کہ مجرمین کی ایک معقول تعداد کو جمع کر کے ہم ان سے سماجی مسائل پر گفتگو کریں۔ ان سے سوالات کریں ان کے جواب سنیں۔ ہم ان کے دماغوں کو روشن کریں اور انھیں گہری نیند سے بیدار کریں۔ انھوں نے اپنے ذہنوں میں دنیا کے متعلق جو غلط خیالات قائم کر لئے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو دوسروں سے کم سمجھتے ہیں اس چیز کو ہم ان کے ذہنوں سے دور کریں۔ ہم انھیں سمجھائیں کہ وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو محدود نہ سمجھیں اور زندگی کے مسائل اور مواقف کا مقابلہ کرنے سے نہ ڈریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کا علاج بیحد نتیجہ خیز اور مفید ہوگا۔

مجرمین اور مفلسوں کو چیالنج نہ دیا جائے

ہمیں چاہئے کہ ہماری سماجی زندگی میں ہم کوئی بات ایسی نہ کریں جو مجرمین مفلسوں اور محتاجوں کے لئے چیالنج ہو جائے اور وہ مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اگر کسی ملک میں بے حد مالدار اور بیحد مفلس لوگ ہوں تو مفلس افراد کے دلوں میں خلش پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقابلہ شروع کر دیتے ہیں پس ہمیں چاہئے کہ ہم مالداروں کو سمجھائیں کہ وہ اپنی شان اور شوکت دولت اور ثروت کا مظاہرہ نہ کریں۔ کسی دولت مند کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی دولت گنتا اور بتاتا رہے کہ وہ لاکھوں کا مالک ہے۔

ہم نے کند ذہن اور مسئلی بچوں کے علاج کے بیان میں بتا دیا ہے کہ اس قسم کے بچوں کو ڈرانا دھمکانا بالکل بے کار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ماحول سے برسرپیکار ہیں اس لئے انھیں نڈر اور ڈھیٹ رہنا چاہئے۔ یہی حال مجرمین کا ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے سب ممالک میں پولیس کے احکام عدالت کے احکام اور قوانین جو بنائے جاتے ہیں تقریباً وہ سب مجرمین کو مقابلے کی دعوت دیتے اور انھیں اپنا دم خم۔ اپنا جیوٹ پن دکھانے کا موقع دیتے ہیں۔ مجرمین کو ڈرانا دھمکانا نہ چاہئے بلکہ

خاموشی اختیار کرنا اور ان کے ناموں کا اعلان نہ کرنا مناسب ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارے طرز عمل میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم اس خیال کو کہ سختی کرنے یا نرمی سے مجرمین کی اصلاح ہو سکتی ہے ذہن سے نکال دیں۔ مجرم کی اصلاح جب ہی ہو سکتی ہے جب کہ وہ اپنی حالت اور اپنے موقف کو خود سمجھ لے۔ اس میں شک نہیں کہ مجرمین سے نرمی اور ہمدردی کرنی چاہیئے۔ ہم یہ خیال نہ کریں کہ مجرمین کو سزائے موت سنا کر ہم انھیں ڈرا سکتے اور وحشت زدہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا سزائے موت تو بعض وقت مجرم کو اور جیوٹ بنا دیتی ہے اور وہ خود کو ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ بعض وہ مجرمین جنہیں بجلی کی کرسی کے ذریعے جلا دیا گیا آخر وقت تک صرف اپنی ان غلطیوں کا ذکر کرتے رہے جو اُن کی گرفتاری کا باعث ہوئے۔

اگر ہم اپنی کوششیں ان لوگوں کا جو حقیقت میں جرائم کے ذمہ دار ہوتے ہیں پتہ لگانے میں تیز تر کردیں تو مفید ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ چالیس فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ مجرمین کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا اور یہ چیز مجرموں کے غلط خیال قائم کرنے اور جیوٹ ہونے کی وجہ ہوتی ہے۔ تقریباً ہر ایک مجرم گرفتار ہونے سے قبل کئی دفعہ جرم کر چکتا ہے لیکن پکڑا نہیں جاتا۔

یہ چیز بھی بہت اہم ہے کہ مجرمین کو قید کے زمانے میں یا قید سے رہا ہونے کے بعد نہ تو ذلیل کرنا چاہیئے نہ انھیں مقابلے کی دعوت دینی چاہیئے۔ مجرمین کی نگرانی کرنے والے افسروں کی تعداد اگر بڑھا دی جائے اور موزوں افراد چنے جائیں تو مفید ہوگا۔ نگرانی کرنے والے افسروں کو سماجی مسائل اور تعاون کی اہمیت سے بخوبی واقف ہونا چاہیئے۔ ان طریقوں سے ہم جرائم کی بہت کچھ روک تھام کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ان طریقوں کے اختیار کرنے کے بعد بھی جرائم کی تعداد خاطر خواہ کم نہ کر سکیں تو ہم ایک اور طریقہ اختیار کر سکتے ہیں جو بالکل عملی ہے اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنے بچوں کو تعاون کی صلاحیت کو معقول حد تک

بچوں کو شروع سے تعاون کی تعلیم دی جائے تو جرم میں کمی ہو گی

بڑھا دیں اور ان میں کافی سماجی دلچسپی پیدا کر دیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد مجرمین کی تعداد میں کمی ہو گئی۔ یہ بچے چاہے انھیں زندگی میں کتنی ہی مشکلات اور مصیبتیں کیوں نہ پڑیں کبھی کسی کے دھوکے کے جال میں نہ پھنسیں گے اور نہ کوئی انھیں ورغلا سکے گا۔ ان کی دوسروں سے دلچسپی کبھی بھی پورے طور سے مٹ نہ سکے گی اور ان کی تعاون کی اور اپنے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی قابلیت بہ نسبت ہمارے زمانے کے بچوں کے کہیں زیادہ ہو گی۔

اکثر مجرم کم عمری میں ہی مجرمانہ زندگی شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر نوجوانی سے یہ لوگ اس کام کی ابتدا کرتے ہیں اسی لئے مجرمین کی زیادہ تر تعداد پندرہ سے پچیس سال والوں پر مشتمل ہوتی ہے لہٰذا اگر ہم بچوں کو تربیت دیں تو جلد کامیاب ہوں گے۔ صرف یہی نہ ہو گا بلکہ اگر صحیح تعلیم اور تربیت پائیں تو بچے اپنے اچھے اثرات گھر کی پوری زندگی پر ڈالیں گے۔ آزادی پسند۔ دوربیں۔ رجائی اور صحت مند بچے اپنے ماں باپ کی مدد کرتے اور شانتی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس طریقے سے تعاون کی اسپرٹ جلد تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور نوع انسان کی سماجی فضائیں بیحد وسعت ہو جائے گی۔

جب ہم بچوں کو تعلیم دیں اور تربیت کریں تو ساتھ ہی ماں باپ اور مدرسین کے خیالات بھی بدلتے جائیں۔

مدرسین کی تربیت

اب جو سوال حل طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہم بچوں کی تعلیم اور تربیت کس نوبت سے شروع کریں اور کیا طریقہ اختیار کریں کہ بچے زندگی کے مشاغل اور مسائل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں؟۔ شاید ماں باپ کو پہلے تربیت دینا مناسب ہو گا؟ لیکن نہیں اس سے تحریک کے کامیاب ہونے کی زیادہ امید نہیں ہے اس لئے کہ ماں باپ پر قابو پانا ہمارے بس کی بات نہیں اور پھر وہ ماں باپ جنھیں خاص طور پر تربیت کی ضرورت ہے ہم سے کوسوں دور بھاگتے ہیں ہم ان کی صورت بھی نہیں دیکھ سکتے پس ہمیں اور کوئی راستہ نکالنا چاہیئے۔ کیا

یہ مناسب ہوگا کہ سب بچوں کو پکڑ کر ایک جگہ بند کر دیا جائے اور تمام وقت ان پر ایسی سخت نگرانی رکھی جائے کہ انھیں جرم کرنے کا موقع ہی نہ ملے؟ نہیں یہ بھی کچھ مفید تدبیر نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں ایک طریقہ ہے جو عملی ہے اور اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مدرسین کو اس طرح ٹرینڈ کریں کہ وہ بچوں کی گھر میں سیکھی ہوئی بری باتوں کی اصلاح کریں اور بچوں میں دوسروں سے سماجی دلچسپی رکھنے کی عادت ڈالیں۔ یہ مدرسے کا ایک فطری کام ہوگا۔ چونکہ بچوں کو آیندہ زندگی کے مختلف مشاغل کے لئے گھر میں تیار کرنا ممکن نہ تھا اس لئے انسان نے مدارس قائم کئے جو حقیقت میں گھر کا پھیلا ہوا ہاتھ ہوتے ہیں۔ پس کیوں نہ ہم مدارس کو نوع انسان کو زیادہ ملنسار ہمدرد اور تعاون پسند بنانے کے لئے استعمال کریں؟

اسلاف کی کوششیں

ہماری فعلیت ذیل کے خیالات پر منحصر ہونی چاہئے۔ میں ان خیالات کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔ وہ تمام سہولتیں اور مفادات جن سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں ہمارے اسلاف کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر پچھلے زمانوں میں لوگ تعاون نہ کرتے ایک دوسرے سے دلچسپی نہ رکھتے اور نوع انسان کی بھلائی کے لئے محنت اور کوشش نہ کرتے تو یہ چیز ان کے لئے مہلک ثابت ہوتی اور مر مٹنے کے بعد وہ اپنا نام و نشان نہ چھوڑتے۔ اگرچہ وہ لوگ دنیا سے چل بسے لیکن ان کے کارنامے باقی رہ گئے۔ ان کی اسپرٹ باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ اگر ہم ان اصول پر بچوں کو تعلیم دیں تو تعاون کے ساتھ کام کرنے کی فطری خواہش ان میں پیدا ہوگی۔ اگر انھیں مشکلات کا سامنا ہوگا تو وہ پیچھے نہ ہٹیں گے بلکہ ہمت کے ساتھ مشکل سے مشکل مسائل کو اس طرح حل کریں گے کہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

دسویں فصل

کام اور دھندا

تین بندھن جن میں انسان جکڑے ہوئے ہیں زندگی کے تین مسئلے پیش کرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک مسئلہ تنہا حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر مسئلے کے حل کے لئے دوسرے مسئلوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا لازمی ہے۔

پہلے بندھن کا تعلق روزگار کے لئے کام دھندا کرنے سے ہے۔ ہم اس سیارے کی سطح پر رہتے ہیں اور اس میں جو وسیلے اور ذریعے ہیں ان سے ہی ہمیں کام لینا پڑتا ہے مثلاً زمین کی شادابی۔ معدنیات اور موسم وغیرہ۔

انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان حالات کے تحت جو زمین کے وسیلے اور ذریعے پیدا کرتے ہیں زندگی کے مسئلہ کو کامیابی سے حل کرے لیکن میرے خیال میں آج تک یہ مسئلہ پوری طرح حل نہ ہو سکا۔ ہر زمانے میں نوع انسان نے ایک حد تک زندگی کا مسئلہ حل کیا لیکن ہر وقت یہی ضرورت محسوس ہوئی کہ اور ترقی کی جائے اور کار نمایاں کیا جائے۔

روزگار پیدا کرنے کے مسئلے کے حل کرنے کا بہترین ذریعہ دوسرے مسئلہ کا حل کر لینا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا دوسرا بندھن یہ ہے کہ انسانوں کا تعلق نسل انسانی سے ہے اور مختلف قوموں کو اتفاق کے ساتھ دنیا میں مل جل کر رہنا پڑتا ہے۔ اگر دنیا میں صرف ہم ہی رہتے بستے تو ہمارا طرز عمل بالکل جدا ہوتا۔ اب ہم کو تو دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہمیں دوسروں کا خیال رکھتے ہوئے ان سے دلچسپی رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنی ہے پس یہ مسئلہ دوستی محبت سے اور سماجی احساس اور تعاون کے ذریعے حل

ہوسکتا ہے۔ اگر ہم اس دوسرے مسئلے کو جو دوسرے بندھن سے تعلق رکھتا ہے کامیابی سے حل کرلیں تو سمجھ لیں کہ ہم نے پہلے مسئلے یعنی کام دھندے کے مسئلے کو حل کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کرلی۔

تقسیم کار۔

انسانوں کے آپس کے تعاون کی وجہ سے ہی ہم دنیا میں کام کی تقسیم کے اصول کو کامیابی کے ساتھ جاری کرسکے جو ایک ایسا اصول۔ ایک ایسی ایجاد ہے کہ جس پر انسان کی بھلائی منحصر ہے۔ اگر دنیا میں ہر شخص کی یہ کوشش ہو کہ بغیر تعاون کے اپنی روٹی پیدا کرلے تو نوع انسان زندہ نہ رہے گی۔ کام کی تقسیم کے ذریعے سے ہم مختلف افراد کی قابلیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے اور ان کی کارگزاریوں کی اس طرح تنظیم کرسکتے ہیں کہ ان سے نوع انسان کو فائدہ پہونچے۔ اس کی حفاظت ہو اور ہر سماج کے افراد کے لئے کام کرنے کے متعدد مواقع حاصل ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ہم یہ دعوی نہیں کرسکتے کہ کام کی تقسیم کے ذریعے جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ سب ہمیں حاصل ہوگیا اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود کام کی تقسیم کا مسئلہ پورے طور پر نشو ونما پاچکا تاہم یہ ضروری ہے کہ روزگار کا مسئلہ کام کی تقسیم سے اور ایسی متفقہ کوشش سے جس میں ہم اپنی محنت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائیں حل کیا جائے۔

کون لوگ کام سے بھاگتے ہیں۔

بعض لوگ روزگار کے مسئلے کا مقابلہ کرنے سے بچنا چاہتے ہیں۔ وہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتے اور نہ اپنا وقت کسی ایسے دھندے میں صرف کرنا چاہتے ہیں جو معمولی انسانی دلچسپیوں کے باہر ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ لوگ جو اس مسئلے سے بچنا چاہتے ہیں وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ دوسروں کی مدد چاہتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کی محنت اور مشقت سے فائدہ اٹھاتے اور زندہ رہتے ہیں لیکن خود کچھ مدد نہیں کرتے۔ یہ لاڈلے بچے کی ذہنیت ہوتی ہے۔ اس کا بچپن سے طرز زندگی ایسا قائم ہو جاتا ہے کہ جب کبھی وہ

مسائل زندگی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اپنی کوششوں سے انھیں اس کے لیئے حل کردیں اور یہی لاڈلا بچہ ہوتا ہے جو نوع انسان سے تعاون نہیں کرتا اور ان لوگوں پر جو اپنے مسائل حل کرنے میں مستعدی سے مشغول ہیں ناواجبی طور پر اپنا بوجھ بھی ڈال دیتا ہے۔

انسان کا تیسرا بندھن یہ ہے کہ وہ دو جنسوں میں سے کسی ایک جنس سے تعلق رکھتا ہے یعنی مرد ہوتا یا عورت۔ انسان کے دوسرے جنس کی طرف بڑھنے اور جنسی فرض ادا کرنے پر نوع انسان کا سلسلہ اور بقا منحصر ہے۔ مرد اور عورت کے اس تعلق سے ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور یہ مسئلہ باقی دو مسئلوں کے بغیر تنہا حل نہیں ہو سکتا۔ محبت اور شادی کے مسئلے کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کے لئے ہر انسان مجبور ہے کہ کام کی تقسیم کے ذریعے سے روزگار پیدا کرے اور سماج سے دلچسپی رکھتے ہوئے دوسرے انسانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا۔ آج کل اس مسئلہ کا بہترین حل یک زوجگی (ایک بیوی کرنا) ہے جو سماج کے مطالبے اور کام کی تقسیم کے اصول کے مطابق ہے۔ کسی شخص کی تعاون کی قابلیت اس کے اس مسئلے کے حل کرنے کی نوعیت سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس میں جس قدر تعاون کی قابلیت زیادہ ہو اتنا ہی اس مسئلہ کو عمدگی کے ساتھ حل کریگا۔ مختصر یہ کہ تینوں مسئلے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ تینوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ ایک مسئلے کا حل دوسرے مسئلوں کے حل میں مدد دیتا ہے اور دیکھو تو حقیقت میں سب کا ایک ہی موقف ہے اور یہ ایک ہی مسئلہ ہے جس کے تین مختلف نظارے ہیں۔ انسان کی ساری کوششیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے اس میں زندہ رہے اور ترقی کرے اس کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔

ہم پھر کہہ دیتے ہیں کہ وہ عورت جو ماں بن کر نوع انسان کی بقا میں مدد کرتی ہے کام کی تقسیم میں سب سے زیادہ اور بلند تر حصہ لیتی ہے۔ اگر کسی عورت کو اپنے بچوں سے دلچسپی ہو۔ وہ اچھے انسان بننے میں ان کی مدد کر رہی ہو۔ انھیں دوسروں سے دلچسپی رکھنے اور تعاون کرنے کی تربیت دے رہی ہو تو یقین مانئے کہ وہ ایسی قیمتی خدمت ادا کر رہی

ہے کہ جس کا کوئی معاوضہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے کلچر میں ماں کے کام کی کافی قدر نہیں کی جاتی بلکہ وہ بے کار اور ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ماں کو اس کام کا معاوضہ بلاواسطہ مل جاتا ہے۔ وہ عورت جو اپنے اس فرض کی ادائی میں مشغول رہتی ہے دوسروں کی مالی مدد کی محتاج رہتی ہے۔ فیاملی کی زندگی کی کامیابی ماں اور باپ دونوں کے کام پر منحصر ہوتی ہے اگر ماں خانہ داری کا کام انجام دیتی ہے تو اس کا یہ کام باپ کے کام سے کم تر نہیں سمجھا جا سکتا۔

بچوں میں کام کاج سے دلچسپی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ ماں کا اثر ہوتا ہے۔

بچوں کی ۴ یا ۵ سال کی عمر میں ماں کی کوششوں اور اس کی تربیت کا نتیجہ ان کی جوانی میں ظاہر ہوتا ہے۔

جب مجھ سے کسی نوجوان کے متعلق مشورہ کیا جاتا ہے کہ روزگار کے لئے وہ کیا کام سیکھے تو میں ہمیشہ یہ دریافت کرتا ہوں کہ بچپن میں اسے کس چیز سے دلچسپی تھی۔ اس کی کم سنی کی یادداشتیں پوچھتا ہوں جو صاف طور پر بتا دیتی ہے کہ وہ خود کو کس چیز کے لئے تیار کرتا آیا۔ یہ یادداشتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کی طبعی ساخت کیا ہے۔ اس کے ذہنی ادراک نے کیا اسکیم بنا لی ہے۔ بچپن کی یادداشتوں کی اہمیت کا میں آگے ذکر کرونگا۔

مدرسہ میں روٹی کمانے کی تعلیم

گھر کے بعد روٹی کمانے کی تربیت کے لئے مدرسے میں دوسرا قدم اٹھایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے مدرسوں میں بچوں کے آیندہ مشاغل کے متعلق اب توجہ کی جا رہی ہے مثلاً ان کے ہاتھوں۔ کانوں آنکھوں اور چھپی ہوئی صلاحیتوں اور قوت عمل کو ٹرینڈ کیا جا رہا ہے۔ یہ ٹریننگ اتنی ہی اہم ہے جتنے دوسرے خاص مضامین کی ہے۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ دوسرے مضامین کی تعلیم بچے کے روزگار کے مشاغل پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ ہم نے اکثر افراد کو کہتے ہوئے سنا کہ وہ لاطن اور فرینچ زبان جو مدرسے میں پڑھے تھے بھول گئے۔ وہ بھول گئے ہوں گے لیکن مدرسے میں ان زبانوں کی تعلیم دینا غلطی نہیں ہے۔ تجربے سے ہمیں معلوم ہوا کہ مدرسوں میں مختلف مضامین پڑھانا نفس کی مختلف صلاحیتوں کو ابھارنا

ہے۔ ان دنوں نئے مدرسے بھی قائم ہو گئے ہیں ان میں صنعت اور حرفت کی تعلیم دیجاتی ہے۔ بچہ ان میں شریک ہو کر تجربہ حاصل کر سکتا اور اپنے پر بھروسہ کرنا سیکھ سکتا ہے۔

پیشوں کے چناؤ کے لئے بچوں کی تیاری۔

اگر بچپن سے بچے کو معلوم ہو جائے کہ آئندہ روزی کے لئے اسے کیا کام کرنا ہے تو اس کی نشو ونما میں آسانی ہوگی۔ اگر بچوں سے ہم پوچھیں کہ وہ بڑے ہو کر کیا پیشہ اختیار کریں گے تو اکثر بچے اس کا جواب دیں گے۔ بچوں کے جواب صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتے مثلاً جب یہ کہتے ہیں کہ ہوائی جہاز کے پائیلٹ یا انجن ڈرائیور بننا چاہتے ہیں تو وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیوں ان پیشوں کو پسند کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم بچوں کی نیت اور غرض معلوم کریں کہ کیوں انھوں نے خاص پیشوں کو پسند کیا۔ ان کی انتخاب میں کیا چیز محرک ہوئی۔ بچوں کا موقف کیا ہے۔ ان کا برتری کا مقصد کیا ہے۔ جن پیشوں کا انھوں نے نام بتایا انھیں عملی طور پر اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ بچے اپنے جوابوں میں ایسے پیشوں کے نام بتاتے ہیں جن کو وہ اپنے ذہن میں بہتر اور برتر سمجھتے ہیں لیکن ہم انھیں اور بھی مشاغل بتا سکتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک بارہ یا چودہ سال کے بچے کو اس پیشے کے متعلق جسے وہ اپنی روزی کمانے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے کافی معلومات حاصل کر لینا چاہیئے لیکن مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے کہ اس عمر کا بچہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ آیندہ روزگار کے لئے کیا کرنے والا ہے بچے میں امنگ کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے ممکن ہے کہ بہت امنگ بھرا ہو لیکن اپنی امنگ ظاہر کرنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں ہمیں چاہیئے کہ ہم کوشش کر کے معلوم کریں کہ اس کو کن چیزوں سے دلچسپی ہے اور اب تک اس نے کیا ٹریننگ پائی ہے۔ بعض بچے ۱۶ سال کی عمر میں فوقانیہ تعلیم ختم کر لینے کے بعد بھی تصفیہ نہیں کر سکتے کہ آیندہ وہ کیا پیشہ اختیار کرینگے۔ یہ بچے عام طور سے بہت ذہین طلبہ ثابت ہو چکے ہوتے ہیں لیکن اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کوئی تصور نہیں رکھتے۔ یہ بچے اگرچہ امنگ بھرے ہوتے ہیں لیکن ان میں تعاون کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انھوں نے

کام کی تقسیم کے اصول کو نہیں سمجھا اور جانتے نہیں کہ اپنے امنگوں کو کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔ پس کم سنی ہی میں بچوں سے دریافت کر لینا کہ وہ بڑے ہو کر کیا شغل اختیار کریں گے مفید ہوتا ہے۔ میں مدرسوں میں اکثر یہ سوال کرتا ہوں تاکہ بچوں کو جب ہی سے اس مسئلہ پر غور کرنے کا خیال پیدا ہو اور وہ اُسے بھول نہ جائیں۔ جب بچے جواب دیتے ہیں تو میں ان سے پھر پوچھتا ہوں کہ انھوں نے ان پیشوں کا اپنے لئے کیوں چناؤ کیا اس سوال کے جواب میرے لئے بہت ہی دلچسپی کا باعث اور میری آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں۔

بچے کے کسی پیشے کے چناؤ سے اس کے پورے طرز زندگی کا حال ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کی کوششوں کا رخ کس طرف ہے اور زندگی میں کس چیز کو وہ مفید اور قیمتی سمجھتا ہے۔ اپنے پسند کئے ہوئے پیشے کی بچہ جو بھی قیمت قرار دے اسے ہمیں مان لینا چاہیئے اس لئے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم بتا سکیں کہ کونا پیشہ بڑھیا ہے اور کونا گھٹیا ہے۔ اگر کوئی بچہ اپنا مفوضہ کام عمدگی سے انجام دے رہا ہو اور اس سے دوسروں کو بھی کچھ فائدہ پہنچ رہا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس کی فائدہ پہونچانے کی صلاحیت اسی درجے پر ہے جیسے کہ کسی اور کی ہوتی ہے۔ اب اس بچے کا آئندہ صرف یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے کو پیشے کے لئے ٹرینڈ کر لے۔ اپنا روزگار پیدا کرے اور کام کی تقسیم کے اصول سے دلچسپی پیدا کرے۔

بعض لوگ پیشوں کا چناؤ تو کر لیتے ہیں لیکن ان سے کبھی مطمئن نہیں رہتے اس لئے کہ ان کا مقصد کام کرنا نہیں ہوتا بلکہ آسان طریقے سے برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے مسائل اور مشکلوں کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے ان کا تو یہ خیال رہتا ہے کہ زندگی کا ان مسئلوں اور مشکلوں کو ان کے سامنے پیش کرنا ناانصافی ہے۔ یہ لوگ بھی لاڈلے بچے ہوتے ہیں جو دوسروں کی مدد کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ ان ہی کاموں سے حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں جس کے لئے وہ خود کو چار یا پانچ سال کی عمر سے ٹرینڈ کر لیتے ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد بھی ان کی دلچسپی باقی رہتی ہے لیکن مالی خالات کے نظر کرتے یا ماں باپ کے دباؤ کی وجہ وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور

ہو جاتے ہیں جس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔

بچپن کی ٹریننگ کی یہ بھی ایک علامت ہے۔ اگر ہم کسی بچے کی ابتدائی یادداشتوں سے اُسے بصری قسم کا پائیں تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ اس کے لئے ایسے کام مفید ہونگے جن میں اسے آنکھوں سے کام لینے کا موقع ملے۔ پیشوں کی رہنمائی کرنے میں بچوں کی ابتدائی یعنی بچپن کی یادداشتوں کو بہت اہم سمجھنا چاہیئے۔

پیشوں کی رہنمائی یادداشتوں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے

اگر کوئی بچہ اپنی ابتدائی یادداشتوں سے کسی سے بات چیت کرنے ہوا کی آواز یا گھنٹی بجنے کا ذکر کرے تو ہم سمجھ لیں کہ وہ سمعی یعنی غور سے سننے والا بچہ ہے اور وہ کسی ایسے کام کے لئے جس کا لگاؤ موسیقی سے ہو موزوں ہوگا۔

بعض بچوں کی یادداشتوں سے ہم ان کا مختلف حرکتوں سے متاثر ہونا پاتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہوتے ہیں جو چلنا پھرنا اور حرکت کرتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ انھیں ایسے کاموں سے دلچسپی ہوگی جن میں جسمانی محنت کرنی پڑے یا سفر کرتے رہنے کا موقع ملے۔

عام طور پر بچے جو کوشش کرتے ہیں ان میں سے کسی بچے کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ فیاملی کے دوسرے ارکان سے خصوصاً باپ یا ماں سے آگے بڑھ جائے۔ یہ کوشش بہت مبارک ہے۔ یہ دیکھ کر کہ موجودہ نسل گزشتہ نسل سے زیادہ ترقی کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی بچہ اپنے پیشے میں باپ سے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ تو ایک حد تک باپ کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر بہت ہی اچھی ابتداء کرسکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک پولیس والے کا بچہ وکیل یا جج بننے کی امنگ رکھتا ہے۔ کسی بچے کا باپ ڈاکٹر کے آفس میں نوکر ہو تو بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ خود بھی ڈاکٹر بنے۔ باپ مدرس ہو تو بچہ جامعہ کا پروفیسر ہونا چاہتا ہے۔

بچوں کی پیشوں کی تیاری کے مظاہرے

اگر ہم بچوں کو غور سے دیکھتے رہیں تو ہم معلوم کرلیں گے کہ بچے آئندہ پیشوں کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ جو مدرس بننا چاہتا ہے اپنے سے چھوٹے

بچوں کو جمع کرنا اور خود مدرس بن کر مدرسے کا کھیل کھیلتا ہے۔ بچوں کے کھیلوں سے ہمیں ان کی دلچسپیاں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایک لڑکی جو ماں بننے کی آرزو رکھتی ہے گوڑیوں سے کھیلتی اور بچوں میں دلچسپی لینے کے لئے خود کو تیار کرتی ہے۔ لڑکی کی یہ دلچسپی کہ ماں بننے کے لئے خود کو تیار کرے ایسی ہے کہ اس کو بڑھانا چاہیئے اور لڑکی کو کھیلنے کے لئے گوڑیاں دینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو گوڑیاں دینا ان کو "حقیقت" سے دور کر دینا ہے لیکن ایسا نہیں گوڑیوں کے ذریعے سے لڑکیاں خود کو ماں تصور کرتیں اور آئندہ ماؤں کے فرائض انجام دینے کے لئے خود کو تیار کرتی ہیں۔ لڑکیوں کا کم سنی میں خود کو اس طرح تیار کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔ اگر اس میں دیر ہو تو ان کی دلچسپی کم ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

بہت سے بچے میکانی اور صنعتی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں اگر یہ آگے چل کر یہہ پیشے اختیار کریں تو ان کے لئے نفع بخش ہوتے ہیں۔

بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جو خود قیادت پسند نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی دوسرے بچے یا بڑے کو اپنا رہنما بنا لیں اور اس کی ماتحتی اختیار کر لیں۔ یہ کچھ اچھا رجحان نہیں ہے اگر اس کو روکا جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر ہم اس رجحان کو نہ روکیں تو بچے بڑے ہو کر زندگی میں نمایاں جگہ نہ پیدا کر سکیں گے اور اپنی مرضی سے چھوٹے اور غیر ذمہ دارانہ عہدے قبول کر لیں گے اور معمولی روزانہ کام جو ان کے لئے مقرر کر دیا جائے کرتے رہیں گے۔

وہ بچے جنہیں بیماری یا موت کے مسائل سے اچانک بغیر تیاری کے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے ان میں بیحد دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر۔ نرس یا کیمسٹ بنیں۔ میرا خیال ہے کہ ان بچوں کے دل بڑھانا چاہیئے اس لئے کہ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ وہ بچے جنہوں نے اس قسم کی دلچسپیاں رکھتے ہوئے بچپن سے تیاری شروع کی اپنے پیشے سے محبت رکھتے ہیں۔ بعض دفعہ موت کے تجربہ کا معاوضہ ایک اور طریقہ سے

ملتا ہے وہ یہ کہ بچہ نقاشی یا ادب کا شوق پیدا کر کے خود کو موت سے بچانا چاہتا ہے یا بیحد مذہبی ہو جاتا ہے۔

پیشوں کی تربیت سے جی چرانے والے بچے

کسی پیشے کی تربیت پانے سے دل چرانے اور کاہلی وغیرہ کی عادت بھی بچپن میں پڑتی ہے۔ جب ہم اس قسم کے بچے کو پائیں تو ہمیں چاہیے کہ سائنٹفک طریقوں سے اس کے ایسا کرنے کے وجوہ معلوم کریں اور سائنٹفک طریقوں سے اس کا علاج کریں۔ اگر ہم کسی ایسے سیارے میں رہتے جہاں بغیر محنت اور مشقت کے ہمیں ضرورت کی سب چیزیں مل جائیں تو شائد بیکاری ہمارے لئے اچھائی اور کام کرنا برائی ہوتا۔ جہاں تک ہمارا تعلق اس ہمارے سیارے یعنی زمین سے ہے پیشے کا مسئلہ اسی وقت کامیابی کے ساتھ حل ہو سکتا ہے جب ہم کام کریں۔ تعاون کریں اور دوسروں کو فائدہ پہونچائیں۔ نوع انسان کی جبلت میں یہ چیز ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ اب ہم اس مسئلہ پر سائنٹفک طریقے سے نظر ڈالیں گے۔

طباع کون ہوتے ہیں

غیر معمولی ذہین لوگوں میں ہم صاف طور سے بچپن کی تربیت کا اثر پاتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ غیر معمولی ذہانت کا مسئلہ اس مضمون پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ نوع انسان میں وہی لوگ غیر معمولی ذہین اور طباع سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی نوع کی بھلائی کے لئے کچھ نہ کیا ہو۔ فنون تعاون پسند افراد کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نوع انسان کے غیر معمولی ذہین افراد نے ہی ہمارے کلچر کو بلند پایہ کیا ہے۔ ہومر شاعر نے اپنی نظموں میں صرف تین رنگ سے [illegible] کر لیا ہے۔ ان تین رنگوں کے ذریعے سے مختلف چیزوں کے رنگوں کا فرق قائم کرنا پڑتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں لوگ دوسرے اور رنگ بھی پہچان سکتے تھے لیکن ان کے نام رکھنے کی انھیں ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ان میں بہت کم فرق تھا۔ مختلف رنگوں میں فرق کرنا اور ان کے نام رکھنا ہمیں کس نے سکھایا؟ مصوروں اور نقاشوں نے ہمیں یہ سکھایا۔ نغمہ گروں نے ہماری سماعت کو غیر معمولی طور پر شائستہ

بنایا۔ ابتدائی زمانے کے انسانوں کی طرح سخت اور کریہہ آواز سے بات چیت کرنے کے عوض ہم جو سریلی آواز سے بات کرتے ہیں یہ گانے والوں کا طفیل ہے کہ انھوں نے یہ چیز ہمیں سکھائی۔ ان لوگوں نے ہمارے دلوں کو مالا مال کیا اور ہمیں بتایا کہ ہم اپنی مختلف قوتوں کو کس طرح تربیت دے سکتے ہیں۔

ہمارے جذبات کو کس نے ابھارا اور کسی چیز کو اچھی طرح سمجھنے اور اچھی طرح بیان کرنے کی صلاحیت کس نے ہم میں پیدا کی؟ وہ شاعر تھے جنہوں نے ہماری زبان کو مالا مال کیا۔ اس کو لچکدار بنایا اور زندگی کے مختلف مقاصد کے لئے اسے موزوں بنایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر معمولی ذہین لوگ ہمیشہ سب سے زیادہ تعاون پسند رہے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے بعض جزوی اعمال اور کردار سے ہم ان کی تعاون کی صلاحیت نہ معلوم کرسکیں لیکن ان کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے سے اس کا پتہ چل جائیگا۔ تعاون کرنا ان کے لئے اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ دوسروں کے لئے تھا۔ انھوں نے مشکل راستہ اختیار کیا اور انھیں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے اکثر افراد نے ناقص اعضائ کے ساتھ زندگی شروع کی۔ جتنے مشہور اور ممتاز لوگ گزرے ہیں تقریباً سب کوئی نہ کوئی عضو ناقص رکھتے تھے اور اس کی وجہ سے یہ لوگ زندگی کے ابتدائی زمانے میں مشکلوں میں پڑے لیکن انھوں نے مقابلہ کیا اور مشکلوں کو ہٹایا۔ ہم معلوم کرلے سکتے ہیں کہ ان لوگوں نے شروع ہی سے کس طرح اپنے میں مختلف دلچسپیاں پیدا کرلیں اور کس طرح بچپن سے خود کو تربیت دی۔ انھوں نے اپنے حواس کو تیز کیا تاکہ دنیا کے مسائل کا مقابلہ کریں اور انھیں سمجھ سکیں۔ ان مشہور لوگوں کے کمال ان کی غیر معمولی ذہانت ان کی بچپن کی تربیت کا نتیجہ اور ان کی خود پیدا کی ہوئی تھی نہ کہ فطرت کا یا بزرگوں کا عطیہ تھی۔ ان لوگوں نے محنتیں کیں اور ہم نے ان کی محنتوں کا پھل کھایا۔

آئندہ زندگی کی کامیابی کے لئے بچپن کی تربیت اور کوشش بنیاد کا کام دیتی ہے فرض کیجئے کہ ہماری ایک تین یا چار سال کی لڑکی ہے اسے کھیلنے کے لئے ہم نے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ وہ گڑیا کی ٹوپی سینے لگتی ہے۔ اب اگر ہم لڑکی کو اس کام میں

مشغول دیکھ کر کہیں کہ "کیا اچھی ٹوپی سی رہی ہو" اور ساتھ ہی اس کو بہتر بنانے کے طریقے بتائیں تو اس سے لڑکی کا دل بڑھے گا اور شوق زیادہ ہو گا وہ کوشش کرے گی اور سینے پرونے میں مہارت حاصل کرلے گی۔ اس کے برخلاف لڑکی کو سیتا ہوا دیکھ کر اگر ہم کہہ دیں کہ "سوئی رکھ دو وہ تمہیں چبھ جائے گی۔ ٹوپی سینے کی ضرورت نہیں ہم تمہیں بازار سے اس سے اچھی ٹوپی لادیں گے" تو لڑکی کوشش کرنا چھوڑ دیگی۔ ان دونوں صورتوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پہلی صورت اختیار کی جائے تو اس سے آگے چل کر لڑکی میں دلچسپی پیدا ہوگی اور اس میں صحیح مذاق پیدا ہوگا دوسری صورت میں لڑکی سست اور کاہل ہو جائے گی اور خود کام کرنے کے عوض ضرورت کی چیزیں ہمیشہ بازار سے خرید کر لانے کا خیال رکھے گی۔

روپیہ کو غیر معمولی اہمیت نہ دینا چاہیے

اگر فیاملی میں روپے پیسے کو غیر معمولی اہمیت دی جائیگی تو بچے مشاغل کو صرف روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھنے لگیں گے اور یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اس لئے کہ اس خیال کے بچوں کو نوع انسان کو فائدہ پہونچانے سے دلچسپی باقی نہ رہے گی۔ یہ سچ ہے کہ ہر شخص کو اپنی گزر بسر کے لئے کمانا چاہیئے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم ایسے افراد بھی پاتے ہیں جو اپنا یہ فرض ادا نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں۔ اگر کسی بچے کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہو جائے تو پھر وہ تعاون چھوڑ کر اپنے ہی فائدے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ اگر سماج سے دلچسپی چھوڑ کر صرف روپیہ کمانا کسی کا نصب العین ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ لوٹ کھسوٹ اور دھوکے سے کیوں نہ روپیہ پیدا کرے۔ اگر کوئی شخص روپیہ کمانے کی خواہش کے ساتھ تھوڑی سماجی دلچسپی رکھے تو بھی کافی روپیہ کما سکتا ہے لیکن اس کی مصروفیتوں اس کے کام کاج سے دوسروں کو فائدہ پہونچے گا۔ ہمارے مشکل اور پیچیدہ زمانے میں ان طریقوں سے مالدار ہو جانا ممکن ہے کسی غلط طریقے کے اختیار کرنے کے بعد بھی بعض دفعہ کامیابی ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص زندگی میں صحیح راستے پر چل رہا ہو تو ہم یقین کے ساتھ اسے اطمینان دلا سکتے کہ

وہ جلد کامیاب ہو جائے گا۔ ہم اسے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمت نہ ہارے اور خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شادی سے کون لوگ بھاگتے ہیں

بعض دفعہ سماجی اور محبت کے مسائل سے بچنے کے لئے کوئی مشغلہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ ہماری سماجی زندگی میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اپنے کاروبار میں غیر معمولی مصروفیت کو شادی نہ کر سکنے کی وجہ بتاتے ہیں اور اس طرح محبت اور شادی کی ذمہ داری سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شخص خود کو زندگی کے کام دھندوں میں بیحد مصروف کر لیتا اور کہتا ہے کہ مجھے شادی کا معاملہ طے کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی لہذا میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

عام طور سے خلل اعصاب کے بیمار سماجی اور شادی بیاہ کے مسائل سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری جنس والوں کی طرف پیش قدمی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو غلط طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کے دوست احباب نہیں ہوتے اور انھیں دوسروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ دن رات دھندے میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ نیند میں بھی اسی کے متعلق خواب دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دماغوں پر اتنا بوجھ ڈالتے ہیں کہ ان کی اعصابی خرابی میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ معدہ بگڑ جاتا اور دوسرا کوئی مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اب یہ معدہ کی خرابی کو سماجی مسائل اور شادی کے مسئلے کو طے نہ کر سکنے کی وجہ قرار دیتے اور اسے بطور عذر پیش کرتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنا شغل بدلتے رہتے ہیں۔ ایک شغل چھوڑ کر دوسرا اختیار کرتے ہیں آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کام کاج چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھ جاتے ہیں۔

مسئلی بچوں کے متعلق ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم معلوم کریں کہ انھیں کس چیز سے دلچسپی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے تو پھر ہم ان کا دل بڑھا سکتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی

تو کوئی شغل اختیار نہیں کرتے اور ان سن رسیدہ لوگوں کی جو دھندے میں ناکامیاب ہو گئے ہیں اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ انھیں کس چیز سے حقیقی دلچسپی ہے معلوم کیا جائے اور پھر انھیں ایسے لوگوں کی نگرانی میں رکھا جائے جو انھیں موزوں صنعتوں میں لگا سکیں اور پھر نوکری بھی دلوا دیں۔ ایسا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہے۔

ان دنوں بے روزگاروں کی تعداد بھیانک ہو گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ تعاون کے فائدے سے ناواقف ہو گئے ہیں لہذا میری رائے ہے کہ وہ لوگ جو تعاون کی اہمیت سے واقف ہیں کوشش کریں کہ لوگ بے روزگار نہ رہیں اور ہر اس شخص کو جو کام کرنا چاہتا ہے کچھ نہ کچھ کام مل جائے۔ ٹریننگ اسکولس۔ صنعتی مدرسوں اور بالغوں کی تعلیم کے ذریعے ہم یہ کام انجام دے سکتے ہیں اکثر بے روزگار انہاڑی ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں سماجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ سماج کے غیر تربیت یافتہ افراد اور وہ لوگ جو نوع انسان کی بھلائی کا خیال نہیں رکھتے سماج اور نوع انسان کے لئے بھاری بوجھ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو نااہل اور ناکارہ سمجھتے ہیں اور ان ہی غیر تربیت یافتہ انہاڑی لوگوں میں کے اکثر افراد جرائم پیشہ۔ خلل اعصاب کے مریض اور خودکشی کرنے والے ہوتے ہیں۔ تربیت نہ ہونے کی وجہ یہ دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سب ماں باپ کو۔ سب مدرسین کو اور ان سب کو جو نوع انسان کی ترقی اور بھلائی سے دلچسپی رکھتے ہیں کوشش کرنی چاہیے کہ بچے تعاون کی اچھی تربیت پائیں اور کام کی تقسیم کی قدر اور قیمت معلوم کرنے کے بغیر جوانی کی عمر کو نہ پہونچیں۔

گیارویں فصل

انسان اور انسان (انسانوں کا تعلق انسانوں سے)

انسان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم جنس انسانوں سے میل ملاپ رکھے انسانوں کی باہمی دلچسپی ہی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی۔

فیاملی کی تنظیم فیاملی ایک ایسی تنظیم ہے کہ جس کی وجہ فیاملی کے ایک رکن کو دوسرے ارکان سے دلچسپی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان بنا کر زندگی بسر کرنے کا میلان انسان میں قدیم زمانے سے رہا۔ ابتدائی زمانے کے قبائل اپنے خاندان کے لئے ایک ٹوٹم (نشانی) قرار دے لیتے تھے اور اس نشانی کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کے ذریعے خاندان کے ارکان میں اتفاق اور اتحاد قائم رہے۔ ان ابتدائی قبائل کی عبادت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اسی ٹوٹم کو پوجتے تھے مثلاً کوئی قبیلہ چھپکلی تو کوئی بیل یا سانپ کی پرستش کرتا۔ جو لوگ ایک ہی ٹوٹم کو پوجتے وہ سب مل جل کر رہتے۔ ایک دوسرے سے تعاون کرتے اور گروہ کا ہر ایک رکن دوسرے گروہ والوں کو اپنا بھائی سمجھتا۔ ابتدائی زمانے کے یہ رسم و رواج انسانوں میں تعاون قائم کرنے کے مفید ذریعے تھے مثلاً ان ابتدائی قبائل میں سے جب چھپکلی کو پوجنے والے قبیلے کے لوگ کوئی خاص تہوار منانے جمع ہوتے تو آپس میں فصلوں کے متعلق گفتگو کرتے اور انھیں ہوا اور طوفان سے بچانے کے طریقوں اور خود کو جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھنے کی تدبیروں پر غور کرتے تھے۔ مذہبی تقریبوں کا مقصد یہی ہوتا تھا۔

شادی ایک ایسا معاملہ تھا جس میں پورا گروہ دلچسپی لیتا تھا۔ ہر ایک گروہ کی سماجی جکڑبندیوں کے مطابق ہر شخص کو جو ایک ہی قسم کے ٹوٹم کو پوجتا تھا دوسرے گروہ والوں میں سے شریک زندگی کا چناؤ کرنا پڑتا تھا۔ اب بھی یہ بات غور کے قابل ہے کہ حقیقت میں محبت اور شادی کے معاملے خانگی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق سماج سے ہے اور سماج کے سب ارکان کو دل وجان سے ان معاملوں میں حصہ لینا چاہیئے۔ شادی کا معاملہ بڑی ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ اس سے سماج کو اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ سماج چاہتا ہے کہ صحیح اور تندرست بچے پیدا ہوں اور تعاون کی اچھی تعلیم وتربیت پائیں پس ہر انفرادی شادی سے پورے نوع انسان کو دلچسپی رکھنی چاہیئے! ابتدائی زمانے کے لوگوں کے رسم ورواج۔ ان کے ٹوٹم اور شادی کے پیچیدہ رسوم اس وقت ہمیں مضحکہ خیز نظر آئیں تو آئیں لیکن اس زمانے میں ان کی جو اہمیت تھی اس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان سب رسوم کا مقصد یہی تھا کہ آپس میں تعاون بڑھایا جائے۔

مذہب اور سائنس دونوں تعاون کو اہمیت دیتے ہیں

مذہب نے جو چیز ہم پر واجب کی ہے وہ یہ کہ "تو اپنے ہمسایے سے محبت کر"۔ ایک طرح سے اس مذہبی حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم نوع انسان سے دلچسپی رکھیں۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ سائنس کے نقطہ نظر سے بھی اس حکم کی افادیت کی توثیق کی جا سکتی ہے۔

ایک لاڈلا بچہ ہم سے پوچھتا ہے کہ "میں کیوں اپنے ہمسایے سے محبت رکھوں؟ کیا میرا ہمسایہ بھی مجھ سے محبت رکھتا ہے؟ اس قسم کے سوالات سے بچہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں تعاون کی صلاحیت نہیں ہے وہ صرف اپنے سے دلچسپی رکھتا ہے۔

وہ شخص جو اپنے ہم جنسوں سے دلچسپی نہیں رکھتا زندگی میں مشکلات میں پھنسا رہتا ہے اور دوسروں کو بے حد نقصان پہونچاتا ہے۔ ان ہی لوگوں میں سے ناکامیاب انسان نکلتے ہیں۔

اکثر مذہب ایسے ہیں جو اپنے طریقوں سے تعاون کی دعوت دیتے ہیں اور میں اپنی حد تک ہر اس انسانی کوشش کا خیر مقدم کرتا ہوں جو تعاون کو انسان کا نصب العین زندگی قرار دیتی ہے۔ کسی مذہب یا کسی عقیدے کے بارے میں لڑنے جھگڑنے۔ اعتراض کرنے یا اس کو کم تر سمجھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ہم پوری طور سے "حقیقت" سے واقف نہیں۔ تعاون کی منزل مقصود کو پہونچنے کے لئے ہمارے لئے مختلف راستے کھلے ہوئے ہیں۔

سیاسیات اور تعاون

ہم جانتے ہیں کہ سیاسیات میں بہت سے بہترین ذریعوں سے برا کام لیا جاتا ہے لیکن جو سیاست داں تعاون کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ نوع انسان کی ترقی اور بھلائی ہر سیاست داں کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ نوع انسان کی ترقی کے معنیٰ اعلیٰ درجے کے تعاون کے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ کونسا سیاست داں یا کونسی سیاسی پارٹی ہمیں ترقی کے راستے پر لگا سکتی ہے۔ اس چیز کا ہر شخص اپنی طرز زندگی کے مطابق فیصلہ کر لیتا ہے۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی اپنے ہم خیال افراد کی معقول تعداد پیدا کر لیتی ہے تو ہمیں اس پارٹی سے شکایت نہ ہونی چاہیئے۔ یہی حال قومی تحریکوں کا ہے۔ ان تحریکوں کے چلانے والوں کا مقصد یہ ہو کہ سماجی جذبات ابھاریں اور بچوں میں انسانی ہمدردی پیدا کریں اس کے بعد اگر وہ اپنے روایات کے مطابق عمل کریں اپنی قومیت کی پرچار کریں۔ اپنے خیالات کے مطابق قانون میں تبدیل کرانے کی کوشش کریں تو ہم ان کی ان تمام کوششوں سے اختلاف نہ کریں گے۔ کسی طبقے کی تحریک گویا کہ ایک گروہ کی تحریک اور تعاون کی شکل ہوتی ہے۔ اب اگر یہ تحریک نوع انسان کی بھلائی کے لئے ہو تو پھر ہمیں تعصب سے کام نہ لینا چاہیئے۔ بہر حال سب تحریکوں کو اسی نظر سے جانچنا چاہیئے کہ وہ لوگوں میں سماج سے دلچسپی رکھنے کی صلاحیت کہاں تک پیدا کرتی ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تعاون کی قابلیت بڑھانے کے مختلف طریقے ہیں بعض اچھے تو بعض برے لیکن اگر نصب العین سب کا ایک ہو تو پھر ایک کو صرف اس لئے برا کہنا کہ وہ سب سے

بہتر نہیں ہے بیکار ہے۔

خود غرضی کے نقصانات اور تعاون کے فوائد

ہمیں جس چیز سے اختلاف ہے وہ لوگوں کا خود غرض ہوتا اور ہمیشہ اپنے ذاتی فائدے کا خیال رکھنا ہے۔ کسی شخص اور نوع انسان کی ترقی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی انسانی صلاحیتیں اسی وقت اجاگر ہوسکتی ہیں جب ہم اپنے ہم جنسوں میں دلچسپی لینا سیکھیں۔

بولنا۔ پڑھنا۔ لکھنا انسانوں کے تعاون کا نتیجہ ہیں۔ زبان کو نوع انسان نے اپنی متفقہ کوششوں سے بنایا زبان سماجی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ سمجھنا بوجھنا کسی ایک انسان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ نوع انسان کا عام کام ہے۔ کسی چیز یا کسی شخص کو سمجھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اسے اسی طرح سمجھیں جیسا کہ دوسرے سمجھتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم چیز کو اسی طرح سمجھیں جیسا کہ عام نوع انسان نے اسے سمجھ رکھا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنے اغراض کو دیکھتے رہتے اور ہمیشہ اپنی برتری کا خیال رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے لئے زندگی کے ایک خانگی معنی قرار دے رکھے ہیں۔ وہ یہ کہ دنیا سب صرف ہمارے لئے ہے۔ یہ زندگی کے صحیح معنی نہیں ہیں۔ یہ صرف ان کا اپنا ایک خیال ہے جس سے دنیا میں کوئی عقل سلیم رکھنے والا اتفاق نہیں کرسکتا۔ لہذا ایسا خیال رکھنے والے لوگ اپنے ہم جنس انسانوں سے ربط قائم نہیں کرسکتے۔ جب ہم کسی ایسے بچے کو دیکھتے ہیں جس نے صرف اپنے سے دلچسپی رکھنے کی تربیت پائی ہے تو ہم اس کو بھیگی بلی پاتے ہیں۔

یہی حال مجرمین اور دیوانوں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ دوسروں سے آنکھ میں آنکھ نہیں ملا سکتے بلکہ بعض بچے تو اپنے ہم جنسوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ منہ پھیر لیتے اور دوسری طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ چیز یعنی اپنے آپ سے دلچسپی رکھنا اور دوسروں کا خیال نہ رکھنا خلل اعصاب کا باعث ہوتی ہے اور اسی سے بے موقع شرمانے۔ ہکلانے۔ نامردی اور سرعت انزال کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب

چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ فرد میں دوسرے انسانوں سے مل جل کر زندگی بسر کرنے اور ان سے دلچسپی رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

جنون کی حالت اور اس کا علاج

جنون کی حالت میں تنہا رہنے کی عادت بیحد بڑھ جاتی ہے۔ جنون لاعلاج مرض نہیں ہے۔ اگر مجنوں میں دوسروں سے دلچسپی پیدا کر دیجائے تو وہ اچھا ہو سکتا ہے لیکن جنون انسان کو بہ نسبت دوسری بیماریوں کے بہت زیادہ دور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے بیماروں کا علاج کرنا ایک آرٹ ہے جو بہت مشکل ہے۔ بیمار میں پھر سے تعاون کی صلاحیت پیدا کرنی پڑتی ہے اور یہ کام صبر۔ محبت اور شفقت سے ہم انجام دے سکتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے ایک دیوانی لڑکی کے علاج کے لئے بلایا گیا۔ یہ لڑکی ۸ سال سے جنون میں مبتلا تھی اور پچھلے دو سال سے پاگل خانے میں تھی۔ کتے کی طرح بھونکتی اور تھوکتی۔ اپنے کپڑے پھاڑ لیتی اور دستی رومال کھا جانے کی کوشش کرتی تھی۔ ان حرکات سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ انسانوں سے دلچسپی رکھنے سے کس قدر دور جا پڑی تھی۔ وہ کیوں کتے کی حرکات کرتی تھی ہم سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ماں نے اس سے کتے کا سا برتاؤ کیا اس لئے اب وہ اپنی حرکات سے بتاتی ہے کہ "جب میں انسانوں کو دیکھوں گی تو کتا بن جاؤنگی اور کتے کی حرکات کرونگی"۔ آٹھ روز تک ہر روز میں نے اس سے بات چیت کی لیکن اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں نے روزانہ گفتگو جاری رکھی اور تیس دن کے بعد اس نے باتیں کرنا شروع کیا لیکن اسکی بات چیت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے کو اس کا دوست ثابت کیا اور اس سے اس کا دل بڑھتا گیا۔ اس قسم کے مریض کا اگر دل بڑھایا جائے اور اس میں ہمت پیدا کی جائے تو وہ اس ہمت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ انسانوں سے اس کی مخالفت سخت ہوتی ہے۔ تاہم پہلے سے بتا سکتے ہیں کہ اس قسم کے مریض میں ہمت آجائے تو وہ کیا کرے گا۔ وہ سب کچھ کریگا لیکن تعاون کرنا پسند نہیں کرے گا۔ اس کی حالت مسئلی بچے کی سی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو ستاتا۔ چیزیں توڑتا پھوڑتا اور نوکروں کو مار پیٹ کرتا

جب میں نے دوسری دفعہ اس لڑکی سے گفتگو کی تھی تو اس نے مجھے مار دیا تھا۔ اور مجھے غور کرنا پڑا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے تصفیہ کیا کہ لڑکی کا مقابلہ نہ کروں اور اس طرح اس کو حیرت میں ڈال دوں۔ لڑکی قوی اور توانا تھی میں نے لڑکی کو مارنے دیا اور اس پر بھی دوستانہ نظروں سے اُسے دیکھا کیا۔ لڑکی کو اس کی امید نہ تھی اور وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی حاصل کی ہوئی ہمت سے مفید کام نہ لے سکی اس نے میرے کمرے کی تبنی کا شیشہ توڑ دیا جس سے اس کا ہاتھ کٹ گیا۔ میں نے اُسے کچھ بُرا بھلا نہیں کہا بلکہ اس کے ہاتھ کو پٹی باندھ دی۔ اس سے پہلے جب وہ اس قسم کی حرکات کرتی تھی تو اس کو کمرے میں مقفل کر دیا جاتا تھا جو بڑی غلطی تھی۔ اگر ہم لڑکی پر قابو پانا چاہتے ہیں تو ہمارا سلوک اس سے بالکل جدا ہونا چاہیئے۔ ہمارا یہ امید رکھنا کہ دیوانہ شخص سیانے آدمی کی طرح عمل کرے گا ہماری سخت غلطی ہے۔ تقریباً ہر شخص اس بات سے بگڑ جاتا اور غصے میں آجاتا ہے کہ دیوانے مثل سیانوں کے بات نہیں مانتے۔ کھانا نہیں کھاتے۔ کپڑے پھاڑ لیتے ہیں وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں کہ انھیں ایسا کرنے دیجیئے اس لئے کہ وہ مجبور ہیں۔

چند روز میں لڑکی اچھی ہوگئی۔ ایک سال ہو چکا اور وہ بالکل صحیح اور تندرست تھی۔ ایک روز جب میں پاگل خانے کو جہاں یہ تھی جا رہا تھا تو یہ راستے میں ملی اور مجھ سے پوچھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا اسی پاگل خانے کو جا رہا ہوں جہاں تم دو سال رہ چکی ہو۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ہم دونوں پاگل خانے پہونچے اور میں اُس ڈاکٹر کو جس نے اس لڑکی کا علاج کیا تھا بلوایا اور کہا کہ جب تک میں ایک بیمار کو دیکھوں تم اس لڑکی سے باتیں کرتے رہو۔ جب میں واپس آیا تو ڈاکٹر کو غصے میں بھرا پایا۔ غصے کی وجہ دریافت کی تو ڈاکٹر نے کہا کہ لڑکی بالکل صحیح و تندرست ہے لیکن اس کی ایک حرکت نے مجھے غصے میں لایا وہ یہ ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ اس لڑکی سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ دس سال سے وہ بالکل اچھی ہے۔ اپنی روٹی آپ کماتی ہے اور لوگوں سے ملتی جلتی ہے اسکی موجودہ حالت دیکھ کر کوئی نہ کہے گا کہ وہ کبھی جنون کی بیماری میں مبتلا ہوئی۔

پیارد لنوایا اور مالیخولیا

دو بیماریاں جن کی وجہ بیمار دوسرے انسانوں سے بالکل دوری اختیار کر لیتا ہے۔ پیارَدْنُوایا (وہ مرض جس میں بیمار خود کو سب سے بڑا اور بہتر سمجھنے لگتا ہے) اور مالیخولیا ہے۔ پیارونوایا کا بیمار سب انسانوں کو بُرا سمجھتا اور تصور کرتا ہے کہ سب لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں اور اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ مالیخولیا کا بیمار خود اپنے کو بُرا سمجھتا اور ملامت کرتا ہے مثلاً کہتا ہے "میں اپنے تمام خاندان کی بربادی کا باعث ہوا۔" میں نے اپنی تمام دولت لٹا دی اب میرے بچے بھوکوں مرینگے۔" جب کوئی شخص اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے تو یہ چیز صرف ظاہری ہوتی ہے لیکن باطن میں وہ دوسروں کو بُرا کہتا ہے۔

ایک بااثر اور مشہور عورت کو ایک دفعہ حادثہ پیش آیا اور وہ اپنی سماجی مصروفیتوں کو جاری نہ رکھ سکی۔ اس کی تین لڑکیاں تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں لہذا وہ تنہا رہ گئی تھی اور اس تنہائی کو بہت محسوس کرتی تھی۔ اس اثنا میں اس کا شوہر مر گیا۔ اس عورت کی زندگی لاڈ اور پیار میں گذری تھی لیکن اب اس کو لاڈ کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے لاڈ کیا جائے۔ اس نے یورپ کے ملکوں کا سفر کرنا شروع کیا۔ چونکہ دوسرے ملکوں میں اسے وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جیسی وطن میں تھی تو یہ مرض مالیخولیا میں مبتلا ہو گئی۔ اس کے دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مالیخولیا ایسا مرض ہے کہ اس کے بیمار کے اطراف رہنے والے پریشان ہو جاتے اور تنگ آجاتے ہیں۔ اس نے اپنی لڑکیوں کو تار دے کر بلایا لیکن ہر لڑکی نے کچھ نہ کچھ بہانہ کرکے آنے سے انکار کر دیا۔ جب وہ وطن واپس آگئی تو ہر وقت یہ کہتی رہتی تھی کہ "میری لڑکیاں مجھ پر بڑی مہربان ہیں" حالانکہ واقعاً ایسا نہ تھا۔ اس کی لڑکیوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کی واپسی کے بعد کبھی کبھار اس سے ملتی تھیں لہذا اس عورت کے الفاظ کو ہم سچ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ الفاظ طعن کے طور پر کہے گئے۔ ہر وہ شخص جو ان واقعات سے واقف ہوگا یہی کہے گا کہ ماں نے طعن کیا۔

مالیخولیا حقیقت میں ایک دیرینہ رنج اور غصہ ہے جو دوسروں کے خلاف

دل میں رکھا جاتا ہے۔ بیمار اگرچہ خود کو قصوروار ظاہر کرتا ہے لیکن اس کا دلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی ہمدردی اور مدد حاصل کرے۔ مالیخولیا کے بیمار کی ابتدائی یادداشت یہ ہوتی ہے۔: "مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں آرام کی کرسی پر لیٹنا چاہا لیکن اس پر میرا بھائی لیٹا ہوا تھا۔ میں اتنا رویا اور چلایا کہ اس نے مجبور ہو کر کرسی چھوڑ دی۔"

مالیخولیا کے علاج کا طریقہ

مالیخولیا کے بیماروں میں خودکشی کا میلان ہوتا ہے اور اس کو یہ اپنے مخالفین سے بدلہ لینا تصور کرتے ہیں پس معالج کو چاہیئے کہ احتیاط کرے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جو بیمار کے لئے خودکشی کا بہانہ ہو جائے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ اس قسم کے بیماروں سے کشمکش نہ کروں بلکہ میرے علاج کا پہلا اصول یہ ہے کہ میں انھیں کہتا ہوں کہ "جو کام تمہیں پسند نہیں وہ ہرگز مت کرو"۔ یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا اثر بیماری پر بہت پڑتا ہے۔ اگر ایک مالیخولیا کا بیمار جو کام چاہے کرنے کے قابل ہو جائے تو پھر وہ کس کو موردالزام ٹھیرائے گا؟ اور کس چیز کا بدلہ لے گا؟ میں بیمار سے کہتا ہوں کہ اگر ناٹک کو یا ہواخوری کے لئے جانا چاہتے تو جاؤ اور اگر راستے میں ارادہ بدل جائے تو نہ جاؤ۔ ایسا کہنے سے بیمار خود کو اچھے موقف میں پاتا ہے اور اس کا برتری کا نصب العین اس سے تشفی حاصل کرتا ہے۔ وہ خود کو مثل خدا کے سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو چاہے کر سکے لیکن ساتھ ہی یہ چیز اس کے طرز زندگی کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کا طرز زندگی اسے مجبور کرتا ہے کہ لوگوں پر تسلط حاصل کرے اور ان پر الزام دھرے پس اگر لوگ اس کی مرضی کے مطابق عمل کریں تو پھر ان سے مقابلہ اور کشمکش کرنے کا اسے موقع حاصل نہیں رہتا۔ اور یہی ہونا چاہیئے۔ چونکہ میں ایسا ہی کرتا تھا اس لئے میرے بیماروں میں سے کسی نے بھی خودکشی نہیں کی۔ بیشک اس قسم کے بیماروں کی کافی نگرانی ہونی چاہیئے۔ میرے بعض بیماروں کی جیسی چاہیئے نگرانی نہیں کی جاتی تھی۔ جب تک کہ کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا ہو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

عام طور سے ایسے مریض کہتے ہیں کہ کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ جو وہ کر سکیں۔

چونکہ یہ بات میں نے بیماروں سے کئی دفعہ سنی اس لئے میں نے اس کا جواب بھی تیار کر لیا۔ میں انھیں کہتا ہوں "اچھا کوئی کام نہ کرو۔" بعض وقت بیمار کہتا ہے "میں تمام دن بستر پر پڑا رہنا چاہتا ہوں۔" چونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں اسے اس کی اجازت دے دوں تو وہ ایسا نہ کرے گا اس لئے کہہ دیتا ہوں "اچھا تمام دن بستر پر پڑے رہو۔" میں جانتا ہوں کہ اگر میں بیمار کی مخالفت کروں تو لڑائی شروع ہو گی اس لئے میں ہمیشہ اس سے اتفاق کر لیتا ہوں۔

علاج کا ایک طریقہ تو یہ ہوا دوسرا یہ ہے کہ بیمار کے 'طرز زندگی' پر راست حملہ کیا جائے مثلاً میں بیماروں سے کہتا ہوں "اگر تم میری ہدایت پر عمل کرو گے تو چودہ دن میں اچھے ہو جاؤ گے۔ ہدایت یہ ہے کہ تم ہر روز یہ سوچنے کی کوشش کرو کہ تم کسی ایک شخص کو کیونکر خوش کر سکتے ہو۔" پھر دیکھتا ہوں کہ اس ہدایت کا بیماروں پر کیا اثر ہوا اس لئے کہ وہ تو ہمیشہ لوگوں کو دق اور پریشان کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں میری ہدایت کا مختلف بیمار مختلف جواب دیتے ہیں جو بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ بعض بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں کہ ایسا کرنا ہمارے لئے آسان ہے اور ہم نے عمر تمام ایسا ہی کیا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ "اچھا جب تم سونے کے لئے بستر پر لیٹو اور نیند نہ آئے تو یہی سوچتے رہو کہ تم کس طرح کسی ایک شخص کو خوش کر سکتے ہو اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لو کہ تم نے صحت کی جانب بڑا قدم اٹھایا۔" جب دوسرے دن صبح میں ان سے ملتا ہوں تو ان سے پوچھتا ہوں کہ "کیا تم نے میری ہدایت پر عمل کیا؟" وہ جواب دیتے ہیں "پہلی رات بستر پر لیٹتے ہی ہم سو گئے۔" علاج کے یہ سب طریقے دوستانہ طور پر اور بیمار پر اپنی برتری ظاہر کرنے کے بغیر استعمال کئے جائیں۔

بعض بیمار جواب دیتے ہیں کہ "ہم ایسا نہیں کر سکتے ہم خود پہلے ہی سے فکر اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔" میں انھیں کہتا ہوں "تم فکر کرنا مت چھوڑو لیکن اس کے ساتھ کبھی کبھار دوسروں کا خیال بھی کر لیا کرو۔" ایسا کہنے سے میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں ان کی دلچسپی دوسروں کی طرف پھیر دوں۔

بعض بیمار کہتے ہیں "میں کیوں دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کروں جب دوسرے مجھے خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے" میں انھیں جواب دیتا ہوں کہ "دوسرے آئندہ چل کر خود نقصان اٹھائیں گے۔"

شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کسی بیمار نے مجھے جواب دیا ہو کہ "میں نے آپ کی ہدایت پر غور کیا یا کروں گا" بہر حال میری پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ بیمار میں سماج سے دلچسپی پیدا کروں اس لئے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ بیماری کی وجہ تعاون کی صلاحیت کا نہ ہونا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ بیمار اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لے جوں ہی بیمار دوسروں سے اپنے تعلقات قائم کر لیتا ہے اور ان سے تعاون کرنے لگتا ہے اسے صحت ہو جاتی ہے۔

مجرمانہ غفلت

سماجی دلچسپی نہ ہونے کی دوسری واضح مثال "مجرمانہ غفلت" ہے کوئی شخص لاپروائی سے جلتی ہوئی دیا سلائی جنگل میں پھینک دیتا ہے اور جنگل کو آگ لگ جاتی ہے یا کوئی مزدور گھر جاتے وقت غفلت سے راستے پر بجلی کا تار پھیلا ہوا چھوڑ کر چل دیتا ہے کوئی موٹر اس سے ٹکراتی ہے اور موٹر میں بیٹھنے والے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں کسی کو نقصان پہونچانا مقصود نہ تھا۔ ایسا کرنے والے اخلاقاً حادثوں کے ذمہ دار قرار نہیں دیئے جا سکتے لیکن ظاہر ہے کہ ان دو افراد نے دوسروں کا خیال رکھنا نہیں سیکھا اس لئے دوسروں کی حفاظت اور سلامتی کے لئے معمولی احتیاط سے کام نہیں لیا۔

بعض بچے میلے کچیلے رہتے ہیں اور بعض لوگ دوسروں کے پاؤں کھندل دیتے برتن توڑ دیتے۔ چیزیں گراتے رہتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں تعاون کا مادہ نہیں ہوتا۔

فصل کا خلاصہ

نوع انسان سے دلچسپی رکھنے کی ٹریننگ گھر اور مدرسے میں دی جا سکتی ہے اور ہم نے اوپر بیان کر دیا کہ ان دونوں جگہوں پہ بچے کے صحیح نشوونما میں کس طرح روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ بچہ سماجی جذبات

بطور ورثہ لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن سماجی جذبات کی امکانی قوت ورثاً آتی ہے اس امکانی قوت کو بڑھانا ماں کی ہشیاری اور اس کی بچے سے دلچسپی اور لڑکے کے اطراف کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ محسوس کرتا ہے کہ لوگ اس کے مخالف ہیں اور وہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے اور عاجز کر دیا گیا ہے تو پھر ہم امید نہیں کر سکتے کہ یہ بچہ دوسروں سے دوستی کریگا اور خود اپنا آپ دوست بنے گا۔ اگر کسی بچے کا یہ خیال ہو کہ سب اس کے غلام بنے رہیں تو ایسا بچہ دوسروں کو کوئی فائدہ نہ پہونچائیگا۔ بلکہ ان پر حکومت کریگا۔ اگر بچہ اپنے ہی خیالات۔ اپنی جسمانی تکلیفوں کی فکر میں ہمیشہ لگا رہے گا تو پھر وہ سماج سے بالکل بے تعلق رہے گا۔

ہمیں معلوم ہو گیا کہ بچے کا خود کو فیاملی کا ایک جز سمجھنا اور فیاملی کے ارکان سے دلچسپی رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ماں باپ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپس کے تعلقات دوستانہ رکھیں اس سے بچے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گھر کے باہر بھی دوستی اور بھروسہ کرنے کے قابل لوگ ہوتے ہیں۔ ہم جان گئے کہ بچے کو مدرسے میں خود کو جماعت کا ایک جز سمجھنا چاہیئے اور دوسرے بچوں سے دوستی کرنی اور ان کی دوستی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ گھر کی اور مدرسے کی زندگی دنیا کی زندگی کی تیاری ہوتی ہے۔ گھر اور مدرسے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے کو ہمدرد انسان بنائے تاکہ وہ نوع انسان کا ایک اچھا فرد بن جائے۔ اگر ایسی تعلیم ہوگی تو تب بچہ ہمت رکھے گا اور کسی کشمکش کے بغیر اپنی زندگی کے مسائل حل کرے گا اور اس طرح حل کرے گا کہ دوسروں کو بھی فائدہ پہونچے۔ بچہ بڑا ہو کر سب کا دوست بن سکے گا اور مفید کام انجام دے کر۔ خوشگوار شادی کی زندگی بسر کر کے سب کو فائدہ پہونچائے گا تو پھر وہ خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھے گا اور شکست خوردہ نہ تصور کریگا۔ وہ محسوس کرے گا کہ دنیا میں وہ آرام سے ہے۔ دنیا دوستی اور محبت کا مقام ہے۔ جن لوگوں کو وہ پسند کرتا ہے ان سے وہ ملتا جلتا رہے گا اور اپنی مشکلات کا عمدگی سے مقابلہ کریگا۔ وہ محسوس کرے گا کہ یہ دنیا میری دنیا ہے مجھے اس دنیا میں کام کرنا

چاہیئے نہ کہ اُمیدیں باندھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا چاہیئے۔ وہ یقین کرلے گا کہ اس کا زمانہ پوری انسانی تاریخ کا ایک جزء ہے اور یہ کہ انسانی ارتقاء کی پوری مدت یعنی گزشتہ۔ حالیہ اور آئندہ کا وہ بھی ایک نتیجہ ہے اور یہ بھی محسوس کرے گا کہ اس کے لئے ابھی موقع ہے کہ وہ کچھ تخلیقی کام انجام دے انسانی نشو و نما میں حصہ لے اور فائدہ پہونچائے۔

اس میں شک نہیں کہ اس دنیا میں بُرائیاں۔ مشکلات۔ تعصبات اور حادثے سب ہی کچھ ہیں لیکن ہم اپنے لئے جو دنیا بنا لیتے ہیں اس کے فائدے اور نقصان ہمارے لئے ہوتے ہیں۔ ہماری دنیا ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم اس میں کام کریں اور ترقی کریں۔ اگر کوئی شخص صحیح طریقے سے اپنے کام انجام دے تو دنیا کو بہتر بنا سکتا ہے۔

دنیا میں فرائض انجام دینے کے یہ معنی ہیں کہ انسان زندگی کے تین مسئلوں کو مل جُل کر حل کرنے کی ذمہ داری لے۔ انسان سے جو کچھ ہم توقع کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ ایک اچھا مل جل کر کام کرنے والا ہو۔ سب انسانوں کا دوست ہو اور شادی کے بعد وفادار اور سچا شریک زندگی بنے۔ مختصر یہ کہ وہ خود کو ایک ہمدرد انسان ثابت کرے۔

بارویں فصل

محبت اور شادی

جرمنی کے ایک ضلع میں ایک قدیم رسم جاری ہے کہ شادی کرنے والے جوڑے کی شادی سے پہلے آزمائش کی جاتی ہے کہ آیا وہ شادی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ شادی کے رسوم انجام دینے کے پہلے دولہا اور دلہن کو ایک میدان میں لایا جاتا ہے جہاں ایک درخت ہوتا ہے جس کا اوپر کا حصہ کٹا ہوا ہوتا ہے۔ دولہا دلہن کو آرا دیا جاتا اور درخت کی پیڑ کو کاٹنے کہا جاتا ہے۔ اس آزمائش کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے کہ دونوں آپس میں تعاون کرنے کے لئے کہاں تک آمادہ ہیں۔ یہ کام چونکہ دونوں کو مل کر انجام دینا پڑتا ہے اس لئے اگر ایک کو دوسرے پر بھروسہ نہ ہو تو یہ ہاتھ تو ہلاتے رہتے ہیں لیکن درخت کی پیڑ کاٹ نہیں سکتے۔ اگر ان میں سے ایک ابتدا کرکے خود کاٹنا شروع کرتا ہے اور دوسرا زور نہیں لگاتا تو کام دوھیرے وقت میں ختم ہوتا ہے۔ جرمنی کے ان گاؤں والوں نے معلوم کرلیا ہے کہ شادی کے لئے تعاون کی صلاحیت خاص شرط ہونی چاہئے۔

شادی کے معنی اور تعریف

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ محبت اور شادی کے کیا معنی ہیں تو میں یوں اس کی تعریف کرونگا چاہے وہ نامکمل ہی سمجھی جائے:

“سچی اور پوری محبت کے ساتھ شادی یہ ہے کہ دوسری جنس کے شریک زندگی پر فریفتہ رہنا بلکہ اس کو پوجنا اور اس فریفتگی کو جسمانی طور پر آپس کے میل جول رفاقت اور بچے پیدا کرنے کا تصفیہ کرکے ظاہر کرنا۔” یہ ظاہر ہے کہ محبت اور شادی تعاون کا ایک رخ ہیں اور یہ تعاون صرف دو افراد (یعنی میاں بیوی) کی

بہتری اور بھلائی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس میں تمام نوع انسان کی بھلائی مضمر ہوتی ہے

یہ نظریہ کہ عشق اور شادی کرنا گویا نوع انسان کی بھلائی کے لئے تعاون کرنا ہے شادی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ انسان کا حسن پرست ہونا اور حسین (خوبصورت) کو حاصل کرنے کی بیحد کوشش کرنا نوع انسان کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔

میں نے اوپر کئی جگہ بتا دیا ہے کہ اس سیارے یعنی زمین کی سطح پر وہ انسان جو ناقص اعضا کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں ہوتے نسل انسانی کو باقی رکھنے کے لئے جننا اور پالنا ضروری ہے اسی لئے ایک جنس والے دوسری جنس والوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور تناسل اور توالد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

شادی کی مشکلات اور ان کا حل ۔

ان دنوں ہم دیکھتے ہیں کہ شادی کے مسئلے مشکلات اور پیچیدگیاں پیش کرتے ہیں اور شادی شدہ لوگ ان مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ والدین ان میں پھنسے ہوئے ہیں اور پوری سوسائٹی کو ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ شادی کے مسئلے کو صحیح طور پر حل کر لیں تو ہمیں چاہیئے کہ کسی قسم کے تعصب کے بغیر ہم اس مسئلے پر سوچ بچار کریں۔ اب تک ہم نے جو کچھ معلوم کیا ہے وہ سب بھول جائیں اور اب نئے سرے سے تحقیق شروع کریں اور جہاں تک ہو سکے ادھر ادھر کے خیالات چھوڑ کر آزادی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کریں۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ محبت اور شادی کا مسئلہ ایک بالکل جدا مسئلہ ہے جس کو علیحدہ طور پر حل کرنا چاہیئے۔ دنیا میں کوئی انسان بالکل آزاد نہیں ہے اور نہ وہ اپنی زندگی کے مسائل کو من مانے حل کر سکتا ہے۔ ہر انسان مختلف بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی زندگی سماج کے ایک ڈھانچے میں بسر ہوتی ہے اور اسے اس ڈھانچے کے قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ یہ بندھن تین ہیں اور اس لئے قرار پائے کہ ہم اس عالم میں ایک خاص مقام پر رہتے بستے ہیں ہمیں اس مقام کے حدود اور امکانات کے مطابق زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور یہ کہ ہم ہمارے

جیسے اور انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ نباہ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور یہ کہ ہمارے دو جنس ہوتے ہیں جن کے باہمی تعلقات پر ہماری نسل کی بقا منحصر ہے۔

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ اگر کسی شخص کو دوسروں سے دلچسپی ہوگی اور اسے نوع انسان کی بھلائی کا خیال ہوگا تو وہ ہر کام انجام دیتے وقت دوسروں کا ضرور لحاظ رکھے گا اور شادی کا مسئلہ اس طرح حل کرنے کی کوشش کرے گا کہ گویا اس میں دوسروں کی بھلائی شامل ہے۔ اگر آپ اس سے سوال کریں گے تو ممکن ہے وہ اپنے مقاصد اور مطالب سائینٹفک طریقے سے بیان نہ کر سکے لیکن اس کے کام بتا دیں گے کہ اس کو نوع انسان سے دلچسپی ہے اور وہ اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو نوع انسان کی بہتری سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ زندگی میں اس قسم کے سوالات کہ "میں اپنے ہم جنسوں کو کیا فائدہ پہونچا سکتا ہوں؟ اس دنیا میں میرا کیا مقام ہونا چاہیئے؟" ان لوگوں کے ذہن میں کبھی نہیں آتے بلکہ یہ سوالات آتے ہیں "اس زندگی سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ مجھے کیا دے سکتی ہے؟" "کیا لوگ میری قدر کرتے ہیں؟" اگر زندگی کے متعلق کسی شخص کے ایسے خیالات ہوں تو پھر وہ اسی ذہنیت کے ساتھ عشق و محبت شادی بیاہ کے مسئلے کو حل کریگا۔ وہ ہمیشہ سوال کرے گا کہ شادی کرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟

جیسا کہ بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ 'محبت' خالص فطری چیز نہیں ہے۔ جنسیت یعنی ایک جنس کے فرد کا دوسری جنس کے فرد کی طرف مائل ہونا ایک جبلّی خواہش ہے۔ لیکن محبت اور شادی کرنا صرف اس جبلّی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی خواہشوں اور جبلّتوں کی نشو و نما کرنا۔ ان کی دیکھ بھال کرنا اور انھیں شائستہ کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنے بعض رجحانات اور خواہشات کو دبا بھی دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے بھائی انسانوں کی خاطر یہ چیز سیکھ لی ہے کہ

انھیں دق نہ کریں اور دکھ نہ دیں۔ ہم نے اپنی بھوک کو کبھی فطری حالت پر نہیں چھوڑا بلکہ کھانے کے آداب اور اوقات مقرر کئے۔ ہماری خواہشیں ہمارے کلچر کے مطابق ہوتی ہیں اور ان سے ہماری ان تمام کوششوں پر روشنی پڑتی ہے جو ہم مل جل کر نوع انسان کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں ہمیں چاہیے کہ یہی اصول محبت اور شادی کے متعلق بھی قرار دیں تاکہ اس سے دنیا اور نوع انسان کو فائدہ پہونچے۔ محبت اور شادی کے مختلف پہلوؤں پر صرف بحث کرنے۔ ان میں تبدیلیاں کرنے یا نئے قاعدے قانون بنانے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس مسئلے کو ہمیں مجموعی طور پر اس طرح حل کرنا چاہیے کہ نوع انسان کے لئے مفید ہو۔ ممکن ہے کہ ہم اس مسئلے میں ترقی کریں یا اس کو حل کرنے کے بہتر طریقے معلوم کریں۔ اگر ہم بہتر طریقے معلوم کریں تو وہ بہتر اس لئے ہونگے کہ وہ اس صورت حال کو صاف طور پر بتا دینگے کہ ہم اس زمین پر رہنے والے ہیں۔ دو جنس رکھتے ہیں اور ان دونوں کا مل جل کر رہنا ضروری ہے۔

جب ہم شادی کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو پہلی چیز جو ہم پر ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے (یعنی دو مل کر اس کام کو انجام دیتے ہیں) بہت سے لوگوں کے لئے یہ کام نیا ہوتا ہے۔ کچھ تو ہم کو تنہا کام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور کچھ دوسروں سے مل جل کر ٹیم کی شکل میں کام کرنے کی تربیت دی گئی ہے لیکن دو مل کر کس طرح کام کرتے ہیں اس کا عام طور پر ہمیں کم تر تجربہ ہوا۔ پس جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو مشکل پیش آتی ہے۔ اگر دونوں افراد نوع انسان سے دلچسپی رکھنے والے اور ہمدرد ہوں تو پھر یہ مشکل آسانی سے دور ہو جاتی ہے کیونکہ دونوں معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک دوسرے سے کس طرح دلچسپی پیدا کر لیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دو افراد کے تعاون کا مسئلہ پوری طور پر حل ہونے کے لئے یہ لازمی ہے کہ ان میں کا ہر ایک فرد اپنی ذات سے زیادہ دوسرے سے دلچسپی رکھے۔ پس اسی بنیاد پر محبت اور شادی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس بنیادی اصول کے علاوہ شادی کے متعلق جو بھی خیالات ظاہر کئے جائیں جو بھی اصلاحی تدبیریں پیش کی جائیں سب غلط ہونگی۔ اگر ہر ایک اپنی

ذات سے زیادہ اپنے پارٹنر سے دلچسپی اور ہمدردی رکھے گا تو دونوں میں برابری قائم ہو جائے گی۔ جب ایک دوسرے کے دلدادہ اور عاشق ہو جائیں گے تو پھر دونوں میں سے کوئی بھی خود کو مغلوب اور کم تر نہ سمجھے گا۔ یہ برابری اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ دونوں اس چیز کو سمجھتے رہیں۔

دونوں (یعنی میاں بیوی) کی ہمیشہ کوشش ہونی چاہیے کہ ایک دوسرے کی زندگی کو آرام دہ بنائیں اور مالا مال کریں۔ اس سے دونوں خوش رہیں گے۔ ہر ایک سمجھے گا کہ اس کا وجود مفید ہے۔ ہر ایک محسوس کرے گا کہ دوسرے کو اس کی ضرورت ہے۔ میاں بیوی کا یہ احساس کہ ہر ایک کا وجود دوسرے کے لئے مفید ہے اور ایک دوسرے کو کھو کر اچھا بدل پیدا نہیں کرسکتا اور یہ کہ ایک کی دوسرے کو ضرورت ہے۔ دونوں انسان اور سچے دوست ہیں شادی کی کامیابی کا ضامن ہونا اور یہی شادی کی زندگی کے خوشگوار ہونے کا راز ہے۔

اگر دو فرد مل کر کوئی کام انجام دیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی کم تر مقام اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ اگر ان دو میں سے کسی ایک کی خواہش ہو کہ دوسرے پر حکومت کرے اور اس کو مجبور کرے کہ وہ اس کا حکم مانے تو پھر یہ دو مل جل کر خوشی سے کام نہیں کرسکتے۔ موجودہ زمانے میں بہت سے مردوں اور عورتوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ حق صرف مرد کا ہی ہے کہ حکومت کرے اپنا حکم چلائے زندگی میں اہم حصہ لے اور آقا و مالک کہلائے۔

شادیاں ناکامیاب کیوں ہوتی ہیں۔

شادیاں جو ناکامیاب ہوتی ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ بغیر برا ماننے اور غصّے میں آنے کے کوئی بھی کم تر موقف میں زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ پارٹنر سب برابر ہونا چاہیئے۔ جب لوگوں میں برابری قائم رہے گی تو سب مل کر اپنی مشکلات دور کرنے کی تدبیریں کریں گے مثلاً میاں بیوی بچے پیدا کرنے کا مسئلہ رضامندی سے تصفیہ کریں گے وہ جان لینگے کہ اگر اولاد کے بغیر رہنے کا تصفیہ کریں تو نوع انسان کے سامنے ذمے دار اور جواب دہ قرار

پائیں گے۔ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ مل جل کر حل کرینگے اور بچوں سے متعلق جتنے امور پیش ہوں انھیں متفقہ طور پر انجام دیں گے۔ وہ (یعنی میاں بیوی) جان لیں گے کہ اگر ان کی شادی کی زندگی ناخوشگوار اور بدمزہ ہو تو اس کی سزا بچوں کو بھگتنی پڑتی ہے اور اس کا برا اثر بچوں کی نشو ونما پر پڑتا ہے۔

ہمارے موجودہ تمدن میں لوگ عام طور سے تعاون کے لئے تیار نہیں کئے جاتے۔ ہماری تعلیم اور تربیت ایسی ہے جو انسان کو اپنی تنہا کامیابی کے لئے تیار کرتی ہے اور ہمیں زندگی میں سب کچھ اپنے لئے حاصل کرنا اور دوسروں کو کچھ نہ دینا سکھاتی ہے۔

یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ جب دو فرد بے تکلفی کے ساتھ مل کر رہتے ہیں جیسا کہ شادی کے بعد میاں بیوی تو اگر ان میں تعاون نہ ہو اور ایک دوسرے سے دلچسپی نہ رکھے تو اس کے نتیجے برے ہونگے۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد پہلی دفعہ اس قریب کے تعلق کو محسوس کرنے لگتے ہیں اس سے قبل انھیں دوسرے کی دلچسپیوں۔ مقاصد اور خواہشوں کو معلوم کرنے کی عادت نہیں تھی۔ یہ لوگ مل جل کر کام کرنے کے عادی نہیں ہوئے لہذا ان لوگوں کو غلطیاں کرتے ہوئے دیکھ کر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے بلکہ ان کے حالات کی جانچ کرنا اور خود کو ان غلطیوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

شادی کی تیاری بچپن سے ہوتی ہے

انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ بغیر پہلے سے تیاری کرنے کے طے نہیں ہو سکتا۔ ہر مرحلے کا ہم اپنے طرز زندگی کے مطابق مقابلہ کرتے ہیں۔ شادی کی زندگی کی تیاری ایک رات میں نہیں ہو سکتی۔ بچے کا خاص چال چلن۔ اس کے خیالات۔ اس کے طرز اور اس کے افعال سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو جوانی اور اس کے بعد کے مواقف کے لئے کس طرح تیار کر رہا ہے۔ بچہ پانچویں یا چھٹویں سال ہی میں محبت کے اہم اصول اپنے لئے قائم کر لیتا ہے۔

بچے کی نشو و نما کے ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ محبت اور شادی کے متعلق اس نے اپنا ایک نظریہ قائم کر لیا ہے۔ اس سے ہم یہ نہ تصور کریں کہ اس عمر میں بچے میں جنسی تحریک اسی طرح پیدا ہوتی ہے جیسا کہ جوانوں میں ہوتی ہے بلکہ وہ عام سماجی زندگی (جس کا جنسی تحریک بھی ایک جزو ہے) کے اس خاص پہلو (یعنی محبت اور شادی) کے متعلق غور کرتا اور خیالات قائم کرتا ہے۔ محبت اور شادی کے معاملوں کو بچہ اپنے ماحول میں دیکھتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان سے اسے آئندہ سابقہ پڑے گا۔ بچے کو چاہئے کہ ان معاملوں کو ایک حد تک سمجھے اور ان کے متعلق اپنا خیال قائم کرے۔

اگر بچے بچپن میں دوسری جنس سے دلچسپی ظاہر کریں اور شریک زندگی کا جسے وہ پسند کرتے ہیں انتخاب کر لیں تو ہم اسے کوئی غلطی یا برائی یا وقت سے پہلے جنسی رجحان نہ سمجھیں اور اس پر ہرگز نہ ہنسیں اور نہ اس کا مذاق اڑائیں بلکہ ہم اس چیز کو بچے کا آئندہ محبت اور شادی کی زندگی کی طرف ایک قدم آگے بڑھانا تصور کریں۔ بچے کی اس حرکت کو ایک معمولی بات قرار دینے کے عوض ہم اس سے اتفاق کریں اور کہیں کہ محبت کرنا قابل تعریف کام ہے جس کے لئے اسے تیار رہنا چاہئے اور نوع انسان کی بہتری کی خاطر اس کام کو انجام دینا چاہئے۔ اس طریقے سے ہم بچے کے دل میں ایک نصب العین پیدا کر سکتے ہیں جس سے بچے بڑے ہو کر ایک دوسرے سے اچھے ساتھی اور جانی دوست کی حیثیت سے ملنے جلنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بچے اور جنسی معلومات

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے یک زوجگی یعنی ایک وقت میں ایک بیوی رکھنے کے اصول کے سخت معتقد ہوتے ہیں اور وہ بچے بھی جن کے ماں باپ کی شادی کے بعد کی زندگی بدمزہ اور ناخوشگوار رہی ہو یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

میں بچوں کے ماں باپ کو ہرگز نہ کہوں گا کہ وہ اپنے بچوں کو کم سنی میں جسمانی جنسی تعلقات کے متعلق ضرورت سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔ صرف اتنا کہیں جتنا بچے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ بچہ شادی کے متعلق جو خیال رکھتا ہے وہ بیحد اہم ہوتا ہے۔ اگر

بچے کو غلط سمجھا دیا گیا ہو تو وہ شادی کو خطرناک چیز سمجھتا اور اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ وہ بچے جنھیں چار پانچ یا چھ برس کی عمر میں بڑوں نے جنسی تعلقات کے متعلق معلومات فراہم کر دئے اور جنہیں کم عمری میں ان امور کا تجربہ ہوا بڑے ہو کر عشق و محبت کرنے سے بہت ڈرنے اور گھبرانے والے ہوے۔ کسی کی خوبصورتی کی کشش کو وہ خطرے کی گھنٹی سمجھے۔ جنسی معلومات حاصل کرتے وقت اگر بچے کی عمر کسی قدر بڑی ہو تو ان معلومات سے اسے دہشت نہیں ہوتی اور اس کے ان جنسی باتوں کو غلط طور پر سمجھ لینے کا امکان کم ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں بچے کی صحیح طور پر مدد کرنے کا یہ راز ہے کہ ہم بچے سے کبھی جھوٹ نہ بولیں اور نہ اس کے سوالوں کو بالکل ٹال دیں بلکہ اس کے سوالوں کا منشاء سمجھنے کی کوشش کریں اور صرف وہی باتیں سمجھا دیں جو وہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور جو اس کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ اور فضول معلومات بہم پہونچانا بچے کے لئے سخت نقصان دہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مسئلوں میں ہوتا ہے اس مسئلے میں بھی بچے کے لئے مناسب ہے کہ وہ خود اپنی کوشش سے جو کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے معلوم کرلے۔ اگر اس کے اور اس کے ماں باپ کے درمیان ایک دوسرے پر بھروسہ ہو تو پھر اسے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ جو کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے ان سے پوچھ لے گا۔

یہ خیال عام ہے کہ بچے جو جنسی معلومات اپنے ساتھیوں سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ انھیں غلط راستے پر لگا دیتے ہیں۔ میں نے کسی صحیح اور تندرست بچے کو نہیں دیکھا کہ اس طرح معلومات حاصل کرنے سے نقصان اٹھایا ہو۔ بچے ان تمام باتوں کو جو ان کے ہم مکتب انھیں کہتے ہیں صحیح نہیں مان لیتے بلکہ وہ ان کی بال کی کھال کھینچتے ہیں اور جب انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انھیں کہا گیا صحیح نہیں ہو سکتا تو پھر اپنے ماں باپ۔ بھائی بہنوں سے پوچھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی اقرار کرنا چاہئے کہ میں نے جنسی معاملوں میں بچوں کو ماں باپ سے زیادہ محتاط اور موقع شناس پایا۔

بچوں کو حسن پرستی کی تربیت بچپن ہی میں ملتی ہے

جوانی کی حسن پرستی کی تربیت بھی بچپن میں ہی ہوتی ہے۔ دوسری جنس والوں کی طرف

مائل ہونے ان سے ہمدردی رکھنے کے ارتسامات بچے اپنے ماحول سے حاصل کرتے ہیں اور یہی چیزیں جنس مخالف کی طرف جسمانی جنسی میلان پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں جب بچہ یہ ارتسامات اپنی ماں۔ بہنوں یا دوسری اطراف کی لڑکیوں سے حاصل کرتا ہے توجوان ہوکر انہی شکل اور شمائل والی لڑکیوں کی طرف راغب ہوتا اور ان میں سے کسی لڑکی کا انتخاب کر لیتا ہے۔ بعض دفعہ بچہ تصویروں سے متاثر ہوتا ہے۔ تقریباً ہر شخص تصویروں کو دیکھ کر اپنے لئے خوبصورتی کا ایک معیار قرار دے لیتا ہے اور اس کے مطابق لڑکی تلاش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچہ بڑا ہوکر آزادانہ انتخاب کا موقع نہیں رکھتا بلکہ بچپن کی تربیت کے مطابق چناؤ کرتا ہے۔

حسن کی تلاش بے معنی اور فضول نہیں ہے۔ ہمارے یہ حسن پسندانہ یا جمالیاتی جذبات انسانی صحت اور تندرستی اور نوع انسان کی ترقی کے احساس پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری سب قابلیتوں ہمارے سب مصروفیتوں اور کاموں کی وجہ یہی احساس ہوتا ہے۔ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ ہم ان سب چیزوں کو جو ہمیشگی رکھنے والی نظر آتی ہیں خوبصورت سمجھتے ہیں یعنی ان تمام چیزوں کو جو نوع انسان کے فائدے کے لئے ہوں اور آئندہ بھی نوع انسان کو فائدہ پہنچائیں ہم خوبصورت سمجھتے ہیں ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے بچے ان ہی چیزوں کے زیر اثر نشو ونما پائیں اور وہ یہی حسن ہے جو ہمیشہ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔

ماں باپ کے اچھے اور برے تعلقات کا اثر بچوں پر

بعض دفعہ جب کسی لڑکے کی باپ سے اور کسی لڑکی کی ماں سے نہیں بنتی (جیسا کہ ماں باپ کے باہمی اختلافات کی صورت میں ہوتا ہے) تو لڑکا اور لڑکی ایک متناقص قسم کی لڑکی اور لڑکا تلاش کرتے ہیں مثلاً کسی لڑکے کی ماں نے اگر اسے ہمیشہ ملامت کرکے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہو اور ہمیشہ ڈراتی دھمکاتی رہی ہو تو لڑکے کا جنسی میلان ان لڑکیوں کی طرف ہوگا جو حاکمانہ طبیعت نہیں رکھتیں۔ وہ ایسی شریک زندگی کی تلاش کرے گا جو ہمیشہ مطیع اور فرماں بردار رہے لیکن ایسی شادی

جس میں میاں بیوی میں برابری نہ ہو خوشی کا باعث نہیں ہوتی۔

اگر لڑکا خود کو قوی اور طاقت ور ثابت کرنا چاہتا ہے تو ایسی شریک زندگی تلاش کرتا ہے جو قوی اور مضبوط ہو۔ وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ یا تو وہ قوت کو پسند کرتا ہے یا یہ کہ لڑکی سے قوت آزمائی کرکے اس پر اپنی برتری ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

اگر لڑکے کی ماں سے مخالفت سخت ہو تو پھر محبت اور شادی کے لئے اس کی تیاری رک جائے گی بلکہ دوسری جنس کی طرف جنسی میلان بھی باقی نہ رہے گا۔ دوسری جنس کی طرف رغبت نہ ہونے کی بھی درجے ہوتے ہیں۔ یہ چیز حد درجے کو پہونچ جائے تو پھر لڑکا دوسری جنس کو اپنے ذہن سے ہی نکال دیتا اور گمراہ ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کے آپس کے تعلقات خوشگوار ہونا چاہئیے

اگر ہمارے ماں باپ کی شادی کی زندگی ملاپ اور آشتی سے گزرے تو ہم بھی اس معاملے میں اچھی طرح تیار کئے جاتے ہیں۔ بچے شادی کے متعلق اپنے ابتدائی خیالات ماں باپ کی زندگی کو دیکھ کر قائم کرتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ جو لوگ زندگی میں ناکامیاب ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نے شادی کے بعد جدائی اختیار کی ہو یا جن کی گھریلو زندگی بدمزہ رہی ہو۔ اگر ماں باپ خود تعاون کرنے کے قابل نہ ہوں تو پھر بچوں کو تعاون سکھانا ان کے لئے ناممکن ہے۔

ہم کسی شخص کی شادی کرنے کی صلاحیت یہ دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا اس نے خیالی کی زندگی صحیح طور پر بسر کرنے کی تعلیم پائی ہے یا نہیں اور ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا رہا۔ اہم چیز یہ ہے کہ اس نے محبت اور شادی کرنے کی تیاری کہاں اور کس طرح کی۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی شخص کی اصلی حالت اس کے ماحول سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے ماحول کو سمجھنے کی صلاحیت سے ظاہر

ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول کا جو اندازہ لگائے گا وہ مفید ہوگا۔ اگر کسی شخص کے ماں باپ سے متعلق تجربے تلخ ہوئے ہوں تو امکان ہے کہ اس سے وہ سبق حاصل کرے اور اپنی زندگی کو بہتر بنائے اور شادی بیاہ کے لئے خود کو اچھی طرح تیار کرلے کسی شخص کے ماں باپ کی زندگی ناکامیاب دیکھ کر ہمیں یہ تصفیہ نہ کرنا چاہئے کہ خود وہ شخص شادی بیاہ کا اہل نہیں ہے۔

کامیاب شادی کے لئے تعاون کی ضرورت ہے

اگر کوئی شخص ہمیشہ اپنے فائدے کی فکر میں رہے تو سمجھ لو کہ وہ بری تیاری کر رہا ہے۔ اگر اس کی تربیت اس طرح ہوگی تو وہ صرف یہی سوچتا رہے گا کہ زندگی میں کیا خوشیاں اور کیا مزے اسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی ہی آزادی اور آرام کا طالب رہے گا اپنی شریک زندگی کے آرام و آسائش کا خیال نہ رکھے گا۔ شادی کے متعلق یہ نظریہ تباہ کن ہے۔ یہ نظریہ رکھنے والے کو میں اس شخص کے مثل سمجھوں گا جو دم کی جانب سے گھوڑے کو کالر پہنانا چاہتا ہو۔ ایسا نظریہ رکھنا گناہ نہیں ہے لیکن غلطی ضرور ہے۔ لہذا محبت اور شادی کی تیاری کرنے والے کو چاہئے کہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے اور اس سے بچنے کی تدبیریں اختیار نہ کرے۔ اگر شک اور شبہ کو جگہ دی جائے تو پھر محبت باقی نہیں رہ سکتی۔ تعاون اپنے لئے دوام چاہتا ہے اور ہم ان ہی ملاپوں کو حقیقی شادیاں اور محبت کی سچی مثالیں سمجھتے ہیں جس میں مستقل اور نہ بدلنے والا اٹل تصفیہ کیا گیا ہو۔ اس تصفیے میں بچے پیدا کرنے۔ ان کو تعلیم دینے۔ انھیں تعاون کی تربیت دینے انھیں ہمدرد انسان بنانے اور نسل انسان کے ذمہ دار ارکان بنانے کے تصفیے کو بھی ہم شامل کرتے ہیں۔ ایک کامیاب شادی نوع انسان کی آئندہ نسل کی اچھی پرورش کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے اور شادی کا مقصد بھی یہی ہونا چاہئے۔ شادی بھی حقیقت میں ایک اہم کام ہے جو اپنے خاص قاعدے قانون رکھتا ہے۔ ہم چند قاعدوں کو اختیار اور چند کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اس دنیا کے اٹل قانون یعنی قانون تعاون کے

خلاف کریں گے۔

اگر ہم شادی کو ایک امتحانی زمانہ سمجھیں اور محبت کے زمانے کو مثلاً پانچ سال تک محدود کر دیں تو یہ سچی محبت نہیں ہو سکتی۔ اگر مرد اور عورتیں ان تدبیروں سے اپنی جان چھوڑانا چاہتے ہوں تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اس کام (یعنی شادی) کے لئے اپنی پوری قوتیں استعمال نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کا کوئی اہم کام اس طرح کی ٹال مٹول سے نہیں بنتا۔ ایک مقررہ زمانے تک محبت کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں وہ سب نیک نیت اور اچھے دل والے حضرات جو شادی کے معاملے میں اس قسم کی سہولتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں غلط راستے پر ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی سہولتیں شادی کرنے والے جوڑوں کو نقصان پہونچائیں گی اور ان کی کوششوں کو محدود کر دیں گی اور انھیں موقع دینگی کہ اس اہم کام کو مل کر انجام دینے کے بدلے اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

میں جانتا ہوں کہ ہماری سماجی زندگی مشکلات سے بھری ہوئی ہے اور یہ مشکلات بہت سے افراد کو باوجود کوشش کے شادی کے مسئلوں کو صحیح طور پر حل نہیں کرنے دیتیں۔ میں نہیں چاہتا کہ محبت اور شادی کے مسئلے کو بھینٹ چڑھایا جائے بلکہ میں ہماری سماجی مشکلات کی قربانی چاہتا ہوں۔

محبت کی شادی کی خصوصیات

محبت کی شادی کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں ہم جانتے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ مرد اور عورت کا ایک دوسرے سے وفادار رہنا۔ ایک دوسرے پھر بھروسہ رکھنا۔ ایک دوسرے سے رکے رکے نہ رہنا۔ اپنا آپ ہی خیال نہ رکھنا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بے وفائی کو معمولی چیز سمجھتا ہے تو وہ ہرگز شادی کرنے کے قابل نہیں۔ اگر میاں بیوی شادی کے وقت آپس میں سمجھوتہ کرلیں کہ ہر ایک اپنی آزادی برقرار رکھے گا تو یہ چیز بھی حقیقی رفاقت قائم نہ رکھ سکے گی یہ صحیح رفاقت نہیں ہو سکتی۔ رفاقت میں ہم جیسا چاہیں ویسا آزاد نہیں رہ سکتے اس کے لئے ہم ایک دوسرے سے تعاون کرینگا

پہلے سے ہی اقرار کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی قرار داد (یعنی ہر ایک کا آزاد رہنا) کی میں ایک مثال پیش کرتا اور بتاتا ہوں کہ ایسی قرار داد شادی کی زندگی کی کامیابی اور نوع انسان کی بھلائی کے لئے مفید نہیں ہوتی اور اس سے میاں بیوی دونوں کو نقصان پہونچتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ایک طلاق دیا ہوا شخص اور ایک طلاق لی ہوئی عورت کی آپس میں شادی ہوئی۔ یہ دونوں شائستہ اور ذہین تھے اور امید رکھتے تھے کہ ان کی یہ شادی بہ نسبت ان کی سابقہ شادیوں کے زیادہ کامیاب رہے گی۔ یہ نہ جانتے تھے کہ ان کی پہلی شادیاں کیوں ناکامیاب رہیں۔ سماجی دلچسپی رکھنے کے بغیر یہ کامیابی چاہتے تھے۔ دونوں آزاد خیال تھے اور جانتے تھے کہ شادی کے بعد بھی آزاد رہیں تاکہ ایک دوسرے سے بیزار نہ ہو جائیں۔ ان دونوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا کہ ہر ایک پوری طرح آزاد رہے جو چاہے کرے لیکن جو کچھ کرے وہ صاف صاف دوسرے کو کہہ دے۔ اس معاملہ میں میاں زیادہ ہمت سے کام لیتا تھا۔ جب وہ گھر آتا تو مختلف عورتوں سے اپنی چھیڑ چھاڑ کے تجربے بیان کرتا تھا۔ بیوی اس سے لطف اٹھاتی اور میاں کی کامیابیوں پر فخر کرتی تھی۔ بیوی چاہتی تھی کہ خود بھی دوسرے مردوں سے آشنائی کرے لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے اس ارادے کو پورا کرے، وہ گذرترسی (یعنی عام مجمعوں یا صحبتوں میں جانے کا ڈر) کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ وہ کہیں بھی تنہا نہ جا سکتی تھی بلکہ بیماری کی وجہ ہمیشہ اپنے کمرے سے ایک قدم نکلتی تو اسے ایسا ڈر لگتا کہ پھر اندر چلی جاتی۔ یہ گذر ترسی کا مرض ظاہر میں تو اس کے عشق بازی کے ارادے اور تصفیے کے خلاف ایک قسم کی روک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں اس سے زیادہ باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ عورت کہیں بھی تنہا نہیں جا سکتی تھی اس لئے بالآخر شوہر مجبور ہو گیا کہ ہمیشہ اسی کے پاس رہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شادی کے وقت کا سمجھوتہ کہ ہر ایک آزاد رہے۔ جو چاہے کرے کس طرح ٹوٹ گیا۔ شوہر آزاد نہ رہا اس لئے کہ اسے ہمیشہ بیوی کے پاس رہنا پڑا۔ بیوی اپنی آزادی سے کچھ کام نہ لے سکی اس لئے کہ وہ کہیں بھی تنہا جانے سے ڈرنے لگی۔ اب اگر

اس عورت کا علاج کیا جائے تو اسے مجبور کرنا پڑے گا کہ شادی کی زندگی کے متعلق اپنا نظریہ بدل دے وہ اور اس کا شوہر دونوں شادی کی زندگی کو باہمی تعاون کی زندگی سمجھیں ۔

شادی کے مسئلے میں غلطیاں

شادی کے بعد شروع ہی میں بعض غلطیاں کی جاتی ہیں ۔ ایک شخص جو بچپن میں لاڈ سے بگاڑ دیا گیا ہو شادی کے بعد محسوس کرتا ہے کہ اس سے لاپروائی کی جا رہی ہے ۔ یہ احساس اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اس نے سماجی زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تربیت نہیں پائی ۔ بعض دفعہ لاڈلا بچہ شادی کے بعد ایک جابر شوہر ہو جاتا ہے اور بیوی خود کو مظلوم سمجھتی اور شوہر سے مقابلہ کرتی ہے ۔ جب ایسے مرد اور عورت کی شادی ہوتی ہے جو دونوں بچپن میں لاڈ سے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں تو عجیب دلچسپ حالات ظاہر ہوتے ہیں ۔ شوہر چاہتا ہے کہ بیوی اس کی ہمیشہ نگرانی اور خدمت کرے اور بیوی چاہتی ہے کہ شوہر ہمیشہ اس کے ناز اٹھائے اور اس کی خدمت کرتا رہے ۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کرتا ۔ ایک کو بھی تسلی اور تشفی نہیں ہوتی اور آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک میاں یا بیوی باہر کسی سے تفریحاً عشق بازی شروع کرتے ہیں تاکہ کسی کی توجہ کا مرکز بنیں اور اس سے خدمت لیں ۔

بعض لوگ ایک فرد سے عشق بازی نہیں کر سکتے بلکہ ایک ساتھ کئی افراد سے محبت کرتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ آزاد رہتے ہیں ۔ جب ایک سے بچنا چاہتے ہیں تو دوسرے کے پاس رجوع ہوتے ہیں اور کبھی بھی عشق و محبت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا گوارا نہیں کرتے ۔

بعض ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو رومانی ۔ خیالی یا ایسی محبت ایجاد کر لیتے ہیں جو کبھی نتیجہ خیز ہی نہیں ہوتی ۔ وہ اس خیالی محبت کے ذریعے اپنے جذبات کو ابھارتے اور لطف اٹھاتے ہیں لیکن کبھی دوسری جنس کی طرف عملاً ایک قدم نہیں بڑھاتے ۔ محبت کا بلند معیار اس لئے بھی قائم کر لیا جاتا ہے کہ نہ اس پر کوئی پورا اترے نہ انھیں

ملے اور نہ محبت اور شادی کے امکانات رہیں۔

جنس مخالف سے بیزاری

بہت سے مردوں نے اور خصوصاً بہت سی عورتوں نے خود کو ایسی تربیت دے لی ہے کہ اپنے جنس مخالف کو ناپسند کریں اور ان سے دور رہیں۔ انھوں نے اپنی ایک فطری رجحان کو روک دیا ہے اور بغیر جسمانی علاج کے شادی کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اسی کو میں نے دعویٰ تذکیر (مردانہ پن کا دعویٰ) کہا ہے۔ ہماری موجودہ تہذیب میں مردوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اس کی وجہ ہے۔ اگر بچے اپنے جنسی فرائض کے متعلق شک اور شبہ میں رہیں تو اپنی حالت غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ جب تک کہ مرد کا درجہ (بہ نسبت عورت کے درجے کے) بڑا سمجھا جاتا رہے گا اس وقت تک ظاہر ہے کہ بچے چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں مرد ہونے کی خواہش کریں گے۔ بچے یہ شک رکھتے ہوئے کہ آیا وہ مرد بن سکتے ہیں یا نہیں مرد ہونے کو اہمیت دینگے اور خود کو کسی طرح کی بھی آزمائش سے بچائیں گے۔

لوگوں کا اپنی جنس سے بیزار رہنا ہمارے کلچر میں بہت پایا جاتا ہے۔ عورتوں میں جنسی خواہش کا نہ ہونا اور مردوں میں مردمی کی کمی کا باعث یہی چیز ہے۔ ایسے لوگ محبت اور شادی کے خلاف ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت بجا اور درست بھی ہے۔ اس خرابی کا دور کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ مرد اور عورتیں دونوں برابر ہیں۔ جب تک نسل انسانی کا آدھا حصہ یعنی عورتیں اپنے جنس سے بیزار رہینگی شادی کا مسئلہ مشکلات پیش کرتا رہے گا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ برابری کی تعلیم دی جائے اور بچوں کو اُن کے آئندہ جنسی فرائض کے متعلق لاعلم نہ رکھا جائے۔

میرا خیال ہے کہ میاں بیوی میں شادی کے بعد پائیدار محبت اور ایک دوسرے سے دائمی وابستگی قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شادی سے پہلے جنسی فعل سے پرہیز کریں۔ مجھے معلوم ہوا کہ اکثر وہ مرد جن کی بیویوں نے شادی سے پہلے (عشق و محبت کے زمانے میں) انھیں جنسی فعل کرنے کی اجازت دی بیویوں کی

کریں تو ان کی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ وہ زندگی کے ربط اور ضبط کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنی ذاتی اغراض پر نظر رکھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر کام آسانی سے ہو جائے اور کبھی کسی چیز کے لئے انھیں "نہیں" نہ کہا جائے پس وہ چاہتے ہیں کہ شادیاں بھی آزمائشی اور عارضی قسم کی ہوں اور طلاق دینا آسان ہو۔ شادی ہوتی ہی وہ آزادی کا مطالبہ کرتے اور دوسروں سے تعلق پیدا کرنا اپنا جائز حق جتانے لگتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے حقیقی دلچسپی رکھنے کا دعوی کرے تو اسے چاہئے کہ ان تمام خصوصیات کا مظاہرہ کرے جو اس دلچسپی کو ثابت کریں مثلاً وہ دوسرے کا سچا اور اچھا دوست رہے۔ اس سے وفاداری کرے۔ اس کا پورا اعتماد حاصل کرے اور اس کے متعلق اپنی پوری ذمہ داری کا احساس رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی انسان ان باتوں کا لحاظ رکھنے کے بغیر شادی کرے گا تو اسے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس معاملہ میں اس کی زندگی غلط اور ناکامیاب رہے گی۔

بچوں کی پرورش میں دلچسپی لینا ضروری ہے پس اگر ان خصوصیات کو جو ابھی بتائی گئیں نظرانداز کر کے شادی کی جائے گی تو بچوں کی پرورش میں مشکلات پیدا ہوں گی۔ اگر ماں باپ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے رہیں اور اپنے معاملوں کا عمدگی اور کامیابی کے ساتھ تصفیہ نہ کر سکیں تو پھر وہ اپنے بچوں کو سماجی زندگی کے لئے تیار نہ کر سکیں گے۔

میاں بیوی کی علیحدگی کا مسئلہ

بعض دفعہ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں میاں بیوی کو مل کر نہ رہنا چاہیئے۔ ان حالات میں ان کا علیحدہ ہو جانا مناسب ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا تصفیہ کون کرے؟ کیا ہم یہ تصفیہ ان لوگوں پر چھوڑیں جنہوں نے خود اچھی

کریں تو ان کی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ وہ زندگی کے ربط اور ضبط کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنی ذاتی اغراض پر نظر رکھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر کام آسانی سے ہو جائے اور کبھی کسی چیز کے لئے انھیں 'نہیں' نہ کہا جائے پس وہ چاہتے ہیں کہ شادیاں بھی آزمائشی اور عارضی قسم کی ہوں اور طلاق دینا آسان ہو۔ شادی ہوتی ہی وہ آزادی کا مطالبہ کرتے اور دوسروں سے تعلق پیدا کرنا اپنا جائز حق جتاتے لگتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے حقیقی دلچسپی رکھنے کا دعویٰ کرے تو اسے چاہیئے کہ ان تمام خصوصیات کا مظاہرہ کرے جو اس دلچسپی کو ثابت کریں مثلاً وہ دوسرے کا سچا اور اچھا دوست رہے۔ اس سے وفاداری کرے۔ اس کا پورا اعتماد حاصل کرے اور اس کے متعلق اپنی پوری ذمہ داری کا احساس رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی انسان ان باتوں کا لحاظ رکھنے کے بغیر شادی کرے گا تو اسے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس معاملہ میں اس کی زندگی غلط اور ناکامیاب رہے گی۔

بچوں کی پرورش میں دلچسپی لینا ضروری ہے پس اگر ان خصوصیات کو جو ابھی بتائی گئیں نظر انداز کر کے شادی کی جائے گی تو بچوں کی پرورش میں مشکلات پیدا ہوں گی۔ اگر ماں باپ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے رہیں اور اپنے معاملوں کا عمدگی اور کامیابی کے ساتھ تصفیہ نہ کر سکیں تو پھر وہ اپنے بچوں کو سماجی زندگی کے لئے تیار نہ کر سکیں گے۔

میاں بیوی کی علیحدگی کا مسئلہ

بعض دفعہ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں میاں بیوی کو مل کر نہ رہنا چاہیئے۔ ان حالات میں ان کا علیحدہ ہو جانا مناسب ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا تصفیہ کون کرے؟ کیا ہم یہ تصفیہ ان لوگوں پر چھوڑیں جنہوں نے خود اچھی

تربیت نہیں پائی جو شادی کی ذمہ داری سے ناواقف ہوں ؟ یہ لوگ تو طلاق کو ایسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ شادی کو دیکھا یعنی طلاق کو معمولی بات سمجھیں گے لہذا تصفیہ ایسے لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض لوگ بار بار طلاق دیتے اور پھر شادی کرتے ہیں۔ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہر بار ان سے وہی غلطی ہوتی ہے۔ پھر فرمائیے کہ تصفیہ کون کرے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر شادی ناکامیاب ہو تو ماہر نفسیات پر اس چیز کا تصفیہ چھوڑنا چاہیئے کہ میاں بیوی کو علٰحدہ ہو جانا چاہیئے یا نہیں۔ اس میں بھی ایک مشکل ہے میں نہیں جانتا کہ امریکا میں ایسا ہے یا نہیں لیکن یورپ کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی بھلائی اور بہتری بہت اہم چیز ہے لہذا جب اس معاملے میں مشورہ کیا جاتا ہے تو وہ رائے دیتے ہیں کہ عورت کوئی اور عاشق اور مرد کوئی اور محبوبہ پیدا کرلے اور سمجھتے ہیں کہ ان کے اس مشورے پر عمل کرنے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب یہ ماہرین اپنی غلطی سمجھ جائیں گے اور اس قسم کا مشورہ دینا چھوڑ دینگے۔ ایسا مشورہ وہی لوگ دے سکتے ہیں۔ جنہوں نے خود اس مسئلہ یعنی شادی بیاہ کے لئے اچھی تربیت نہ پائی ہو اور یہ بات نہ سمجھتے ہوں کہ شادی کا مسئلہ دنیوی زندگی کے دوسرے مسئلوں سے مربوط ہے ان سے علٰحدہ نہیں ہے اور میں (اس کتاب میں) اب تک اسی ربط زندگی کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کراتا رہا۔

شادی کو مشکلات حل کرنے کا ذریعہ بنانا غلطی ہے

اسی قسم کی ایک یہ بھی غلطی ہے کہ لوگ شادی کو اپنی ذاتی مشکلات کی حل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ امریکا میں کیا ہوتا ہے مجھے معلوم نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یورپ کے ماہرین نفسیات جب کسی لڑکے یا لڑکی کو خرابی اعصاب کے مرض میں مبتلا پاتے ہیں تو اکثر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ عشق و محبت شروع

کرے اور جنسی تعلقات قائم کرے۔ ادھیڑ لوگوں کو بھی یہی مشورہ دیا جاتا ہے یہ مشورہ ایسا ہے کہ گویا محبت اور شادی ایک پیٹنٹ دوا ہے۔ محبت اور شادی کے مسئلے کے صحیح حل کا تعلق کسی فرد کی مکمل کامیاب شخصیت سے ہوتا ہے۔ انسان کی کامیاب اور خوشگوار زندگی کا انحصار اس مسئلے سے زیادہ اور کسی مسئلے پر نہیں ہے۔ اس مسئلے کو ہم معمولی نہیں سمجھ سکتے اور نہ محبت کے معاملے کو مجرمانہ زندگی۔ نشہ بازی یا خلل اعصاب کی بیماریوں کا علاج قرار دے سکتے ہیں۔ ایک خلل اعصاب کے بیمار کے لئے ضروری ہے کہ شادی کے پہلے اس کا صحیح علاج کر دیا جائے۔ اگر بغیر علاج کے وہ شادی کرے گا اور شادی کی ذمہ داریوں کو نہ سمجھ سکے گا تو نت نئی مصیبتوں اور مشکلوں میں پھنس جائے گا۔ شادی کرنا ایک مقدس کام ہے اور اس کے انجام دینے اور اس کے ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لئے بڑی کوشش اور تخلیقی سرگرمی کی ضرورت ہے۔

شادی دولت وغیرہ کی خاطر نہ کی جائے۔

اس کے علاوہ اور بھی نامناسب مقاصد کے تحت شادی کر لی جاتی ہے مثلاً بعض لوگ روپیے کی خاطر شادی کر لیتے ہیں۔ بعض فریق ثانی پر ترس کھا کر شادی کر لیتے اور بعض خادمہ حاصل کرنے کے لئے شادی کرتے ہیں۔ شادی کے معاملے میں اس قسم کی دل لگیوں کا موقع نہیں ہے۔ میں ایسی مثالوں سے واقف ہوں کہ جہاں شادی کرنے سے مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ ایک نوجوان امتحان کی یا اپنی آئندہ زندگی کی مشکلات کی وجہ شادی کر لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ یقینی امتحان میں ناکامیاب ہو جائے گا اور اگر ناکامیاب ہو جاتا ہے تو شادی کو اس ناکامیابی کی وجہ قرار دے کر اپنی جان چھوڑاتا ہے۔ شادی کی مزید ذمہ داری اپنے سر لے کر امتحان کی ناکامیابی کی ملامت سے خود کو بری کر لینا چاہتا ہے۔

ہمیں ہرگز نہ چاہئے کہ ہم شادی کے مسئلے کی اہمیت کو گھٹائیں بلکہ ہمیں

چاہیے کہ اس مسئلے کو اہم بتائیں اور اس کا معیار بلند کریں۔

جب تک عورت کو کم تر سمجھا جائے گا شادی کی مشکلات دور نہ ہوں گی۔

شادی کی مشکلات کو دور کرنے کی جتنی تدبیریں بتائی گئی ہیں ان سب میں میں نے دیکھا کہ عورت گھاٹے میں رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے کلچر میں مرد ہمیشہ مزے اڑاتے ہیں اور ایسا ہماری سمجھ کی غلطی سے ہوتا ہے۔ اس غلطی کی اصلاح کسی ایک کی مخالفت سے نہیں ہو سکتی مثلاً شادی کے بعد اگر بیوی مخالفت شروع کرے تو سماجی تعلق بگڑ جاتا اور دوسرے فریق یعنی شوہر کو نقصان پہونچ جاتا ہے پس جب تک عورت کے متعلق پورے سماج کے خیال کی اصلاح نہ ہو شادی کی خرابیاں اور مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔ میرے ایک شاگرد پروفیسر رِنی سِنی امریکا کے باشندے نے ایک تحقیق کی اور دوران تحقیق میں انھیں معلوم ہوا کہ جن لڑکیوں سے انھوں نے سوالات کئے ان میں سے ۲۴ فی صد نے یہ جواب دیا کہ وہ چاہتی ہیں کہ مرد ہو جائیں اور یہ کہ وہ اپنی جنس سے مایوس اور بیزار ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ نوع انسان کا آدھا حصہ مایوس دل شکستہ اور اپنے جنس سے بیزار ہو اور دوسرے آدھے حصے یعنی مردوں کی نسبتاً زیادہ آزادی سے ناراض ہو تو محبت اور شادی کے مسئلے آسانی سے کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟ کیا شادی کی مشکلات اس وقت تک رفع ہو سکتی ہیں۔ جب تک کہ عورتوں کو حقارت سے دیکھا جاتا رہا ہے اور عورتیں یہ سمجھتی رہیں کہ وہ مردوں کی جنسی خواہش پوری کرنے کا ذریعہ ہیں اور مردوں کو دوسری عورتوں سے تعلق رکھنے اور کئی عورتیں کرنے کا حق ہے؟

ہم نے اب تک جو کچھ کہا اس سے ایک سیدھا سادا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ کہ انسان فطرتاً نہ یک زوجی (یعنی ایک وقت میں ایک عورت کرنے والا) اور نہ کثیر الازواج (یعنی ایک وقت میں کئی عورتیں کرنے والا) ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہم اس سیارے کے رہنے بسنے والے ہیں یہاں ہمیں

ھیسے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے اور نوع انسان دو جنسوں پر منقسم ہماری تہذیب کے مطابق ہمیں زندگی کے تین مسائل حل کرنا ہے۔ اگر ہم اس ت کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ محبت اور شادی کا ین نصب العین صرف ایک زوجی شادی سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

تمام شد

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ اعظم بلڈنگ مغل پورہ
حیدر آباد دکن

کاتب محمد شفیع الدین (کوہیری)

A

Antithesis-تضادی

Associations:تلازمات

Agrophobia-گزر ترسی

Auto-intoxication-خود مسموری

Anthology-کشکول

Adolescent negativism-
جوانی کے زمانے کی منکریت

Advisory council-مشاورتی کونسل
یا مجلس شوریٰ

B

Bengaman-بدجامن

C

Conception-عمل تعقل

Compulsion neurotic-مجبور شدہ
خبطی

Coherence-ربط

Concious-شعوری

Climacteric-عمر کا انقلابی زمانہ

D

Dementia-Praccox-جنون کی ایک
قسم

E

Extravert-حد سے تجاوز کرنے والا

Electric Shock-برقی جھٹکا

Egoist خود پسند

F

Flexible-لچکدار

Frued-فرائیڈ

Fatalistic-view-تقدیری نظریہ

H

Heridity-توارث

Hypnotise-نوم توہم پیدا کرنا

Hereditary limits-توارثی حدود

Hard-boiled John-پرانا پاپی جان

Homo-sexuality-ہم جنسی مباشرت

I

Inferiority-Complex-احساس
کمتری کا موسوم

Individual Psychology-شخصی یا
انفرادی نفسیات

Impressions-ارتسامات

Inhereted uncestions instinct-
موروثی مباشرتی جبلت

Intelligence test-آزمایش ذکاوت

„ Quotient-حاصل قسمت ذکاوت

Interaction-تفاعل

Introspective-تاملی

Imperspective-تناظر

K

Kreschmer-کریش مر

M

Memories-یادداشتیں

Momento-زور حرکت

Motherhood-مادریت

Masculine protest-دعوی تذکیر یعنی تذکیر مرد هونے کا دعوی

Masculinity-تذکیر مردیں

Metaphoric-استعاری

Mother complex ماں کا خبط

N

Neurotic tendencies - عصبانی رجحانات

Neurotic-خلل اعصاب کا مریض

Neglected child آوارہ بچہ

Negative transferences-انتقالات منفی

Normal-معمولی

O

Occupation-کاروبار شغل

Odepus complex-فرائڈ کا نظریہ کہ لڑکا ماں سے اور لڑکی باپ سے مانوس هوتی هے

Optimism-رجائیت

P

Phantasies-وهمی خیالات

Psychotherapy-علاج بذریعہ توجہ

Pathology علم تشخیص امراض

Posture-طرز و طریقہ نشست و برخاست

Pyknoid پست قد بونے

Pacemaker-رفتارز

Pessimistic-قنوطی

Psycho-analysis-تشریح یا تحلیل نفس

Premises-مقدمات

Psychiatrist-دماغی امراض کا ماهر معالج

Physical heredity-جسمانی توارث

Phenomena-فطری انوکھے مظاہرے
Problem child-مسئلی بچہ
Pervert-لچہ-شوہدہ

R

Rival-رقیب

S

Sympathetic nervous system-
Self-deception-فریب نفس
Scheme of apperception-ادراکی اسکیم
Schizoids-اونچی ناک والے بلند قد انسان
Strindberg-(استرانڈبرگ (نام
Speak-easy-شراب کی وہ دوکان جہاں شراب چوری سے فروخت کی جاتی ہے
Style of life-طرز زندگی
Self-Concious-خود آگاہ
Sense-perception-حسی ادراکات
Self hypnosis-خود نومی
Symbols-اشارے-رموز
Sexuality-جنسی خواہش ا شہوانیت
Self gratification-خود سیری

T

Ties-تعلقات یا بندھن
Typieal-مثالی

U

Unit-اکائی

V

Voluntary nervous system.
Vegetative nervous system
Virtues-جوہر
Visual.بصری
Visual type-بصری قسم